سرزمین سرحد کی اولین علمی و ادبی یادگار

سالنامہ ۱۹۳۵ء

مجلہ سفیر سخن



Price Re. 1-8-0

زیر سرپرستی عالیجناب آنریبل نواب صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب بالقابہ

وزیر اعلےٰ شمال مغربی صوبہ سرحد

سالنامہ سنہ ۱۹۳۵ء

مجلہ

سفیر سخن

پشاور۔ صوبہ سرحد

ایڈیٹر	قیمت	ڈائرکٹر
ابوالکیف کیفی (سرحدی)	عہ۸ ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک	مولانا عبدالقادر سعدی (ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔بی۔ٹی)

پتہ۔ مہتمم مجلہ "سفیر سخن" پشاور۔ صوبہ سرحد

آئینہ سیر سخن پشاور سالنامہ ۱۹۳۵

حمدِ باری تعالےٰ

رباعیات

(۱)

حلقہ ہر اک گوش میں ہے لٹکا تیرا
کانٹا ہر اک جگر میں ہے اٹکا تیرا
مانا نہیں جسنے تجھے جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(۲)

گلشن میں بہار عالم آرا تو ہے
صحرا میں مسافروں کا یارا تو ہے
چھوٹی ہوئی ہر آس کی امید ہے تو
ٹوٹے ہوئے ہر دل کا سہارا تو ہے

(۳)

بیداری میں اور نیند کے خراٹے میں
گھمسان میں اور ہوا کے فراٹے میں
پائی ہے طلوعِ شمس میں ضو تیری
دیکھا ہے تجھے رات کے سناٹے میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ـــــ (غالب) ـــــ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس کارساز کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم ایسے ناتوانوں کو اس اہم کام کے سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔

خیال تھا کہ سرزمین سرحد کی اولین یادگار یعنی مجلہ "سفیر سخن" کا سالنامہ ۱۹۳۵ء اپنی جملہ صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو کر دسمبر ۱۹۳۴ء کے وسط میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائیگا۔ مگر پریس کی تبدیلی سرحدی دنیا میں کوئی سہل کام نہیں۔ بہرحال اس سلسلہ میں ہم اپنے محترم و مکرم جناب خان بہادر محمد قلی خانصاحب، او۔ بی۔ ای پبلسٹی آفیسر بہادر صوبہ سرحد کے دلی سپاس گذار ہیں جن کی توجہ خاص سے ان مشکلات کا خاتمہ ہو کر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کو جدید ڈیکلریشن کی منظوری حاصل کی گئی۔ خداوند عالم ایسے نیکدل اور پاک باطن راہنمایان وطن کو ہمیشہ زندہ اور شاد رکھے۔ آمین ثم آمین۔

اب جو ڈیکلریشن منظور ہوا تو کاتب صاحب بیمار پڑ گئے۔ حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ خیر کاتب صاحب بیس روز کی طویل علالت کے بعد صحتیاب ہوئے۔ تو پریس میں مزید پلیٹیں ندارد۔ خدا خدا کر کے پلیٹیں آئیں اور کاپیاں چھپنی شروع ہوئیں۔ اتنے میں ۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو ہمارے دیرینہ کرمفرما اور سفیر سخن کے سچے بہی خواہ جناب خانصاحب میر کریم بخش خان پی۔ ای ایس۔ آئی۔ ڈی۔ ای شمال مغربی صوبہ سرحد کی طرف سے سرحدی سکولوں کے لئے ۵۰۰ سو کاپیوں کا آرڈر موصول ہوا۔ اس وقت تک آدھی سے زائد کاپیاں طبع ہو چکی تھیں۔ لہذا فوراً راولپنڈی تار دیا گیا۔ کاغذ اور کاتب اور منگوائے گئے۔ جن سے جلدی جلدی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر سجدۂ شکر بجالاتے۔

ہم اپنے محسن جناب خانصاحب میر کریم بخش خان مدظلہ العالی کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کرتے ہیں۔ جن کی علم پروری اور ادب نوازی نے سفیر سخن کے حلقہ اشاعت کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ خانصاحب موصوف کو جزائے خیر دے۔ اور وہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں۔

اسمیں کچھ شک نہیں۔ کہ سالنامہ سفیر سخن ۱۹۳۵ء اپنے معزز قارئین کرام کی خدمت میں جن کو اس دور افتادہ سرحدی صوبے کے واحد علمی و ادبی صحیفہ کیساتھ بیحد وابستگی ہے ایک طویل انتظار کے بعد پہنچ رہا ہے تاہم امید ہے کہ وہ ہماری مجبوریوں اور معذوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے۔

سرزمین سرحد میں اس وقت تک سوائے مجلہ سفیر سخن کے اردو کا علمی و ادبی رسالہ کوئی نہیں۔ البتہ معدودے چند اخبارات ہیں جو آئے دن پبلک کی بے اعتنائیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اسلیئے ہماری سب سے بڑی کوشش یہ تھی۔ کہ اردو کے اس ادبی رسالہ کی ایک یادگار قائم کیجائے۔ اور وہ سالنامہ کی شکل میں ہو۔ جس کیلئے ہم نے ملک کے تمام اہل قلم ارباب کرم کی توجہ اسطرف مبذول کرائی خدا شاد رکھے ان تمام محترم بزرگوں۔ بھائیوں اور بہنوں کو جنہوں نے ہمارے صرف ایک ہی عریضہ پر اپنے گراں قدر مضامین ارسال فرما کر سفیر سخن کی معنوی خوبیوں میں چار چاند لگائے۔ ہم اپنے ان کرمفرماؤں کے تہ دل سے سپاس گذار ہیں۔ البتہ ہمیں اگر افسوس ہے تو صرف ان حضرات پر جنکے گرامی نامے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) بھوپال — حضرت ملا رموزی قبلہ مدظلہ کا مکتوب گرامی

۱۷ اکتوبر ۳۴ء مکرمی۔ خط ملا۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ الحمدللہ سفیر سخن ابتک برابر جاری ہے۔ کیونکہ میرے پاس نہیں آتا۔ رہا مضمون

کا سوال۔ سو میری مالی حالت اجازت نہیں دیتی۔ کہ بے معاوضہ لکھوں۔ لہٰذا اگر فی مضمون عــ۵ روپیہ اُجرت ذریعہ وی۔پی آپ منظور فرمائیں تو مطلع کر دیجئے۔ مضمون بھیجدوں گا۔ (مُلّا رموزی)

(۲) لکھنؤ حضرت پروفیسر علی عباس حسینی قبلہ مدظلہ العالی

۲۸ ستمبر ۱۹۳۴ء ۔ مکرمی تسلیم ۔ عرض ہے۔ گرامی نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ ۔ میں نے بدقسمتی سے آجتک آپ کا رسالہ نہیں دیکھا۔ اس لئے مجھے علم نہیں کہ اس کا معیار کیا ہے۔ بہر نوع اس کے لئے فسانے اور مضامین دونوں چیزیں ارسال خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر بمعاوضہ بمضمون ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم۔ رتن ناتھ سرشار اور پروفیسر ہادی رسوا مرحوم کی تصنیفات میں سے کسی ایک پر ارسال خدمت کیا جا سکتا ہے۔ فسانہ بھی بھیجا جا سکتا ہے لیکن شرط یہی ہے۔ کہ ان میں سے جو چیز بھیجی جائے گی وہ وی۔پی کے ذریعہ بھیجی جائیگی اور آپ کو صرف یہ حق حاصل ہوگا۔ کہ آپ اُسے ایک بار اپنے رسالہ میں شایع کریں۔ کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا حق مجھے حاصل ہوگا۔ اگر آپ کو یہ شرطیں منظور ہوں تو مطلع فرمایئے چھ سات صفحے کا مضمون یا فسانہ پندرہ روپیہ میں بھیجا جا سکتا ہے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

احقر علی عبّاس حسینی

(۳) لکھنؤ حضرت شوکت تھانوی مدظلہ،

۲۵ ستمبر ۱۹۳۴ء شوکت نواز - آداب و نیاز - آپ کا گرامی نامہ وصول ہوا میں سفیر سخن کے لئے مضمون لکھ سکتا ہوں مگر آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہے۔ کہ میں نے اس شغل کو ذریعہ معاش بنا لیا ہے اور بلا اُجرت کوئی مضمون کبھی نہیں لکھا لہٰذا اگر آپ میرا مضمون چاہتے ہیں۔ تو بواپسی ڈاک عــ۵ روپے منی آرڈر کر دیجئے۔ یہ وہ کم سے کم اُجرت ہے جس سے کم میں کسی حالت میں نہیں لیتا چونکہ یہ ایک تجارتی بات ہے۔ لہٰذا مجھکو اُمید ہے کہ آپ میری اس صاف گوئی کو معاف فرمایئے گا۔ (احقر شوکت تھانوی)

حضرت مُلّا صاحب سے دست بستہ عرض ہے کہ بندہ نواز۔ ہم شروع سے لے کر اس وقت تک ملک بھر کے ادنیٰ و اعلیٰ طبقہ کے مضمون نگار حضرات کی خدمت میں "سفیر سخن" بھیجتے رہے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ آپکی خدمت میں بھی یہ غریب الوطن نہ آتا ہو یہ علیٰحدہ سوال ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں آپکے دوست احباب رسالہ کو ہضم کر جاتے ہوں بہر حال ہم اپنا فرض ادا کرنے میں حق بجانب رہے ہیں۔ لہٰذا آپ سفیر سخن کا از راہ کرم فاتحہ ضرور پڑھیں بلکہ ہو سکے تو وقت نماز اسکی درازیٔ عمر کیلئے دُعا فرما لیا کریں۔ اسلیئے کہ آپ ایسے پابند صوم و صلوٰۃ ملاؤں کی دُعا خداوند کریم جلد قبول کر لیا کرتا ہے۔ باقی رہا مضمون کی اُجرت کا سوال! سو ہمارے محترم ملا صاحب! اوّل تو ہندوستان بھر میں اُردو کا کوئی اتنا متمول رسالہ ہے ہی نہیں جو آپکو دس یا بیس روپے دے کر ایک مضمون لکھوائے۔ البتہ آپ انہیں اپنا مضمون معہ اپنی کتابوں کے اشتہار کے بھیجدیا کرتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ لیکن اگر آپ نے واقعی یہ پیشہ اختیار کر رکھا ہے تو آپ مضمون بھیجدیتے ہم اُسے شایع کرتے اور اگر وہ سرحدی بھائیوں کے مذاق کے مطابق پورا اُترتا ۔ تو ہم انشاء اللہ عــ۵ روپے تو کچھ چیز نہیں بلکہ آپکا احسان پوری طرح سے اتارتے اور وہ اس طرح کہ اپنے حلقہ اثر میں کم سے کم پانچ چھ سو روپوں کی کتابیں آپکی فروخت ہو جاتیں۔ مگر افسوس کہ آپنے ہر کس و ناکس کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر رکھا ہے۔ اچھا! خدا آپ کو توفیق دے کہ آپکے مضامین ملک میں مقبول ہوں اور لوگ آپکی تصنیف شدہ کتابیں خرید کر آپکو مالا مال کر دیں تا کہ آپ پانچ یا دس روپیہ پر مضمون بیچنے کے محتاج نہ رہیں۔

محترم پروفیسر سید عباس حسینی قبلہ و کعبہ کی خدمت اقدس میں گذارش ہے کہ آپکے مضامین بنسبت دیگر اجرتی مضمون نگار حضرات کے زیادہ قیمتی ہونے چاہئیں۔ مگر آپ نے اپنے مضمون کی قیمت نہایت تھوڑی فرمائی ہے۔ ہم آپکے گرانقدر مضامین کی قدر کرتے ہیں۔ ہمیں آپکے مضامین سے خاص دلچسپی ہے۔ بلکہ تمام اہلِ علم حضرات آپکے مضامین نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اگر آپکے مضمون کی قیمت دس یا پندرہ روپے ہو۔ تو ہمارے خیال میں یہ علم و ادب کے نام کو بٹہ لگانا ہے آپ ایسے اہلِ علم حضرات کو ان باتوں سے بے نیاز ہونا چاہیئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپنے بھی بازاری مضمون نگاروں کیطرح ہمارے ساتھ برتاؤ کیا جو آپکے شایانِ شان کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہم آپکی خدمت کرنیمیں ہر طرح سے تیار ہیں مگر آپکے اس حسنِ سلوک کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی نہیں نکلیگی یاد رہے کہ ہم سرحدی پٹھانوں کی رگوں میں ان غیور افغانوں کا خون موجود ہے جنکی خاک کے ذرّے کبھی آسمانِ ہند پر آفتاب بن کر چمکے تھے ہم دس یا بیس روپوں کی کبھی پروا نہیں کرتے۔ اگر آپ مضمون بھیجدیتے تو ہم بھی ایسے مفت خور نہیں کہ آپکی اُجرت ہڑپ کر جاتے۔ بلکہ اس سے زیادہ آپکی قدر و منزلت کیجاتی۔ افسوس کہ ناقدر شناسیٔ ابنائے روزگار نے علم و ہنر کا یہانتک ستیاناس کر دیا ہے۔ کہ اہلِ کمال بیچارے پانچ پانچ اور چھ چھ روپے میں مضمون بیچتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں۔ "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

ہمیں کوئی شک نہیں کہ حضرت شوکت تھانوی صاحب کے ظریفانہ مضامین دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں مگر وہ کہاں پنجاب یا ہندوستان کے کچھ حصے میں نہ کہ سرحد میں۔ ہماری یہ کوشش تھی۔ کہ آپ کے مضامین سرحد میں بھی شوق سے پڑھے جائیں۔ اور اہلِ سرحد آپکی نگارش ظریفانہ سے محظوظ ہوں۔ گھر گھر آپکے چرچے ہوں۔ سرزمین سرحد کے پچیس تیس لاکھ نفوس آپکی تصنیف شدہ کتابیں شوق سے خریدیں۔ اس طرح آپ کی مالی مشکلات کا خاتمہ ہو اور آپ کو منی آرڈر کے انتظار کی زحمت گوارا کرنی نہ پڑے۔ مگر افسوس کہ ہمارے اہلِ ملک میں یہ صفات اگر پیدا ہو جائیں۔ تو آج اتنے دھندوں کی ضرورت ہی درپیش نہ آئے۔ بہرحال ہم اپنے ان بزرگوں کے حسنِ سلوک کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے تمام قارئین کرام سے مستدعی ہیں کہ وہ ان حضرات کی جہاں تک ممکن ہو سکے مدد کریں۔ تاکہ ان کی مالی مشکلات کا جلد از جلد خاتمہ ہو جائے۔

ہم اپنی تعریف پر کبھی خوش نہیں ہوئے اس لئے کہ اس عارضی خوشی سے انسان کی ہمتیں پست ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن ملک کو جس بات نے ہمارے ہم آواز ہونے پر مجبور کیا وہ "سفیرِ سخن" کی مستقل مزاجی۔ غیر معمولی مستعدی نیز منصب سفارت کو بطریق احسن سرانجام دینا ہے۔ اور یہ بھی کسی پر احسان نہیں اس لئے کہ اردو ہماری ملکی و محسن بزرگوں کی یادگار ہے۔ اس کی خبر گیری کرنا اور اس کی ترویج میں کوشاں رہنا ہمارا ادبی فرض ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے۔ ہم نے اپنی آواز ملک کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہونچانی ہے۔ آگے ملک جانے اور اس کا کام۔ بہرحال ہم اپنے تمام معزز معاصرین کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے مؤقر جرائد و رسائل میں "سفیرِ سخن" کی ناچیز خدمات پر اپنے روشن خیالات کا اظہار فرمایا۔ خداوند عالم ان قابل قدر بزرگوں کو توفیق عطا فرمائے۔ کہ وہ ہمیشہ اسی طرح ہر مبتدی کی حوصلہ افزائی فرماتے رہا کریں۔

حیرانی ہے کہ وہ مدعیانِ علم و ادب جو آئے دن اردو کانفرنسیں منعقد کرنے کے شائق ہیں اور اخبارات میں نئے نئے عنوانات سے اعلان کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں ان کی ادب پروری کا کیوں کر یقین آئے۔ جب کہ دور افتادہ سرحدی صوبہ کا واحد صحیفہ سفیرِ سخن ہنوز اُن کی توجہات کا محتاج ہے۔

ہم معصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ اور علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی کی خدمت میں عموماً نیز منبع علوم و فنون مخزن الطاف و اکرام حضور پرنور اعلیحضرت شہریار دکن خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی بارگاہ عالی میں خصوصاً بصد ادب و نیاز اپنی یہ ناچیز خدمات پیش کرتے ہیں۔ ہمیں کامل امید ہے کہ قبیل الذکر ارباب کرم اپنی قلمی معاونت سے اس ادبی صحیفہ کے صفحات کو زرپاش بنانے کا شرف بخشیں گے۔ نیز اعلیحضرت کی ذات ستودہ صفات سے ہمیں یقین ہے کہ حضور کی عنایات خسروانہ اور چشم کرم سے یہ صحیفہ ادب کبھی محروم نہ رہے گا۔ جس سے ہمیں خدمت ادب کرنے کی مزید جرأت ہو سکے گی۔

تمام اکابرین ملک سے عموماً نیز سرحدی ارباب کرم سے خصوصاً پرزور اپیل ہے کہ سرزمین سرحد کا صرف یہی ایک ادبی رسالہ ہے۔ اس پودے کو ہم نے اپنے خون دل سے سینچ سینچ کر جوان کیا ہے۔ لہذا آپ سب سے پہلی فرصت میں اس کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرما کر اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیں۔

محکمہ ڈاک کا حسن انتظام نہایت قابل ستائش ہے۔ ہمیں آج تک کسی قسم کی شکائت کا موقعہ نہیں ملا۔ خصوصاً قصہ خوانی ڈاک خانہ کے سب پوسٹ ماسٹر جناب بابو اللہ رکھا صاحب کے حسن سلوک اور مستعدی نے ہمیں اس بات پر مجبور کیا۔ کہ ہم آپ کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کریں۔

ہم اپنے ان جملہ حضرات کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے سالنامہ کی ترتیب میں حصہ لیا۔ خصوصاً جناب خان غلام مصطفےٰ خانصاحب خاکی ادیب سرحد کے ہم تہہ دل سے سپاس گذار ہیں۔ جن کی کرمفرمائی نے ان اجزائے پریشان کی شیرازہ بندی فرمائی۔ خداوند عالم ایسے محسنین کو تادیر سلامت رکھے۔

آخر میں ہم صوبہ سرحد کے باعظمت انسان۔ ملک وملت کے سچے خیر خواہ آنریبل نواب سر صاحبزادہ **عبدالقیوم خان** صاحب بالقابہ کی درازیٔ عمر اور ترقیٔ مدارج کے لئے اپنے خالق حقیقی سے دست بدعا ہیں کہ وہ اس بطل الخیر کو جس کی ذات ستودہ صفات سے ہماری سینکڑوں امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

ایڈیٹر

پرستاران اردو سے خطاب

(شہید ادب، حضرت مائل سندیلوی مدظلہٗ)

بے حسی کا تابکے بازار گرم ... اے پرستاران اردو شرم شرم
کب تک آخر سرد بازارِ عمل ... کب تک عقل و ہوش پر طاری اجل
تابکے تدبیر کی یہ خامیاں ... تابکے تقدیر میں ناکامیاں
پوچھتا ہے تم سے میدانِ نبرد ... "کیا یونہی دنیا میں رہتے آئے مرد؟"
کیوں نہیں قومی شعائر کا خیال ... مختلف ہے کس لئے ماضی سے حال
ہوگئی کیوں یک بیک ترک تمام ... کیوں نہیں اب جستجوئے ننگ و نام
یہ بتاؤ کس کی ہے اردو زباں ... ہو رہے ہو کس پہ یوں نامہرباں
ہاں! کہو کس کی ہے یہ نورِ نگاہ ... ہو رہی ہے کس کی یہ دنیا تباہ
قدر گھر میں ہے نہ بازاروں میں ہے ... کس کے یارب یہ طرفداروں میں ہے
صرف اک عالم مٹانے کے لئے ... خار ہے سارے زمانے کے لئے
اپنی کوشش میں اک عالم کامیاب ... اور تم وقفِ تغافل محوِ خواب!
سونے والو جاگو غفلت ہوچکی ... دیکھو اٹھ کر قوم کیا کیا کھو چکی
بھر دو عزِ نفس کا رگ رگ میں جوش ... دور کر دو مستیٔ صہبائے ہوش
اٹھو ظاہر کر دو دنیا پر یہ بات ... زندہ لوگوں کی ہے اردو کائنات
گونج اٹھے یہ گرج دور و قریب ... کون ہے دنیا میں اردو کا رقیب
کوئی اس پر آنکھ اٹھائے کیا مجال ... کوئی طاقت آزمائے کیا مجال
اس میں مضمر ہے حیاتِ دلنواز ... اس میں پوشیدہ ہے قومیت کا راز

ابتدا میں فکر ہو انجام کی
سن لو مائل کہہ رہا ہے کام کی

سلکِ جواہر

(محترم جناب قبلہ قاضی محمد یوسف خاں فاروقی سرحدی)

کلماتِ طیّباتِ الٰہیّہ

۱۔ جس شخص کو حکمت دی گئی۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوجاتا ہے۔ (قرآن مجید)

۲۔ سچی شہادت کو مت چھپاؤ۔ جو شخص سچی شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل گنہ گار ہے (قرآن مجید)

۳۔ اے مومنو جو شہادت دو۔ انصاف اور عدل سے دو۔ اور خدا کی رضامندی کے لئے دو۔ اگرچہ اُس کا اثر تمہاری ذات کے خلاف پڑے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف پڑے۔ خواہ وہ دولتمند ہوں یا غریب ہوں۔ اللہ تعالےٰ ان ہر دو سے بہتر اور برتر ہے۔ پس تم اپنی نفسانی خواہشات کی اتباع کرکے عدل کو نہ چھوڑنا۔ اگر تم نے شہادت دیتے وقت دبی زبان سے کچھ کہا۔ اور حق و صداقت کو چھوڑ دیا۔ تو یاد رکھو۔ کہ اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (قرآن مجید)

۴۔ ہلاک شدہ وہی ہے۔ جو دلیل اور برہان سے ہلاک ہو۔ اور زندہ وہی ہے جو دلائل اور بیّنات سے زندہ ہو (قرآن مجید)

۵۔ خدا کے راستے میں اگر جنگ پیش آوے تو اسی شخص یا قوم سے جنگ کرو جو تم پر جنگ کی نیت سے حملہ آور ہو۔ تم کسی پر زیادتی اور سرکشی مت کرو۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کو زیادتی کرنے والے ہرگز پسند نہیں۔ (قرآن مجید)

۶۔ اے مومنو اپنی آواز کو اپنے رسولؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ (قرآن مجید)

۷۔ اگر مومنوں میں سے دو فریق آپس میں آویزش میں مبتلا ہو جاویں۔ تو تم ان میں صلح صفائی کرو۔ اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی اور بغاوت کرنے لگے۔ تو تم سرکش فریق کا مقابلہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم یا فیصلہ کی طرف مائل ہوں۔ (قرآن مجید)

۸۔ اے لوگو میں نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے کنبے اور قبیلے صرف اس غرض سے بنائے ہیں کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔ اور خدا کے پاس قابلِ عزت و تکریم صرف وہی شخص ہے جو تم میں تقویٰ میں اوروں سے برتر ہو۔ (قرآن مجید)

۹۔ بُرائی کی سزا اتنی ہونی چاہیئے۔ جتنی کہ بُرائی ہے۔ اور جو شخص عفو اور درگذر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ غفور اور

رحیم ہے ؛ (قرآن مجید)

۱۰۔ جہاں تم ایک ہو تو دوسرا خدا ہے اور جہاں تم دو ہو تو تیسرا خدا ہے اور جہاں تین ہو تو چوتھا خدا ہے پس وہ خدا تمہارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ؛ (قرآن مجید)

احادیث نبویہ

سیدنا حضرت محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زریں اقوال

۱۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ سے اور زبان سے دوسرے مسلمانوں کو سلامتی ہو اور دکھ نہ پہنچے ؛ (حدیث)

۲۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے حق میں وہ امر پسند نہ کرے۔ جو اپنے حق میں پسند کرتا ہے ؛ (حدیث)

۳۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دو عضووں کو ضمانت دے۔ کہ وہ اُن کا غلط استعمال نہ کرے گا۔ جن میں سے ایک زبان ہے اور ایک اندام نہانی۔ تو میں اس کیواسطے جنت کا ضامن ٹھہروں گا ؛ (حدیث)

۴۔ مومن کے دو دن برابر نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنے پچھلے دن کو پہلے سے بہتر بناتا ہے ؛ (حدیث)

۵۔ جو چیز تیرے دل میں حائل ہو وہی گناہ ہے اس سے بچو ؛ (حدیث)

۶۔ جس کام کو کرنا چاہو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فتویٰ اپنی ضمیر سے پوچھو۔ اگر وہ اجازت دے تو کرو۔ ورنہ نہ کرو ؛ (حدیث)

۷۔ اسلام میں ترک دنیا اور راہبانہ مجردانہ زندگی گذارنے کا کوئی حکم نہیں ؛ (حدیث)

۸۔ تو اللہ کی عبادت کر ایسا کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ حالت میسر نہ ہو تو ایسی عبادت کر کہ گویا وہ تم کو دیکھ رہا ہے ؛ (حدیث)

۹۔ ایک آدمی کے مسلمان ہونے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو ترک کردے جو اس کیلئے مفید نہ ہوں (حدیث)

۱۰۔ تم میں سے بہتر وہی لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں سے بہتر سلوک کریں ؛ (حدیث)

سیدنا حضرت ابوبکر الصدیق علیہ السلام کے زریں اقوال

۱۔ جھوٹ اور نفاق بے ایمانی ہے۔ سچائی اور صفائی ایمان ہے ؛

۲۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ قوی ہے۔ جب تک اس کا حق ادا نہ ہو۔ جو تم میں قوی ہے وہ کمزور ہے جب تک دوسروں کا

کا حق ادا نہ کرے ؛

۳۔ جس قوم میں بدکاری زیادہ ہوتی ہے تو خدا اس پر مصیبت نازل کرتا ہے ؛

۴۔ جو آدمی بغیر اعمال نیک کے قبر میں جائے۔ تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی نے دریا کا سفر بغیر کشتی کے کیا؛

۵۔ تین چیزوں سے تین چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ آرزو سے دولت۔ خضاب سے جوانی۔ دوا سے ہمیشگی؛

۶۔ آٹھ چیزوں سے آٹھ چیزوں کی رونق ہوتی ہے۔ پرہیزگاری سے فقیری کو۔ تکبر سے نعمت کو۔ تحمل سے علم کو۔ عاجزی سے متعلم کو۔ خشوع سے خشیت اللہ کو۔ صبر سے بلا کو۔ احسان نہ جتانے سے احسان کو۔ گڑگڑانے سے نماز کو ؛

۷۔ زبان خشکی ہے۔ دل تری ہے۔ پس اگر زبان بگڑی تو اہل دنیا اس پر روئیں گے۔ اگر دل بگڑیگا۔ تو فرشتے اس کی حالت پر افسوس کرینگے ؛

۸۔ دنیا کی محبت تاریکی ہے جس کا چراغ پرہیزگاری ہے ؛

۹۔ گناہ تاریکی ہے جس کا علاج توبہ ہے ؛

۱۰۔ جو محمد کو پوجتا تھا تو وہ خدا نہ تھا۔ فوت ہو گیا۔ لیکن جو خدا کی پوجا کرنیکیلئے اسلام میں داخل ہوا تھا تو خدا زندہ موجود ہے وہ مرنیوالا نہیں

سیدنا حضرت عمر فاروق اعظم علیہ السلام کے کلمات مبارکہ

۱۔ جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے ؛ (الفاروق حصہ دوم)

۲۔ جس شخص سے تم کو نفرت ہو۔ اس سے ڈرتے رہو ؛ (الفاروق)

۳۔ سب سے عقلمند وہ شخص ہے جو اپنے افعال کی اچھی تاویل کر سکتا ہے ؛ (الفاروق)

۴۔ آج کا کام کل پر نہ اُٹھا رکھو ؛ (الفاروق)

۵۔ روپے سر اونچا کئے بغیر نہیں رہتے ؛ (الفاروق)

۶۔ جو چیز پیچھے ہٹے۔ وہ آگے نہیں بڑھتی ؛ (الفاروق)

۷۔ جو شخص برائی سے واقف نہیں۔ وہ برائی میں مبتلا ہوگا ؛ (الفاروق)

۸۔ لوگوں کے فکر میں تم اپنی جان نہ بھولو ؛ (الفاروق)

۹۔ دنیا تھوڑی سی لو۔ تو آزادانہ زندگی بسر کرو گے ؛ (الفاروق)

۱۰۔ خدا اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیب میرے پاس بطور تحفہ پیش کرتا ہے ؛ (الفاروق)

ارشاداتِ عالیہ

(جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل استاد حضور شہر یار دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ)

واں مست کوئی حسن میں شوخی میں ناز میں
یاں ناز ہے کہ فرق نہ آیا نیاز میں

سب قطرہ قطرہ بٹ گئی اس بزمِ ناز میں
جتنی بھری تھی مے مرے جامِ نیاز میں

اک آہ کا بھی اے شبِ غم آسماں نہیں
اِس کا خیال ہے کہ وہ ہیں خواب ناز میں

افسونگری ہیں عشوہ بھی شوخی بھی ناز بھی
دنیا ہے ایک حلقۂ زلفِ دراز میں

میں شمعِ بزم ہوں نہ چراغِ مزار ہوں
راتیں مگر گذرتی ہیں سوز و گداز میں

آیا تھا بن کے عیسیٰ دوران علاج کو
دیکھا مجھے تو جان نہ تھی چارہ ساز میں

اُلجھے ہوئے یہ دل نہیں رکھّے ہیں حسن نے
چن چن کے پھول دامنِ زلفِ دراز میں

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیم صبح
کچھ اُٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خوابِ ناز میں

پیرِ مغاں کا ہے یہ نکالا ہوا طریق!
ہم میکدے میں دل ہے ہمارا نماز میں

اُن کا ہے حسن اور نگاہیں مری جلیل
پروانہ ہے نہ شمع کوئی بزمِ ناز میں

تبرکات

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی مدظلہ العالی)

ہمیں عشق میں بات کی پڑ گئی ہے
کہ دل مل گیا ہے نظر لڑ گئی ہے

مرے قتل پر یہ چھری اڑ گئی ہے
تمہاری محبت گلے پڑ گئی ہے

مری لاش کو دفن اس نے کیا کب
زمیں میں ندامت سے خود گڑ گئی ہے

رکی میرے لب تک فغاں دل ہی چل کر
کہاں سے نکل کر کہاں اڑ گئی ہے

مرے دل سے نکلے تری یاد کیوں کر
یہ تصویر آئینے میں جڑ گئی ہے

عجب حال دیکھا تمہاری نظر کا
کبھی مل گئی ہے کبھی لڑ گئی ہے

نکالا تھا جس کو بڑی دقتوں سے
رگ دل میں وہ پھانس پھر گڑ گئی ہے

ادا سے کہاں تک مرا دل بچے گا
قضا جان لینے پر اب اڑ گئی ہے

مری سمت سے ہو گئے وہ مکدر
خدائی خدا جانے کیا جڑ گئی ہے

شب ہجر کو کس طرح میں نکالوں
یہ کالی بلا میرے گھر پڑ گئی ہے

محبت ملا دے گی مٹی میں ہم کو
کہ ان کی نظر سے نظر لڑ گئی ہے

جفائیں سہوں گا وفائیں کروں گا
طبیعت اسی بات پر اڑ گئی ہے

خدا ہی کرے نوح اب ناخدائی
مری ناؤ طوفان میں پڑ گئی ہے

بادۂ کہن

(حضرت شاہ سراج جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

پرتوِ رخسارِ جاناں جلوہ گر ایسا تو ہو
طور تھرّایا - گرے موسٰے - اثر ایسا تو ہو

انتظارِ یار میں در سے نظر ہٹتی نہیں
جو نہ ٹوٹے کوئی دم تارِ نظر ایسا تو ہو

جان آجائے ابھی میرے تنِ بیجان میں
کہہ کے قُم ٹھوکر لگا دو تم مگر ایسا تو ہو

پیچھے پیچھے حسرتیں اور آگے آگے شوقِ دل
عاشقوں کے قافلہ کا راہبر ایسا تو ہو

کچھ تو ساماں دل بہلنے کا ہو آخر اے سراج
جو رُلائے عمر بھر دردِ جگر ایسا تو ہو!

نذرِ عقیدت

بگرامی خدمت عالیجناب آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب بالقابہ

سرپرست مجلہ "سفیرِ سخن" پشاور

(۱)

عبد قیوم۔ قوم کے سردار — صاحب علم و فضل و جاہ و وقار
تم پہ نازل ہو رحمتِ غفار! — تم سے قایم ہے اس چمن کی بہار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۲)

قائد ملت وزیرِ عظیم وطن — تم نے طے کیں جو منزلیں تھیں کٹھن
پر نہ آئی کبھی جبیں پہ شکن — فخر کرتے ہیں تم پہ اہلِ وطن

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۳)

تم ہو نباض ملتِ افغاں — چارہ سازی میں ثانیٔ لقمان
آڑے وقتوں میں کام آئے بجاں — مشکلیں کی ہیں قوم کی آساں

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۴)

تم ہو اس سرزمیں کے سرسید — درس لیتے ہیں تم سے اہلِ خرد
تم نے کی ہیں وہ کوششیں بے حد — مرکزِ علم بن گیا سرحد

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(کیفی سرحدی)



عالیجناب آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خانصاحب بالقابہ
وزیر اعلیٰ شمالمغربی صوبہ سرحد

سرزمین سرحد کا باعظمت انسان

یعنی

آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب بالقابہ وزیر اعلیٰ شمال مغربی صوبہ سرحد

(از - ابوالکیف کیفی سرحدی)

سرزمین سرحد کے سر سید یعنی عالیجناب نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب بالقابہ خاندان لودھی افغان کے چشم و چراغ ہیں۔ خاندان لودھی کا آخری فرمانروا ابراہیم لودھی بادشاہ دہلی تھا جس نے $\frac{۹۳۲ھ}{۱۵۲۶ء}$ میں پانی پت کے میدان میں بابر بادشاہ سے مقابلہ کیا۔ اور آخرکار اس جنگ میں شہید ہوا۔ سلطنت دہلی لودھی خاندان سے مغلیہ خاندان میں منتقل ہوگئی۔ خاندان لودھی کے بعض شاہزادے کچھ مدت تک دہلی ہی میں مقیم رہے۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس خاندان کے چند افراد افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے۔

اگرچہ ان مہاجرین کا ہر ایک فرد شاہزادہ کہلاتا تھا۔ مگر زہد و تقویٰ و طہارت و طاعت کو شعار بنانے کے سبب لوگوں میں صاحبزادے کے لقب سے شہرت پاکر صاحبزادے کہلانے لگے۔ افغانستان میں جب ان کے قیام پر کچھ زمانہ گذرا تو بعض اکابرین یوسف زائی نے خاندان کے ایک فرد کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ جنہوں نے موضع ٹوپی ضلع پشاور میں سکونت اختیار کی۔ لوگوں نے ان کو بڑے احترام سے رکھا۔ اور بڑی مقدار کی اراضیات بطور سیریات نذر کیں۔ یہ موضع برلب دریائے سندھ واقع ہے۔ اس خاندان کے کچھ افراد علاقہ برگ کی طرف گئے۔ جو دامن کوہ مہابن میں سکونت پذیر ہیں۔ اور وہ بھی صاحبزادے ہی کہلاتے ہیں۔

صاحبزادگان ٹوپی میں سے ایک بزرگ صاحبزادہ عبدالکریم نامی گذرے ہیں۔ جو ایک متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۱۱۶ھ میں وفات پائی۔ اور اس قبرستان میں مدفون ہیں جو مابین مواضع ٹوپی اور مینی واقع ہے۔ ان کی قبر پر پتھر کا کندہ لوح مزار موجود ہے۔ جس سے کچھ حالات تاریخی معلوم ہوتے ہیں۔ اس بزرگ کے تین فرزند تھے۔ جن میں سے بڑے صاحبزادے شرف الدین۔ منجھلے صدر الدین۔ اور چھوٹے جمال الدین تھے۔ صاحبزادہ شرف الدین میں سے ایک فرزند صاحبزادہ قطب الدین تولد ہوئے۔ اور ان کے فرزند صاحبزادہ جمال الدین ہوئے۔ جن سے صاحبزادہ قطب عالم پیدا ہوئے۔ صاحبزادہ قطب عالم کے دو فرزند تھے۔ بڑے صاحبزادہ عبدالرؤف اور چھوٹے صاحبزادہ عبدالبصیر۔ صاحبزادہ عبدالرؤف کے فرزند نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب عالم وجود

میں آئے۔

جناب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب کے جد بزرگوار حضرت صاحبزادہ قطب عالم صاحب ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں تولد ہوئے۔ جب وہ جوان ہوئے تو ان کی ملاقات حضرت سید امیر رحمت اللہ علیہ ساکن کوٹھا شریف سے ہوئی۔ موضع کوٹھا موضع ٹوپی سے ڈیڑھ میل بجانب غروب واقع ہے۔ صاحبزادہ قطب عالم نے حضرت سید امیر رحمت اللہ علیہ کے دست مبارک پر بیعت فرما کر ان کے سلسلہ مریدی میں داخل ہوئے۔ اور اس طرح زہد و تقوی میں ترقی کرنے لگے۔

حضرت سید امیر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے وقت کے نہایت نیک اور صالح انسان و مشہور ولی گزرے ہیں۔ اور صاحب کشف و الہام ہونیکے باوجود وہ ہر چہار سلسلہ ہائے تصوف میں بھی ان کو دخل تھا۔ مگر خود پابند شریعت قرآنیہ تھے۔ اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کو ترجیح دیتے تھے۔ ممالک گرد و پیش میں ان کے لکھوکھا مرید تھے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک قایم ہے۔ ان کی شہرت علم و تقوی سن کر ۱۲۴۱ھ میں سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے مرید خاص حضرت مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نور اللہ مرقدہٗ آپ کی ملاقات کے واسطے کوٹھا شریف میں تشریف لائے۔

حضرت سید امیر علیہ الرحمتہ کے سوانح حیات کتاب سلک السیر فی نظم الدرر میں ان کے مرید مولوی صفی اللہ صاحب نے بالتفصیل لکھے ہیں۔ صاحبزادہ قطب عالم کو حضرت سید امیر رحمت اللہ علیہ نے ایک جوان صالح اور متقی و پرہیزگار انسان پاکر اپنی ہمشیرہ محترمہ ان کے حبالۂ عقد میں دیدی۔ جن کے بطن سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ ایک حضرت صاحبزادہ عبدالرؤف اور دوسرے حضرت صاحبزادہ عبدالبصیر۔ مؤخر الذکر عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہکر عالم جاودانی کو سدھارے۔

حضرت صاحبزادہ عبدالرؤف صاحب بھی اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت سید امیر علیہ الرحمت کے مرید ہوئے۔ اور چونکہ وہ ایک نیک و ہادی نوجوان تھے۔ اور علم میں کافی دسترس حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے حضرت سید امیر رحمت اللہ علیہ نے ان کو عالم باعمل پاکر اپنی ایک دختر نیک اختر ان کے حبالہ نکاح میں دیدی۔ یہ واقعہ ۱۲۷۵ھ کا ہے۔ جن کے بطن سے اول ایک دختر خجستہ فال ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئی۔ اور پھر ایک لڑکا ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا۔ جو بعد میں صد افتخار خاندانی و ملک و ملت ہوکر عالیجناب نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب کہلائے۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد حضرت صاحبزادہ عبدالرؤف صاحب کی یہ زوجہ محترمہ رحلت فرماگئیں۔ اور اس کے چند سال بعد صاحبزادہ عبدالرؤف صاحب بھی بعد از نماز عشاء مسجد سے نکلکر گھر آتے وقت راستے میں

خنجر سے شہید کر دیئے گئے۔ اور اس جرم کا ارتکاب ایک طالب علم نے کسی کی ترغیب جاہلانہ سے کیا تھا جس سے تمام قوم کو سخت صدمہ ہوا۔ اور جتنے لوگ اس ظالمانہ حرکت میں شامل تھے۔ سب کو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی طریقہ سے اپنے کردار بد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ آپ کا جنازہ سید امیر رحمتہ اللہ علیہ نے خود پڑھا۔ اور کوٹھا شریف میں حضرت موصوف کے والد بزرگوار حضرت محمد سعید عرش آشیاں کے مزار پاک کے قریب دفن کئے گئے۔

سرزمین سرحد کا باعظمت انسان آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب بالقابہ:

جس وقت حضرت صاحبزادہ عبدالرؤف علیہ الرحمتہ شہید ہوئے۔ اس وقت آپ کی دختر فرخندہ اختر کی عمر تیرہ برس کی تھی۔ اور خود نواب صاحب موصوف سات سال کے تھے۔ چونکہ ہر دو کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ لہٰذا بغرض پرورش و تربیت کوٹھا شریف میں آپ نے نانا حضرت سید امیر رحمت اللہ علیہ کے زیر سایہ آئے۔ نواب صاحب موصوف بغرض حصول تعلیم کوٹھا شریف کے پرائمری مدرسہ میں تعلیم پاتے رہے۔ اور اردو تعلیم کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر بغرض حصول تعلیم انگریزی مشن ہائی سکول پشاور میں داخل ہوئے۔ اور اسی سکول میں آپ نے انٹرنس پاس کیا۔ اور اس کے بعد آپ کی ملازمت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

ملازمت اور ترقیٔ مدارج

(پس نام پدر جہ مے گردی؟ پدر خویش شو اگر مردی)

چونکہ اس زمانہ میں تعلیم ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ اور سرحد میں انٹرنس کے امتحان سے کوئی مقامی تعلیم یافتہ نوجوان آگے نہیں گئے تھے۔ اور نہ اس وقت ڈاسٹرکٹ پراونشل سروس یا سٹیچوٹری سروس کا بذریعہ مقابلہ یا ڈاسٹرکٹ انتخاب کا دروازہ کھلا تھا۔ اس لئے ۲ر دسمبر ۱۸۸۷ء آپ کو بعمر انیس یا بیس سال تحصیلداری کے عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا۔ اور جلد تر ذہن خداداد اور طبع نو در رس کی وجہ سے امتحان پاس کر کے دفتر کمشنر صاحب بہادر میں مترجمی اور مثلخوانی کے کام پر مقرر کئے گئے۔ ۲ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کو آپ کرنل اومنی صاحب بہادر کے ساتھ میر منشی اور کانفیڈنشل کلرک مقرر ہو کر کوہ سیاہ ضلع ہزارہ کی سرحد پر مہم میں شامل ہوئے۔ وہاں کے حسن خدمات کے صلہ میں ایک تمغہ مع کڑی سرکار ہند نے عطا کیا۔ مہم مذکور سے واپسی پر پھر دفتر کمشنری میں ۶ر نومبر ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۰ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۲ر جنوری ۱۸۹۰ء کو بغرض تربیت بندوبست سیالکوٹ بھیجے گئے۔ اور ازاں بعد کچھ عرصہ تک کوہاٹ میں نائب تحصیلداری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اور ۲۰ر اپریل ۱۸۹۱ء کو آپ سامانہ یعنی میرانزائی مہم کے متعلق تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ اور پھر کرم میں تحصیلدار بندوبست۔ افسر مال و افسر خزانہ کی حیثیت سے ۹ر اگست ۱۸۹۲ء سے

۱۰ مئی ۱۸۹۲ء تک کام کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں آپ نے چندماہ تک انڈو افغان باؤنڈری کمیشن پر بطور پولیٹیکل اسسٹنٹ زیرِ ہدایت سر جان ڈانلڈ صاحب بہادر برٹش کمشنر حد بندی کے سلسلہ میں کام کرتے رہے۔ جس کے صلہ میں آپ کو گورنمنٹ ہند نے ایک خلعت سے جس میں طلائی گھڑی بھی تھی سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں آپ بعہدہ میر منشی و پولیٹیکل اسسٹنٹ انڈو افغان حد بندی کمیشن میں علاقہ اسمار میں زیرِ صدارت مسٹر کیمپ ڈپٹی مقرر ہوئے۔ وہاں سے مراجعت فرمائے پشاور ہو کر دفتر کمشنر صاحب بہادر کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۸۹۶ء میں مہمندوں کے انتظام کے متعلق آپ کو بھیجا گیا۔ جس کے صلہ میں ۱۸۹۵ء میں آپ کو ایک قیمتی تلوار بطور خلعت سرکار انگریزی کی طرف سے عطا کی گئی۔ جنگ تیراہ ۱۸۹۷ء میں چیف پولیٹیکل افسر صاحب مہم ہمراہ کے ساتھ بطور میر منشی و پولیٹیکل اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ اور ان خدمات کے صلہ میں ۲۱ مئی ۱۸۹۸ء کو خان بہادر کا خطاب اور تمغہ جنگ تیراہ مع دو کڑی عطا ہوئے۔ اس سال آپ کو عہدہ میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ جو مستقل ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا عہدہ تھا۔ اس عہدہ پر بہت عرصہ نہیں رہے تھے۔ کہ چندماہ بعد آپ کو اسسٹنٹ پولیٹیکل افسری خیبر کے واسطے منتخب کیا گیا۔ آپ مسلسل ۲۲ سال (یعنی ۱۹۱۹ء تک) فرائض اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹی و پولیٹیکل ایجنٹی سرانجام کرتے رہے۔ اس دوران میں ۱۹۰۴ء) بحیثیت اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر یا اسسٹنٹ کمشنر انڈو افغان کمشن مہمند سیکشن میں شامل ہوئے۔ اور ۱۹۰۸ء میں بازار مہم میں نمایاں خدمات کئے۔ جس کے صلہ میں آپ کو تین ہزار روپیہ جاگیر اور سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۰ء میں چندماہ تک اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ چترال رہے۔ لیکن ضرورت وقت کی وجہ سے واپس خیبر بلائے گئے۔ اور آخری تین سال خیبر میں پولیٹیکل ایجنٹ رہے۔ ۱۹۱۲ء میں دہلی دربار کا تمغہ اور یکم جنوری ۱۹۱۶ء میں نواب کا خطاب پایا۔ خیبر میں آپ نے نہایت قابلیت اور کامیابی سے اس عہدہ جلیلہ کے فرائض ادا کئے۔ آپ کی دیانتداری اور فرض شناسی سے خوش ہو کر سرکار انگریزی نے آپ کو کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور سر کا خطاب دیا۔ اور اسی دن سے آپ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب کہلائے۔

آپ نے ۱۹۱۹ء میں ملازمت کا زمانہ پایہ تکمیل تک پہنچا کر پنشن پائی۔ اور نہایت کامیابی کے ساتھ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

علمی خدمات

ع - ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

قابل اور بدیع مشاہدہ کا یہ اصول ہے کہ جب اپنے آپ کو کسی کام کے لائق پاتے ہیں۔ تو حتی الامکان

بندگانِ خدا کی خدمت سے دریغ نہیں کرتے۔ لہٰذا نواب صاحب نے بھی اسی فرین اصول کو اپنا شعار بنایا۔ چنانچہ جس زمانہ میں حضور والا شان سر جارج روس کیپل صاحب بہادر چیف کمشنر سرحد تھے۔ اور جو اس صوبہ کے ہر دلعزیز، آزاد خیال اور خود مختار حاکم کہلاتے تھے۔ ان کو مسلمانوں اور خاصکر افغانوں کی بہبودی کا بڑا خیال رہا کرتا تھا۔ آپ کو علیگڈھ کی سیر کے دوران میں فروری سنہ ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم اسلامیہ سرحد (اسلامیہ کالج) کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ صاحب موصوف کلکتہ جا رہے تھے۔ اور نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ راستہ میں علیگڈھ کی سیر کے لئے اترے۔ وہاں افغان طلباء نے مبلغ ایک سو روپیہ چندہ جمع کیا۔ اور سر جارج روس کیپل صاحب بہادر سے درخواست کی کہ وہ علیگڈھ کالج میں دیگر امراء کی طرح سرحدی طلباء کے واسطے ایک ہال بنوائیں۔ اور یہ روپیہ طلباء کی طرف سے اس میں شامل کیا جائے جس کے جواب میں سر جارج روس کیپل صاحب بہادر نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے صوبہ میں ایک دارالعلوم علیگڈھ کی طرح بنواؤں۔ لہٰذا یہ روپیہ طلباء کی طرف سے بطور چندہ منظور کیا گیا۔ اور اسی روز سے اس نیک تحریک کی بنیاد پڑی۔ کلکتہ سے واپسی پر نواب صاحب موصوف سر جارج روس کیپل کے پیچھے پڑ گئے اور آخرکار سنہ ۱۹۱۳ء میں ان سر دو اولوالعزم اور عظمت الشانوں کی ہمت سے تہکال کے قریب لب سڑک کابل ایک عظیم الشان دارالعلوم یا اسلامیہ کالج پشاور کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کئی لاکھ روپیہ اس کالج پر صرف ہوا جس میں راعی اور رعایا دونوں شامل ہیں۔ اور اس طرح سرحد میں یہ ایک تاریخی یادگار قائم ہوئی۔ جس کے بانی اول سر جارج روس کیپل بہادر اور دوئم عالیجناب نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب ہیں۔ اس کالج کی اگرچہ خبرگیری اور آبیاری گورنمنٹ کرتی ہے۔ تاہم اسے نواب صاحب موصوف کی جہد مسلسل اور سعی پیہم کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس وقت تک بیس سال میں ہزار ہا طلباء سرحد و پنجاب اس سے مستفید ہو چکے ہیں۔ اس عظیم الشان یادگار میں کتب اسلامیہ۔ علوم جدیدہ قدیمہ کا بڑا بھاری ذخیرہ موجود ہے۔ جن میں بہت سی کتب ایسی بھی ہیں جو تمام عالم میں نایاب ہیں۔ ایک ہائی سکول ہے۔ اور ایک کالج۔ کالج میں ایم۔ اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اور زراعتی تعلیم کا بھی مکمل طور سے انتظام ہے۔ کئی بڑے ہاسٹلز ہیں۔ طلباء کے لئے ہر قسم آسائش اور کھیل کود کا سامان بھی موجود ہے۔ غیر ممالک سے بڑی بڑی شاہی ٹیمیں میچ کھیلنے کے لئے آتی ہیں۔ ادبی جلسوں اور علمی محفلوں سے کالج کی رونق کو دوبالا کیا جاتا ہے۔ ایک بڑا خوشنما تالاب بھی ہے۔ جس میں طلباء تیرنا سیکھتے ہیں۔ ایک بجلی گھر ہے۔ جو تمام کالج کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ ایک ہسپتال ہے جس میں ایک ریٹائرڈ سول سرجن کام کرتے ہیں۔ اس کالج کا اپنا ریلوے سٹیشن ہے۔ ایک خوشنما مسجد ہے۔ اور اس کے بالمقابل ایک ٹریننگ کالج ہے۔

جو نواب صاحب موصوف کی سعی جمیلہ کا حاصل ہے۔ ایک سائنس بلاک ہے۔ غرضیکہ کالج ہے کہ علم کی ایک دنیا آباد ہے۔ اور یہ سب نواب صاحب موصوف کے دم قدم کی بہار ہے۔ گویا نواب صاحب موصوف صوبہ سرحد کے سرسید احمد خان ثانی ہیں۔ اس کالج میں طلباء کو سینکڑوں قسم کے وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔

نواب صاحب موصوف نے دنیا کے مختلف مقامات کے سفر بھی کئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:-

پہلی دفعہ براہ مصر، یونان، ٹرکی، بلغاریہ، آسٹریا ہنگری، جرمنی، فرانس وغیرہ وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں لندن تشریف لے گئے۔ اور واپسی پر سائبیریا، چین، جاپان، ہانگ کانگ اور ملایا سے ہوتے ہوئے مراجعت فرمائے ہند ہوئے۔

دوسری دفعہ ۱۹۲۱ء میں مصر و شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے لندن پہنچے اور وہاں سے امریکہ کے اکثر حصے کی سیاحت کرکے واپس لوٹے۔ اور واپسی پر ہسپانیہ کی پوری سیر کی۔ اور مقامات قدیمہ کارڈووا، سیویل قرطبہ و غرناطہ وغیرہ کے اسلامی مقامات دیکھے۔ نیز شام، سیریا اور بیت المقدس بھی دیکھے۔ اس کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور بیت اللہ شریف اور مدینہ منورہ کی بھی زیارت سے مشرف ہوئے۔

تیسری دفعہ آپ نے صوبہ کی بہبودی کے لئے گول میز کانفرنس میں دو دفعہ ۱۹۳۱ء و ۱۹۳۲ء میں شرکت فرمائی۔

آپ کی ہمت اور سعی سے حضرت سید امیر رحمہ کے خاندان نے علوم دنیاوی اور ملازمت سرکاری میں خوب ترقی کی اور بڑے بڑے عہدوں پر اس وقت فائز ہیں۔ افسوس کہ نواب صاحب موصوف کی کوئی اولاد نہیں۔ بہرحال کالج کے طلباء ہی ان کی اولاد سمجھنا چاہیئے۔ جن کی خدمت کرنے میں صاحب موصوف نے جان و مال تک قربان کر دئے۔ اور ان کو علم کے زیور سے مزین کرنے کی تا ایں وقت کوشش فرما رہے ہیں۔ آپ کو ۱۹۲۹ء میں علمی خدمات کے صلہ میں سرکار انگریزی نے قیصر ہند گولڈ میڈل فسٹ کلاس کا عطیہ دیا۔

ملی خدمات

نواب صاحب موصوف ۱۹۲۳ء لغایت ۱۹۲۶ء ہندوستان کے کرتا دھرتا وائسرائے بہادر کی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن رہے۔ جہاں آپ نے حصول اصلاحات سرحد کے واسطے ہر دو ایوان میں سرتوڑ کوشش فرمائی جس وقت سے لنڈن میں گول میز کانفرنس کی بنیاد پڑی۔ آپ اپنے صوبہ کی طرف

سے نمائندہ منتخب ہو کر بھیجے گئے۔ اور جس خوبی و جانفشانی سے وہاں آپ نے حصول مکمل اصلاحات سرحد کے لئے سعی کی، وہ ہرگز ہرگز قابل فراموش نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس صوبہ کی تاریخ میں ایک زرین یادگار رہیگی۔ اہل سرحد اپنے اس جلیل القدر محسن کا جس قدر شکریہ ادا کریں۔ کم ہے۔

۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء میں جبکہ صوبہ سرحد کو گورنر کا صوبہ بنایا گیا اور اصلاحات نافذ کیے کونسل قائم کی گئی نیز اہل ہند کے ساتھ مساوی حقوق ملنے کا اعلان کیا گیا۔ تو نواب صاحب موصوف کو وزیر شعبہ عجات منتقلہ مقرر کیا گیا۔ اور سب سے اہم بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ محکمہ جنگلات بھی وزیر صاحب موصوف کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ درآنحالیکہ باقی ہندوستان میں یہ محکمہ ہوم ممبر کے زیر نگرانی ہوتا ہے۔ جب سے آپ نے چارج لیا ہے آپ اہل سرحد کے حقوق کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

ارزانی نرخ اشیاء، زراعت اور بیکاری نے جس قدر خرابی ملک میں پیدا کی ہے اسکا نتیجہ بعث ظاہر ہے نیز سرکاری محکموں پر دوسرے صوبوں کے لوگ بکثرت قابض ہیں جس کی وجہ سے اہل سرحد کو کسی محکمہ میں بھی ملازمت کا ملنا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لئے نوجوان یا تو سرخپوش بن جاتے ہیں۔ یا کانگریس کے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خدا کرے کہ حکومت سرحد اور نواب صاحب موصوف اہل سرحد کے بیکار نوجوانوں کے واسطے کوئی ایسے ذرائع روزگار پیدا کر سکیں تاکہ گھر کے رہنے والے اپنے گھر میں آرام سے رہیں۔ اور ان کی روٹی غیر سرحدی چھین کر نہ کھائیں۔ اہل سرحد کو توقع ہے کہ جس طرح اور امورات کا احسن انتظام کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح کوئی ٹھوس تعلیم دینے کا بھی انتظام کیا جائے۔ اور ہر ضلع میں صنعت و دستکاری کے سکول اور کالج کھولے جائیں اور حکومت خود کارخانے کھول کر بیکار لوگوں کو کام پر لگا دے۔ تاکہ ملک امن و چین کی زندگی بسر کرے۔

جہانتک ہم اس صوبہ میں نظر دوڑاتے ہیں ہم کو نواب صاحب موصوف کے سوا اور کوئی اسقدر مدبر اور موزوں انسان جو تمام صفات کا مستجمع ہو۔ دکھائی نہیں دیتا۔ کہ وہ ان کے بعد اسمبلی کی صدارت اور وزارت جیسے اہم منصب کو اس خوبی سے سرانجام دے سکے۔ جس طرح صاحب موصوف اپنے خداداد حسن لیاقت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند کریم ایسے جلیل القدر انسان اور ملک و ملت کے سچے جان نثار اور علم و ادب کے صحیح راہ نما کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

یوں تو سینکڑوں ایسی معنی خیز اور سبق آموز تقاریر ہیں۔ جو نواب صاحب موصوف نے ملک و ملت کی بہبودی کے لئے وقتاً فوقتاً سرکاری جلسوں میں کی ہیں۔ لیکن ذیل میں ایک تازہ ترین تقریر درج کی جاتی

ہے۔ جو حال ہی میں آپ نے سرحدی کونسل کے کھلے اجلاس میں شریعت بل کے متعلق ارشاد فرماکر اپنی حق گوئی اور راست بازی کا آئینہ پیش کیا ہے۔ امید کہ قارئین کرام ان زرین الفاظ کو پڑھکر بے حد لطف اندوز ہونگے نیز سرحد کے اس بطل الخیر دوربین اور وسیع الخیال انسان کی صاف گوئی کی داد دینگے۔ اور آپ کی درازیٔ عمر اور ترقی مدارج کے لئے اپنے مالک حقیقی سے دعائے خیر فرمائینگے۔

(کیفی سرحدی)

تقریر

جو

آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب بالقابہ نے ۸ نومبر ۱۹۳۴ء کو شریعت بل کے متعلق مجلس قانون ساز شمالمغربی سرحدی صوبے میں فرمائی۔

جناب والا! آج اس ایوان کا میلان اس طرف نظر آتا ہے کہ اردو میں تقریریں کی جائیں۔ چنانچہ دیگر معزز ممبران کی تقلید کرتے ہوئے میں بھی اردو میں تقریر کرونگا۔ میرے لئے اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا زیادہ سہل ہے۔ اور اس ذریعہ سے میں اپنے مافی الضمیر کو سب ممبران پر بخوبی واضح کرسکونگا۔ سب سے پیشتر میں اس امر کی تصریح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ میں اس وقت حکومت کے ایک رکن کی حیثیت سے آپ کو مخاطب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ ایک منتخب شدہ ممبر کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ اور جو کچھ میں عرض کرونگا ایک دیہاتی باشندہ کی ذاتی رائے ہوگی۔ غالباً یہ بھی مناسب ہے۔ کہ میں اس بات کا اعادہ کروں کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اہل علم کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ علماء کے خاندان کا ایک رکن ہوتے ہوئے میں شریعت کو ایک مکمل بلکہ اکمل قانون سمجھتا ہوں۔ اور اس کی پابندی اپنے اوپر اور ہر ایک مسلمان کے اوپر فرض عین خیال کرتا ہوں۔ شریعت ان تمام قوانین موضوعہ سے جو آجتک دنیا پیدا کرسکی ہے۔ اکمل ترین مجموعہ قوانین ہے۔ دنیاوی قوانین کی طرح اس میں ضروریات وقت کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہیں پیدا کرسکتے۔ یہ ہر ایک زمانے کے تمام حالات اور ضروریات کے واسطے کافی ہے۔ بلکہ میں یہ کہونگا کہ یہ ایک جامع اور نافع قانون ہے۔ چونکہ شریعت ایک ناقابل تغیر و تبدل فرمان ایزدی ہے۔ یہ مکمل ہے اور تا قیامت مکمل رہے گی۔ اس لئے جہانتک شریعت کے اصول کا تعلق ہے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس میں ترمیم یا تبدیلی کرنے کی جسارت کرے۔

جناب والا! بحیثیت ایک معمولی ممبر کے جہاںتک میں حکومت کے نکتہ نظر کو سمجھتا ہوں وہ یہ ہرگز نہیں کہ ایوان کے ممبران کے خیالات پر کسی طریقہ سے اثر ڈالا جائے۔ حکومت صرف یہ چاہتی ہے کہ اس مسودہ قانون پر غور و خوض، ہو ضابطہ کے مطابق ہو جسکی دوسری مسودہائے قانونی کی صورت میں پابندی کی جاتی ہے۔ اس بارے میں کوئی بے ضابطگی کوئی جلدبازی نہیں ہونی چاہئیے۔ اگر قانون سکون عامہ کے سلسلے میں عام ضابطہ پر پورا پورا عمل نہیں کیا گیا۔ تو غالباً خاص حالات اس بات کے متقاضی ہونگے۔ لیکن وہی طرز عمل ایک ایسے مسودہ کی صورت میں جو شریعت اسلامی کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔ اور جس کا اثر تمام مسلمانوں پر پڑتا ہو۔ اختیار نہیں کرنا چاہئیے۔ جہانتک میں سمجھتا ہوں حکومت نے اس خیال سے اس بل کو برائے حصول رائے عامہ مشتہر کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ خیر یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو آنریبل ممبر صاحب کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور وہ خود ہی حکومت کے نکتہ نگاہ کو وثوق کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ اگر ان کو یقین ہو جائے کہ غیر معمولی ضابطے کو اختیار کرنا ضروری اور لازمی ہے تو وہ اپنی ترمیم شاید واپس لے لیں۔ اور چونکہ میں اپنی شخصی حیثیت سے کھڑا ہوں۔ معاملہ کے اس پہلو کے ساتھ مجھے کوئی بحث نہیں۔ میں صرف اُن اصول کے متعلق جو اس مسودہ قانون کی تہ میں ہیں۔ چند کلمات عرض کرونگا۔ میں اب نفس مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ بعض معزز ممبران صاحبان اصول اور تفاصیل میں فرق نہیں کرتے۔ تقریباً تمام تقریریں جو اپوزیشن کی طرف سے کی گئی ہیں۔ اسلام کی خوبیوں کی نسبت تھیں۔ میرے خیال میں معزز ممبران کا اس بارہ میں تقریر کرنا غیر ضروری ہے۔ اسلام کی خوبیاں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس ایوان کے ہم مسلم ممبران بخوبی جانتے ہیں۔ کہ پابندی شریعت ہم پر فرض ہے۔ سوال زیر بحث تو صرف یہ ہے۔ کہ گذشتہ تیرہ سو سال یا کم و بیش کے دوران میں جو رواجات ناقص ہمارے اندر سرایت کر گئے ہیں ان کو کس طرح سے دور کیا جائے۔ ہماری روزانہ زندگی کے اندر رواج اس طرح سے داخل ہو چکا ہے۔ اور ہمارے دل پر رواج گرد و غبار نے ایسا پردہ ڈال رکھا ہے۔ کہ شریعت غراء کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

اگر حکومت یہ خواہش رکھتی ہے کہ اس مسودہ قانون کو برائے حصول رائے عامہ مشتہر کیا جائے۔ تو غالباً وہ ہماری اس بیماری سے جو ہماری قوتوں کو مضمحل کر رہی ہے۔ واقف ہے اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ عوام الناس کس حد تک اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اور کس حد تک ہماری سعی اس لعنت کو دور کرنے کے لئے درکار ہوگی۔ میں اس ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ پہلی دفعہ نہیں کہ رواج کی مرض کو دور کرنے اور شریعت کے اجراء کی سعی کیگئی ہو۔ میری پیدائش سے چند عرصہ پیشتر ہمارے علاقہ میں سید احمد صاحب جو مجاہدین کے سرگروہ اور قائد اعظم تھے ایک اسلامی حکومت قائم کی۔ انھوں نے ہمارے درمیان شریعت کا اجراء کیا۔ لیکن ہماری بدبخت و ناشکر گذار قوم یوسفزائی نے نہ صرف ان کے جاری کردہ قوانین کی مخالفت کی۔ بلکہ اپنے محسنوں کے خلاف سازش کر کے

ان کو نیست و نابود کر دیا۔ ہمارے اپنے زمانہ میں ایک دوسرے سرکردۂ قوم حاجی صاحب ترنگ زئی نے شریعت کے اجرا کی سعی کی اور لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ شرع کی پابندی کریں۔ مگر جو کچھ انھوں نے کہا چار پانچ سال کے بعد اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ بجائے فائدے کے ان کی کوششوں سے الٹی بدمزگی اور برے نتائج پیدا ہو گئے۔ یہ بعض ایسے واقعات ہیں۔ جو رواج کے مرض کو دور کرتے وقت ہم کو پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

جناب والا! یہ مسودۂ قانون شریعت کے اجرا کی غرض سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس کے متن میں میں ایک فقرہ بھی نہیں دیکھتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ جو لوگ شریعت کو نہ مانیں گے۔ اُن کے لئے کوئی سزا ہوگی۔ اگرچہ ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ کہ ہم خدا کے قانون کو حکومت کے ڈنڈے کے زور سے جاری کرائیں۔ لیکن اگر یہ ضروری ہے تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ جو مسودہ قانون اس بارے میں پیش کیا گیا ہے اس میں اسلامی قانون کی تمام ضروریات کو شامل نہ کیا جائے۔ ایک ایسے مسودہ سے جس کو مسودۂ قانون شریعت کہا جائے پانچ بنائے اسلام خارج نہیں کئے جا سکتے۔

اس مسودۂ قانون کی بنیاد اس اصول پر قائم کی گئی ہے۔ کہ جب ہم عدالتوں میں جائیں تو ان سے کہیں کہ ہم کو پابند شریعت بنائیں یہ صورت حال ایسی نہیں جس پر ہم فخر کر سکیں۔ کیا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم حکام کے پاس جا کر ان سے درخواست کریں کہ وہ ہم کو راہ راست پر لاویں؟ ہم کیوں بغیر کسی قانون کی امداد کے شریعت کی پابندی نہ کریں؟ ہمارے شہروں میں ہم شریعت کے پابند ہیں۔ یہ صرف دیہاتی آبادی ہے۔ جو راہ راست سے بھٹک گئی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے معزز دوست جناب مجوز صاحب کس حد تک خود شریعت کے پابند ہیں۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس بارے میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ باقی رہا یہ کہ کونسا طریقہ زیادہ احسن اور مسلمانوں کی خودداری کے مقتضی ہے۔ تو یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کی بابت میں اس وقت بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بحیثیت ایک مسلمان کے میں ہر ایسی تحریک کا حامی ہوں۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی بہتری ہو۔ اور میں نہایت صفائی اور پُرزور طریقہ سے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ مجھ اس مسودۂ قانون کے اصول کے ساتھ پورا اتفاق ہے۔ اور میں یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اس مسودہ میں ان لوگوں کے لئے جو شریعت کی پابندی سے احتراز کریں۔ سزا مقرر ہونی چاہئے۔ اور نیز پانچ بنائے اسلام بھی اس میں درج ہونے ضروری ہیں۔

ملک خدا بخش:- جناب والا! مجھے اعتراض ہے۔ آنریبل وزیر صاحب بحیثیت ایک منتخب شدہ ممبر کے اصلی تحریک کے حسن و قبح پر بحث نہیں کر رہے۔ بلکہ اسلامی قانون کی تشریح کر رہے ہیں۔ اور اصلی نکتہ

سے دور چلے گئے ہیں۔ ان کو اصل مضمون سے باہر جانے سے روکا جائے۔ اور مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی تقریر کو مشتہر کرنے کی تحریک تک ہی محدود رکھیں۔

صدر :۔ آنریبل وزیر صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں بالکل حق بجانب ہیں۔

نواب سر صاحبزادہ عبد القیوم خان صاحب :۔ جناب والا! میرا یہ جواب ہے کہ معزز مجوز صاحب اور اس کے موید اگر اسلامی قانون کے اصول پر زور نہ دیتے اور اپنی تقریروں کو صرف مشتہر کئے جانے کی تحریک تک محدود رکھتے۔ تو میں بھی ان کی تقلید کرتا۔ مگر بہت سا وقت انھوں نے بھی اسلام کی خوبیاں بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ میں تو صرف ان کی تائید کر رہا ہوں۔ اور ان کی ہمت افزائی کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اس رواج کی لعنت کو جو نہ صرف طبقہ خوانین تک محدود ہے۔ بلکہ علماء بھی اس کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دور کریں۔ اور میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو اس مسودہ قانون کے حامی ہیں کہاں تک خود اس کی پابندی کرتے ہیں۔

ملک خدا بخش :۔ جناب والا! معزز مقرر صاحب ممبران کی طرف ذاتی اشارہ کر رہے ہیں جو خلاف قاعدہ ہے۔ ان کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں۔

صدر صاحب :۔ آنریبل وزیر صاحب نے فرمایا۔ کہ وہ شریعت بل کی تعریف کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس میں کوئی خلاف قاعدہ بات نہیں ہے۔ آپ کو پہلے ان کی تقریر کو سننا چاہیے۔ اور پھر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔

آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبد القیوم خان صاحب :۔ الغرض جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ شریعت کے نفاذ کے لئے کسی خاص قانون کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت ایک حکم الٰہی ہے۔ جو ہمیشہ کے لئے نفاذ پذیر ہے۔ در اصل یہ بل رواج کی علت کو جو ہماری سوسائیٹی کے اندر جڑ پکڑ چکی ہے۔ دور کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے زیادہ موزوں ہوتا کہ اس بل کا نام بجائے شریعت بل کے تنسیخ رواج بل ہوتا۔ شریعت تو پانچ بنائے اسلام پر قائم ہے۔ جن کی بابت کوئی اختلاف رائے نہیں۔ ہم اس مسودہ قانون کو تب شریعت بل کہتے اگر اس میں پانچ بنائے اسلام کو قائم رکھنے کے متعلق کوئی تجویز ہوتی۔ اور اس میں ایسے احکام ہوتے کہ جن کی رو سے ایک دولت مند آدمی کو مجبور کیا جا سکتا۔ کہ وہ حج کو جائے۔ اور زکوٰۃ ادا کرے علاوہ بے نمازیوں کے لئے پابندی نماز لازمی قرار دی جاتی۔ غرض یہ مقاصد صفائی قلب اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور ہونے چاہئیں۔

اس وقت ایوان کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ بل حصول رائے عامہ کے لئے مشتہر کیا جائے۔ یا نہ۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی مسلمان سے یہ پوچھنا کہ وہ شریعت مانتا ہے۔ یا نہیں ایک بے ضرورت بات ہے۔ شریعت ایک اٹل مذہبی قانون ہے۔ اور تمام مسلمان اس کے آگے سر تسلیم خم ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے۔ کہ بہت سے جلسے ہوئے۔ اعلان کئے گئے۔ اور اشتہارات چھپے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعض متقدر جماعتیں اس مسودۂ قانون کے حق میں ہیں۔ لیکن میں اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہر ایک طبقہ اور ہر ایک قسم کے خیالات کے لوگوں کا اس بل کے ساتھ پورا پورا اتفاق ہے۔ کم از کم اس ایوان کے ایک معزز ممبر کی نسبت تو معزز ممبران اپوزیشن کو بھی اچھی طرح سے معلوم ہے۔ کہ ان کے پیش کردہ مسودہ کے بعض حصول سے اسقدر تعرض ہے۔ کہ اس دن وہ اس مسئلہ پر ان کے ساتھ تقریباً مشت وگریبان ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ وہ صاحب اس وقت اس ایوان کے اندر ایک بڑی متقدر حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بہت شد و مد کے ساتھ تحریک مشتہری کے حق میں ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اور بہت سے ایسے لوگ ہوں۔ جو ان سے متفق ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کا طبقہ جو علمبردار شریعت ہے۔ اس بل کے متعلق اپنی رائے قائم کر چکا ہے۔ اور ابھی تک لوگوں کی طرف سے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ تاہم سوال یہ ہے۔ کہ وہ لوگ جن پر یہ قانون اثرانداز ہوگا آیا وہ اس کے نتائج اور اثرات سے واقف ہیں یا نہیں۔ جہانتک مجھے علم ہے۔ عوام اس مسئلہ کے صرف مذہبی پہلو کو سمجھتے ہیں۔ اور وہ اس قانون کے نفاذ کے نتائج سے بخوبی واقف نہیں۔ وہ لوگ جو تصویر کے دونوں رخ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس بات کے خواہشمند ہیں۔ کہ وہ اس مسئلہ کے ہر ایک پہلو پر غور کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں۔ اس خیال میں ہیں۔ کہ یہ مسودہ حصول آراء کے لئے مشتہر کیا جائیگا۔ اور اس طور پر ان کو موقع دیا جائے گا۔ کہ وہ بھی اپنی رائے سے اس ایوان کو آگاہ کر دیں۔ اگر وہ لوگ اس بل کی اشتہری کے بعد بھی اسی طرح سے خاموش رہیں جیسا کہ اب ہیں۔ تو ہم ان کی خاموشی کو تائید کے مترادف سمجھیں گے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہونگے۔ اس لئے کہ بہرحال الخاموشی نیم رضا ایک پرانی ضرب المثل چلی آتی ہے۔ لیکن ہم اس قسم کی تعبیر تب ہی کر سکتے ہیں کہ جب مسودہ زیر بحث مشتہر کیا جا چکا ہو۔ لوگوں کے خاموش رہنے کی صورت میں لازماً عام طور پر منسوخ تصور ہو سکتا ہے۔ الا اس صورت میں کہ کوئی فرد یا افراد کسی خاص معاملہ میں کوئی خاص طرز عمل اختیار کریں۔ یہاں پر ہمارے کئی لیڈی لارڈ (خواتین) ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہوگی۔ اگر وہ خاموش نہ رہے تو خدا جانے کہ وہ اس کے متعلق کیا کچھ کہدیں۔ ان کو موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اگر وہ خاموش رہیں تو میرے معزز دوست لیڈر آف دی اپوزیشن اور ان کی جماعت کو حق حاصل ہوگا۔ کہ وہ الخاموشی نیم رضا کے اصول سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اس مسودۂ قانون کو بغیر کسی دقت کے منظور

کرالیں۔ جو سوال ایوان کے سامنے پیش ہے۔ وہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے ایک ایسی بیماری کا علاج کرنا ہے۔ جو تیرہ سو سال کی پرانی ہو چکی ہے۔ یہ بیماری رواج کی ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ بیماری آیا عرب۔ مصر۔ ترکی۔ افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ شہر پشاور میں شریعت پر عمل ہوتا ہے۔ مگر دیہاتی آبادی عموماً ابھی تک رواج کی غلام ہے۔ یہ بل ایک سادہ اور مفید مسودہ قانون ہے۔ مگر ممکن ہے۔ کہ رواج وراثت کی موجودگی میں وہ مقاصد جن کے لئے یہ مرتب کیا گیا ہے۔ حاصل نہ ہو سکیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ جو لوگ رواج کا دامن پکڑے ہوئے ہیں ان کی رائے دریافت کی جائے۔ کہ وہ کس حد تک قانون مجوزہ کے احکام کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور کس حد تک وہ رواج کی اس بیماری کے علاج کے لئے آمادہ ہیں جس میں کہ وہ مبتلا ہیں۔ دو تین ماہ کے عرصہ میں بیماری کوئی بہت پرانی اور لاعلاج نہیں ہو جائیگی۔

میرے دوست ڈپٹی لیڈر انڈیپنڈنٹ پارٹی کو یہ خوف لاحق ہے کہ اگر اس قانون پر آج غور ملتوی ہو جائے تو شائد اس کونسل کی زندگی میں اس پر پھر غور و خوض نہ ہو سکے۔ میں حیران ہوں کہ کس حد تک یہ خطرہ جائز ہے۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ اس کونسل کی زندگی کو وسعت دی جائیگی۔ یا نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ مسودہ قانون ہمارے سامنے دوسرے بجٹ سیشن میں ضرور آئیگا۔ ممکن ہے کہ یہ آئیندہ موسم خزاں تک ملتوی ہو جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے۔ تو گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریخ قانون سازی میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ پنجاب میں اس قسم کے قوانین برسوں تک ملتوی پڑے رہے ہیں۔ بہرحال معاملہ کا ملتوی ہونا تو صرف قیاس ہے۔ ورنہ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ اس قانون کا اس کونسل کی زندگی کے اختتام سے پہلے فیصلہ نہ ہو جائے۔

ایک اور وجہ سے بھی مشتہری اہمیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ میرے معزز دوست منتخب شدہ ممبر بنوں نے فرمایا ہے۔ علماء کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اس مسودہ قانون کی خوبیاں لوگوں کو سمجھائیں اور اس کے نفاذ کے لئے لوگوں کو تیار کریں۔ مقصد یہ ہے کہ جس وقت اس قانون کو نافذ کیا جائے۔ اس وقت پبلک کی طرف سے کوئی احتجاج نہ ہو۔ اور نہ لوگوں میں کوئی بے چینی پیدا ہو۔ یہ بہت مفید ہوگا کہ اس بل کو دو تین ماہ کے لئے مشتہر کرکے عوام کو موقعہ دیا جائے۔ کہ اگر اس کے تفصیلات میں کوئی نقائص ہوں تو ہماری توجہ ان کی طرف مبذول کرائیں۔ ہر ایک نکتہ نگاہ سے یہ ضروری ہے کہ وہ مسودہ جو آخر میں قانون کی صورت اختیار کرے ہر طرح سے مکمل ہو۔ مجھے اطمینان ہے کہ حکومت مقامی اس مسودہ قانون کے راستہ میں کوئی رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ گورنر جنرل کی اجازت حاصل کرکے اپنی ہمدردی کا ثبوت دے چکی ہے۔

معرکۂ قدیم وجدید

(سید العلماء علامہ سید علی نقی قبلہ وکعبہ۔ لکھنوی)

جنگ ہے کہ الامان۔ ہنگامہ ہے کہ الحذر۔ بگیر بکش۔ توپوں کی گرج۔ گولوں کی دھمک۔ تلواروں کی جھنکار۔ گھوڑوں کے ٹاپوؤں کی آواز۔ ہنگامۂ دار وگیر۔ یہ سب کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ان مضامین کے سامنے جو اخباروں میں طرفین کی جانب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

خیالات مختلف۔ طبائع جداگانہ۔ ایک زمین کی کہتا ہے تو دوسرا آسمان کی۔ ایک شرق کی تو دوسرا غرب کی۔

قدیم روایات کے پابند گروہ کا خیال کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ پرانی لکیر کا ایک نقطہ نہ ہٹے۔ آسمان قدیم۔ زمین قدیم۔ آسمان کی گردشیں قدیم۔ تو زمانہ بھی قدیم۔ پھر آخر جدید باتوں کو پیدائش کا حق کیا ہے۔

جو جدید بات پیش کرو وہ اسی لئے مسترد کر دینے کے قابل ہے کہ وہ جدید ہے۔

باپ دادا سے کبھی سنی نہیں گئی۔ خاندانی رسم ورواج کے خلاف ہے۔ پشتہا پشت سے جو کچھ ہوتا چلا آیا۔ اس کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

وہ گروہ جو نئی روشنی کا دلدادہ ہے۔ شمع کافوری سے جس کی آنکھیں دکھنے آتی ہیں۔ بجلی میں دل کا کنول کھلتا ہے۔

وہ اس بات کا مدعی ہے کہ جدت اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو بات جدید ہو وہ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل، قدیم باتیں سب حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے قابل ہیں۔

بزرگ بوڑھے۔ ان کی عقل بھی بوڑھی۔ ہم جدید زمانہ کی پیداوار۔ ہمارا زمانہ بھی نیا۔ آسمان قدیم بتایا جاتا اور بوڑھا کہا جاتا تھا۔ پیر چرخ یا فلک پیر کی ستمگاریوں نے سب کی عمر اور شاعروں کی خصوصاً جان عذاب میں کر دی تھی۔ اب اس کی عمر ہی ختم ہو گئی۔ آسمان ہے ہی نہیں۔ حد نظر ہے اور بس۔

یہ دونوں فریق ہیں جو برابر دست وگریباں ہیں۔ اور ان میں جو اختلاف کی خلیج حائل ہے اس نے اجتماعی شیرازہ کو اتنا پریشان کیا ہے جس کی حد نہیں۔

غور وتدبر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی خیال نقطۂ حقیقت سے ہٹے ہوئے افراط وتفریط

کے کرشموں کا نتیجہ ہیں۔

بات یہ ہے کہ انسانی طبیعت جذبات کی پابند ہے اور جذبات مختلف ہوتے ہیں۔ انسان کو قدیم باتوں سے الفت و محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جو کسی غور و تدبر کے تحت میں نہیں ہے۔ اور کل جدید لذیذ" کی بنا پر تازہ بات کے پیچھے دوڑ جانا اکثر طبائع کا خاصہ جس میں کسی عقلی نظریہ کو دخل نہیں ہے۔

بازار میں نئی وضع کا کپڑا دیکھکر طبیعت لہلوٹ ضرور ہوگی۔ چاہیے اپنے پاس جو موجود ہے وہ اس سے بہت بہتر کیوں نہ ہو۔

بس یہ قدیم و جدید کی جنگ انہیں دونوں جذبوں کے ماتحت ہے۔ اسمیں نہ غور و فکر کا کوئی دخل ہے نہ عقل و تدبر کا۔ قدامت و جدت کو حسن و قبح کا معیار بنانا اپنی عقل کو جذبات کا ماتحت کر دینا ہے جو انسانی بلند نظری کے بالکل خلاف ہے۔

اسلام جو ہر بات میں اعتدال کو ملحوظ رکھتا ہے اور یہی اس کے ایک مکمل ترین شریعت ہونے کا رمز ہے اس نے اس جدت و قدامت کی جنگ میں ایک اعتدالی اصول مقرر کر دیا ہے۔ جس کا پابند ہو جانا اس جنگ کو ختم کر دینے کا باعث ہے۔

ایک طرف اس نے (اِنّا وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون) کے الفاظ میں قدامت پسندوں کے قابل افسوس نظریہ کو نقل کرتے ہوئے (قل اولو کان اٰباؤکم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون) کہکر سنجیدہ طریقہ سے ان کے خیال کی رد کی ہے۔ اور دوسری طرف (من احدث حدثا او اوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ) اور (کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار) کے تہدید آمیز پیرایہ میں دین کے اندر تراش و خراش اور نت نرالے من گھڑت تحریکات کا سدباب کرتے ہوئے تجدد کی رو کو روکا ہے۔ تیسری جانب (من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا من عمل بہا الی یوم القیامۃ) کے گرانقدر ارشاد سے تجدد کے نظریہ میں حکیمانہ روح پھونکی ہے۔

اگر ان تینوں قسم کے آیات و اخبار کو پہلو بہ پہلو رکھکر نتیجہ اخذ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے ایک بہترین اعتدالی قانون پیش کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی قدیم رسم کو صرف اس وجہ سے مقدس سمجھنا کہ وہ قدیم ہے ناقابل قبول اور رسوم صنم پرستان عرب کی ذہنیت کا مظاہرہ ہے اور ہر متجددانہ تحریک کا بغیر غور و فکر اور قانون عقل و شرع کے مطابق کئے ہوئے خیر مقدم کرنا۔ اور اس کے تجدد سے مرعوب ہو جانا بھی دانشمندی کے خلاف ہے۔

کتنی نئی تحریکیں ایسی ہوتی ہیں۔ جنمیں قوم کی فنا کے راز مضمر ہوتے ہیں۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم) ظاہر ہے کہ ہر سابقہ حالت میں تغیر کے لئے تجدد لازمی ہے۔

انسانی عاقبت اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ جو جدید تحریک سامنے آئے اس کو سابقہ رسم و رواج، طرز عمل کے سامنے رکھکر عقل و شرع کی روشنی میں موازنہ کیا جائے۔ اور ان دونوں میں سے جو میزان اعتبار میں مکمل ثابت ہو۔ اس کو اختیار کیا جائے۔ لہذا صرف تجدد میں ترقی کے راز کا منحصر سمجھ لینا اور یہ خیال کرنا کہ ترقی و جدت لازم و ملزوم ہیں۔ لہذا جو قوم جسقدر جلد ترقی کی طرف قدم بڑھانا چاہے۔ اس کو اسی قدر جلد جدت قبول کرنا ہوگی۔ دانشمندی سے بعید ہے۔

ہم جدت کو ہوا نہیں سمجھتے۔ اور نہ قدامت میں کسی معصومانہ صفت کے قائل ہیں۔ لیکن اتنی آرزو ضرور رکھتے ہیں کہ جدت کو صرف جدت کی نظر سے دیکھکر اس کی مدح میں قصیدہ خوانی نہ کی جائے۔ اور قدامت کو صرف قدامت کے گناہ پر مورد طعن نہ قرار دیا جائے۔ بلکہ ہر نئی تحریک کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ ہماری قومی و مذہبی زندگی کی برباد کرنے والی اور ہماری ملی خصوصیات کی فنا کرنے والی تو نہیں ہے۔



ہندوستانی ارت

Durga Art Press Anarkali Lahore

اودھ میں آخری تاجپوشی

(ادیب الہند جناب مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ہفتے کا دن ماہ صفر کی چھبیس ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء سر شام سلطان عالم محمد واجد علیشاہ بہادر کی تاجپوشی اور تخت نشینی کا غلغلہ تمام شہر میں ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا ہے۔ پلٹنیں سلامی کو پراجمائے کھڑی ہیں۔ کاریوبی خوشنما وردیاں پہنے ہوئے سوار تیل رہے ہیں۔ رسالہ والوں کے سنئے ٹھاٹھ ہیں۔ در دولت سے گلستان ارم کوٹھی فرح بخش تک روشنی کے ٹھاٹھ لگے ہیں۔ ہر برج پر ترامی کی جھنڈیاں نصب ہیں۔ خاص بازار سے رمنے تک میلا لگا ہے۔ روند چھر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ انتہائی روشنی سے دیوالی کی رات معلوم ہوتی ہے۔ دریا میں چراغوں کی روشنی کے عکس سے پانی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دریا میں بجرے سجے ہوئے کھڑے ہیں۔ دو شالوں کے بادبان چھوٹے ہوئے ہیں۔ مچھلی والے بجرے پر ڈنکا نرم بج رہا ہے۔ مانجھی ڈانڈوں سے جلترنگ بجا رہے ہیں۔ باغ گلستان ارم رشک بہشت بنا ہوا کوٹھی فرح بخش دولہن کی طرح سجی ہے۔ لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ غربی اور شرقی دونوں پھاٹک۔ رستے کے بند ہیں۔ سامنے میں مہاراجہ بالکرشن کی سواری آئی۔ پھاٹک کھلا۔ روش پر نواب امین الدولہ ٹہل رہے ہیں۔ فتح الدولہ اور میر عنایت علی رسالدار کو اپنے ہمراہ لیکر بارہ دری کی کوٹھی سے گلستان ارم میں چلے آئے۔ مہاراجہ بالکرشن نے فرمان جلوس سنایا۔ دوسری طرف مصلح السلطان اہتمام الدولہ حیدر حسین خاں۔ شرف الدولہ غلام رضا خاں، مرزا وصی علیخاں، حفیظ الدولہ، مولوی امیر باقر علی سفیر شاہی کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سواری کی آمد آمد کا غل ہوا۔ چوبدار مرو سے پکار رہے ہیں۔ "سواری ہے بادشاہ عالم کی نگاہ روبرو" "جانوں طرف سے ہٹو، بچو کی آواز آرہی ہے۔ کرنل رچمنڈ ریذیڈنٹ بہادر خفا ہو رہے ہیں۔ کہ کیوں اتنا غل مچایا ہے۔ آہستہ بولو آہستہ بولو اس شور و غل میں سنتا کون ہے۔ آخر سپاہی سے ولایتی لیکر میں لگائی۔ اور صاحب بہادر بھی قرینہ سے کھڑے ہوگئے۔ جب سواری کا بوجھ زینے پر چڑھنے لگا۔ ہمراہیوں کی کثرت سے آہنی جنگلہ جو زینے کی کروٹ میں لگا تھا ٹوٹ کر نیچے آرہا۔ بادشاہ کی سواری بارہ دری کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑے صاحب سے ہاتھ ملایا۔ بادشاہ کے مقرب خاص امیر الدولہ میر مہدی علیخاں سونے کا خاصدان ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ نواب علی نقی خاں تسبیح ہاتھ میں لئے وظیفہ پڑھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سیف الدولہ علی حسین خاں داروغہ دیوان خانہ صحن میں کھڑے ہیں۔ بادشاہ تخت رواں پر سوار ہوئے بارہ دری کے کمرہ خاص میں جاکر دوگانہ شکر اللہ ادا کیا۔ عبائے خاص دوش پر ہے۔ سیف ایرانی ہاتھ میں ہے۔ گلے میں موتیوں کا مالا پڑا ہے۔ کمر سے پٹکا بندھا ہے۔ مشروع کا پائجامہ بڑے پائنچے کا پہنے ہوئے۔ سرخ کشمیرے شال کی قبا پر متن زیب جسم ہے۔ دو پلی گلے دار کامدانی کی لیس دار ٹوپی زیب سر ہے۔ زلفیں چھٹی ہوئی۔ گھیتلا جوتا کامدار زیب پا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔

نواب مجد الدولہ نے چھوٹی کشتی جس میں تاج شاہی رکھا تھا پیش کی۔ ابھی بادشاہ تخت پر کھڑے تھے۔ کہ جناب مجتہد العصر

نے تاج شاہی بسم اللہ کہکر زیب سر کیا۔ ایک طرف بڑے صاحب بھی تاج میں ہاتھ لگائے ہوئے ہیں۔ بہ آواز بلند کہا واحد علی شاہ بہادر بادشاہ اودھ ہوئے۔ پھر بادشاہ تخت پر چار زانو ہو بیٹھے۔ تخت کے اوپر ایک کارچوبی منڈھا بھی کھنچا ہے۔ جس کی ڈوریاں ریشمی ہیں۔ اور کھمبے چاندی سونے کے ہیں۔ اس کے نیچے چھتر مرصع خواص لئے کھڑا ہے۔ پشت پر دو چتور بردار کھڑے۔ (یہ وہی تخت و تاج و چتر ہے جو غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت میں دو کروڑ روپے میں تیار ہوا تھا۔ پہلے نواب نے نذر پیش کی۔ پھر شہزادوں نے نذریں دیں۔ بڑے صاحب زیر تخت کرسی پر بیٹھے۔ اور سب صاحب لوگ کھڑے رہے۔ ملازموں نے باادب سلام کرکے نذریں پیش کیں۔ تمام رجواڑوں کی طرف سے نذریں گذریں۔ نذر کی اشرفیاں وزیر کی تحویل میں جمع ہوئیں۔ بادشاہ نے پہلے پانچ نام سادات حسینی کے دستخط فرمائے۔ مبارک سلامت کا غل ہوا۔ کئی ہزار طبلے پر تھاپ پڑنے لگی۔ اچھے سروں میں شہنائی بجائی گئی۔ نور کے طائفے جن کی سنہری رُپہلی موباف پڑے، دوپٹوں پر کامدار چھڑیاں بنی ہوئی پلّے کی تیلی، اطلس کی گوٹ، گاتیاں لگائے ہوئے کمر لچکتی ہوئی سردی کا زمانہ ہے۔ سرخ و سبز کارچوبی دوشالے جہاں فدا کھسک گئے۔ کانوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ ان کا بہاد تیا کے نازسے پھٹا مارگنی کا ساز کے پردے سے نکلنا تان کا ٹوٹنا عجب لطف دکھارہا ہے۔ سردئی پشوازیں بہار دکھارہی ہیں۔ ڈھاڑی دلکش انداز سے ساز بجا رہے ہیں۔ کلاونت پر بین کندھوں پر اچھے اچھے بین رکھے کھڑے ہیں۔ اشارہ ہوا اور بیٹھ گئے۔ پٹہ غزل ٹھمری ترانہ خیال اڑا رہے آوازوں میں سمندر کی پاٹ ہے۔ چینی لوگ منہ سے جلترنگ بجا رہے ہیں۔ فرنگی ارگن باجا بجا رہے ہیں۔ کہیں بیلا بجتا ہے۔ اہل دربار کو خلعت ملے۔ نمک خواروں نے مزے لوٹے۔ فرمان معافی جاری ہوئے۔ سلامی کی توپیں شہر کے چاروں طرف چھوڑی گئیں۔ ڈھنڈھورا پٹا حکم خدا کا ملک بادشاہ کا۔ آج سے اودھ کے بادشاہ سلطان عالم محمد واحد علیشاہ بہادر ہوئے جو کوئی عدول حکمی کریگا سخت سزا پائیگا پھر تخت سے اتر کر تخت رواں پر سوار ہوئے۔ ایک طرف بڑے صاحب ایک طرف چھوٹے صاحب ہمرکاب ہوئے۔ روشن چوکی والے شادیانے بجاتے ہوئے ساتھ ساتھ ہوئے۔ کمپنی بہادر کی طرف سے فوج واسطے حفاظت کے آئی۔ نواب امین الدولہ مع اہل محلہ رخصت ہوئے۔ چھاونی سے پانچ کمپنیاں واسطے انتظام کے آئیں حضور کی سواری محلسرا میں اتری۔ جرنیل مرزا سکندر تخت بھائی کی نذر دیکر بہت آبدیدہ ہوئے۔ بادشاہ بہو نواب ملکہ کشور فخر الزمانی نواب تاج آرا بیگم والدہ بادشاہ نے بلائیں لیں۔ پیلے صدقے اترنے لگے۔ محلسرا کے تمام محلوں نے نذریں دیں۔ اتنے میں ابر رحمت گھر آیا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ صبح کو نواب امین الدولہ، سعید الدولہ اہل دربار منتظر تھے کہ حضور تشریف لائے۔ پھر وہی جشن وہی جلسے ہونے لگے۔ انعام و اکرام تقسیم ہوئے۔

کچھ دنوں کے بعد نواب امین الدولہ معزول ہوگئے۔ ۵ اگست ۱۸۴۷ء نواب علی نقی خان بہادر کی سفارشیں پہنچیں۔ بادشاہ نے طلب فرمایا حاضر ہوئے۔ سلام کیا۔ نذر دی۔ انتیس پارچہ کا خلعت وزارت مرحمت ہوا۔ رکن رکین۔ خلافت و جہانداری اعتضاد سلطنت و شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک معتمد الخاقان تلمیذ السلطان۔ سیف مسلول۔ رمح مصقول معرکہ دشمن گاہی ساعد مساعد یکرنگی و صفا۔ نیر مناہج۔ صداقت و وفا مرید مرشد پرست اخلاص گزین خانہ زاد، عقیدت سرشت ہفوت آئین مختار ذی اقتدار یار وفادار سپہ سالار رستم عہد، مدار الدولہ، منتظم الملک نواب علی نقی خان بہادر سہراب جنگ فدوی خاص جان نثار ابو المنصور

ناصرالدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ" خطاب ملا۔ پچیس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ انھوں نے دست بستہ عرض کی کہ فیض آباد کا داروغہ عدالت (جج) حفیظ اللہ فرنگی محل کا مولوی بے قصور محض وزیر سابق کے عتاب میں آگیا ہے۔ میری دوستی کے صلے میں خانہ نشین ہے۔ میری مروت سے بعید ہے کہ میں خلعت وزارت پہن لوں۔ اور وہ محروم رہ جائے۔ حکم ہوا اچھا ان کو بھی پیش کرنا۔ دوسرے روز مولوی صاحب طلب ہوئے ان کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا کہ شاہی چوبدار نے آکر سلام کیا۔ اور کہا کہ آپ کو وزیر اعظم نے یاد کیا ہے۔ یہ اس کو امداد غیبی سمجھکر حاضر آستانہ عالی ہوئے۔ دربار لگا ہوا ہے۔ وزیر علی نقی خان دست راست کرسی پر جلوہ فرما ہیں۔ شہزادے دہنی طرف کرسیوں پر فروکش ہیں۔ اکابرین سلطنت، رفقاء و مصاحبین اپنے اپنے مراتب سے بیٹھے ہیں کہ ڈیوڑھی سے چوبدار نے آواز دی " بادشاہ عالمیان برائے حفیظ اللہ حاضری نگہ دارد " اسی طرح ڈیوڑھی سے دربار تک دو طرفہ چوبدار کھڑے ہوئے آواز یکے بعد دیگرے لگا رہے ہیں۔ کہ مرد ہے کو خبر ہو گئی۔ اس نے دست بستہ عرض کیا مولوی حفیظ اللہ حاضر ہے۔ بادشاہ نے اشارہ ابرو سے اجازت حضوری دی۔ مولوی حفیظ اللہ لال پردے کے پاس کھڑے تھے۔ داروغہ ڈیوڑھی نے حکم دیا۔ جانے دو۔ پردہ اٹھتے ہی راجہ اندر کا اکھاڑا نظر آیا۔ یہاں سے جھک جھک کر برابر سلام کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے دہنے ہاتھ پر پانچ اشرفیاں (جو کسی مہاجن سے سود پر لائے تھے) رکھکر بایاں ہاتھ نیچے رکھکر نذر دکھائی۔ بادشاہ نے صرف ہاتھ رکھدیا۔ نذر قبول ہو گئی۔ ہفت پارچہ کا خلعت ملا۔ اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ سابق پر بحال ہوئے۔ خلعت میں چیرہ، گوشوارہ، دوشالہ۔ رومال۔ تھان کمخواب۔ ٹیکا۔ تسبیح مونگے کی مرحمت ہوئی۔ رخصت ہو کر گھر آئے۔ وزیر نے سرکاری ہاتھی پر سوار کر کے بھیجا۔ گھر پر آ کے ایک ہزار روپیہ مہاجن سے اور سودی لیا۔ شام کو مرد ہے چوبدار شاہی محلہ کے لوگ انعام کے لیے حاضر ہوئے۔ بمشکل تمام پانچسو روپیہ انعام دیکر جان بچائی لوگوں نے کہا یہ مولوی صاحب ہیں جو کچھ دیں تبرک سمجھکر لے لو۔ دوسرے روز واجب العرض پیش کی کہ بخشی گری میں حکم بھیج دیا جائے۔ جو منظور ہو گئی۔ مولوی صاحب اپنے سابقہ عہدے پر ممتاز ہو کر فیض آباد گئے۔ اسی طرح تاجپوشی کا جشن مہینوں رہا۔ رفیق خاص خواجہ اسد علیخان قلق کو خلعت سرفرازی عطا ہوا۔ مصاحبین خاص میں اسم ہو گیا۔ پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ اسد علی خان بہادر شمس جنگ خطاب ملا۔ علی حسین خان کو سیف الدولہ خطاب ملا خدمت دیوانخانہ تفویض ہوئی۔ مہاراجہ بالکرشن کو مسار الدولہ خطاب ملا خدمت دیوانی عطا ہوئی۔ حمید حسین کو انتظام الدولہ خطاب ملا دیوان عام کے مہتمم ہوئے۔ بسعد الدولہ گلبن دولہ دیانت الدولہ احسن الدولہ مروز الدولہ خواجہ سرا نواب ناظر محلات شاہی مقرر ہوئے۔ ثابت الدولہ۔ صلاح الدولہ ملازمت سے موقوف ہو گئے لیکن شاہی وظیفہ جاری رہا۔ شاہان اودھ کے عہد میں بلکہ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ بادشاہوں میں یہ بات تھی کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا اور اس کی نذر بادشاہ نے قبول فرمائی سمجھلینا چاہیئے کہ اس کو ملازمت سرکاری ضرور ملیگی۔ یا کسی کو بادشاہ نے خطاب مرحمت فرمایا تو خطاب کے ساتھ ہی ساتھ معقول تنخواہ ضرور ضرور مقرر کی جائے گی۔ جس میں عزت و آبرو کے ساتھ بسر کر سکے۔ اور یہ تنخواہ پشت در پشت چلی آتی تھی۔ تمام اودھ کی سلطنت میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جس کو شاہی خطاب اور وظیفہ مقرر نہ ہوا ہو۔ آخری شاہ اودھ کے دربار میں تو تمام ہندوستان کے چیدہ لوگ مصاحبوں

میں ملازم ہوئے۔ ایک سے ایک بڑھکر شاعر، مولوی، دانا حکیم۔ اسی زمانہ میں جناب عالی کا مزاج ناساز ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد الحمدللہ صحت حاصل ہوئی۔ ہزاروں صدقے اترے۔ تیل ماش بڑے تزک و احتشام سے آئے۔ مرادیں پوری ہوئیں۔ غسل صحت کی تیاری ہونے لگی۔ حکم ہوا جلد سامان کیا جائے۔ سلطان عالم حضرت عباس کی درگاہ تشریف لیجائیں گے۔ جلوخانہ میں سب موجود ہیں۔ مجرئی بھی سب حاضر ہیں۔ چوکیاں آئینہ بندی ہونے لگی۔

پیر معینہ پر بادشاہ حمام میں تشریف لے گئے۔ نہا دھوکر جامہ خانہ میں رونق افروز ہوئے۔ پوشاک کی کشتیاں آئیں۔ لباس فاخرہ زیب جسم فرمایا۔ ہوادار پر سوار ہوکر باہر تشریف لائے۔ عماری دار ہاتھی پر سوار ہوئے۔ جھنڈیاں تواضع کی جھک گئیں۔ سلامی کی توپیں چھوٹیں۔ شہر میں سواری کی دھوم تھی۔ در دولت سے درگاہ تک تعالیٰ اسپیکو نوری پر جلوس سواری بہت قرینے سے نکلی۔ آگے آگے تمام فوج۔ اس کے بعد جلو میں برق دم پلٹنیں سواروں کے پرے دور سے غل ہوگیا۔ نواب ڈنکا آیا دیکھنا وہ ماہی مراتب آپہنچا۔ اتنے میں بیرق اور پھریرہ دکھائی دیا۔ نشان و علم نظر آئے۔ آگے آگے ہزاروں سقے چھڑکاؤ کرتے ہوئے۔ مشکوں میں گلاب کیوڑہ بھرے ہوئے تمام کی لنگیاں باندھے ہوئے دو تیں سو شتر سوار زرتار شملے باندھے ہوئے پرزر وردیاں طاؤس کی طرح مست سانڈنیاں چھلوا ایک ایک منزل کے دھاوے کی۔ باندار چوبدار۔ روشن چوکی والے شہنائی نواز جلوہ تار غنچہ رو گلفام وہنے بائیں جنود بلاتے ہوئے چہرہ پر سورج مکھی لگائے ہوئے صید و شکار کا سامان قراول غضب کے شکاری شاہین عقاب تیز پرہ خالی پوپچے اور ہوادار مغرق نالکیاں نفیس پالکیاں انگریزی بلیے بجتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اتنے میں جلوس خاص آیا۔ برچھے والے برچھا انداز بھالے والے خاص بردار کندہوں پر خاصیاں رکھے ہوئے سنگین ساز مرصع کار نقیب آواز لگاتے ہوئے با ادب ملاحظہ دولت و اقبال کی ترقی ساتھ میں ہاتھیوں کے غول مخملی کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں۔ ریشمی رسی طلائی مرصع کار مکٹ مستکوں پہ چاند سورج لگے ہوئے دانتوں پر چوڑیاں چڑھی ہوئیں فیلبان بھی نکھرے ہوئے سر پہ چیرے باندھے ہوئے طرے اور گوشوارے لٹکتے ہوئے کندہ ممبی گجباگیں لئے ہوئے جن پہ بادشاہ کے وزیر قرب جلوہ افگن بیچ میں بادشاہ سلامت۔ ادھر ادھر تمام دولت خواہ ارکان دولت ہاتھی میں اشرفیاں روپے لٹاتے ہوئے اس شان وشوکت سے سواری درگاہ میں داخل ہوئی۔ پہلے نگی اُٹھا کر زیارت پڑھی پھر ضریح مبارک آنکھوں سے مس کی۔ دو ہزار روپیہ کی نذر چڑھائی۔ اسی شان وشوکت سے واپس آئے۔ ذراسی درگاہ تک جانے میں لاکھوں روپیہ تقسیم ہوگیا۔ اسی طرح رات دن جلسے رہتے تھے۔

لوگ اس آرزو میں رہتے تھے کہ ایک مرتبہ بادشاہ ہمارا سلام لے لیں پھر دولت کی کچھ پروا نہیں ہے۔ جس کا سلام قبول ہوگیا مالا مال کر دیا۔ خلعت دیا تو زر بھی دیا۔ خطاب دیا تو تنخواہ بھی کر دی۔ اس داد و دہش کا یہ فیض تھا کہ لکھنؤ میں دس برس رہا تھا۔ الماس علی خان خواجہ سرا الخطاب ناظر کے چیلے فتح علی خان وحید بخش کی فقط سیر شب ماہ میں لاکھ روپے کا تار مقیش کترا جاتا تھا۔ عبیر کی طرح اڑادیا جاتا تھا۔ جس کی سیروں چاندی صبح کو مہتر اٹھا لے جاتی تھی۔

افسانہ

نیرنگیٔ عالم

(جناب ایم۔ایم اسلم صاحب مدظلہ۔لاہور)

کوہستان بھری پربت کی وادیوں میں رہنے والے اپنے ڈھور ڈنگر لیکر میدانوں میں اتر آئے تھے۔کوہسار کی چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر برف کی سفید چادر پڑی ہوئی نظر آتی تھی۔چھوٹے چھوٹے آبشار جو موسم بہار میں سیماب کی طرح تڑپ تڑپ کر ویرانوں کو پریم اور محبت کا پیغام دیتے تھے خاموش تھے۔ندی نالے خشک ہو چکے تھے۔

بڑے بڑے گھنے درخت جو کبھی چڑیوں کے چہچہے سے آباد تھے ان پر اب اداسی اور وحشت مسلط تھی۔موسم بہار کی وہ نازک اور خوبصورت تتلیاں اور وہ پیارے پیارے رنگوں والے چھوٹے چھوٹے پرندے جن کے دم سے ہر وادی وادیٔ ایمن نظر آتی۔پہاڑوں کی کھوؤں اور پتھروں کی دراڑوں میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔

دامن کوہسار میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔زیادہ تر گوالے آباد تھے۔یہاں کرشنا اور رکمن دو بہنیں رہتی تھیں۔دونوں گھربار والی تھیں۔ان کا باپ منی رام بہت ضعیف ہو چکا تھا۔دونوں بیٹیوں کو دے دلا کر اس کے پاس دو چار ڈھور ڈنگر اور تھوڑی سی اراضی بچ رہی تھی۔منی رام بٹائی پر کاشت کرواتا اور اسی پر اس کی گذران تھی۔

بیاہ ہو جانے کے بعد اس کی بیٹیوں نے کچھ ایسے طور بدلے کہ منی رام ان کی صورت دیکھنے سے بھی بیزار ہو گیا۔اسے اب یہ فکر دامنگیر تھی کہ یہ بچی کھچی جو تھوڑی سی زمین اس کے پاس ہے کس کے حوالے کرے۔تا کہ مرنے کے بعد اس کی مٹی ٹھکانے لگ جائے۔

اسی اثنا میں کرشنا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔منی رام نے جو کچھ اس کے پاس تھا نواسے کے نام کر دیا۔اور کرشنا کے پاس ہی دونوں وقت کی روٹی کھانے لگا۔کچھ روز تو کرشنا باپ کی خدمت کرتی رہی۔لیکن پھر کچھ ایسی سرد مہری اختیار کی کہ بوڑھا منی رام اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں آ رہا۔اس تنہائی میں اگر کوئی اس کا مونس تھا۔وہ اس کا کتا تھا۔جو سارا دن جھونپڑی کے اندر منہ پلیٹے لگائے پڑا رہتا اور اپنے بوڑھے مالک کے روکھے سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھر لیتا۔

یوں تو رکمن اور کرشنا میں پہلے ہی کچھ زیادہ رسم وراہ نہ تھی۔لیکن جب سے منی رام نے کرشنا کے بیٹے کو اپنا وارث بنایا تو دونوں میں کشیدگی اور بھی بڑھی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر دن گالی گلوچ ہونے لگی۔ادھر منی رام غریب ایک ضعیف دوسرے روٹی کا کچھ ایسا ویسا انتظام کبھی ہوا کبھی نہ ہوا پھر بیٹیوں کی بے اتفاقی اور داماد وں کی کور چشمی ان تفکرات کے باعث غریب بیمار پڑ گیا۔جب تک بدن میں کچھ سکت تھی جھونپڑی میں ہی پڑا رہا۔لیکن جب بہت لاچار ہوا تو گرتا پڑتا کرشنا کے ہاں پہنچا۔وہ

جھونپڑی کے باہر بیٹی برتن صاف کر رہی تھی۔ باپ کو دیکھ کر بولی۔

"کیوں؟ یہاں کیسے آئے؟"

"کرشنا!" منی رام بولا۔ "بیٹی میں بیمار ہوں .... اور ...."

کرشنا بات کاٹ کر بولی۔

"بیمار ہو تو کیا میرا گھر ہسپتال سمجھا تھا۔ جو یہاں چلے آئے؟"

"کہاں جاؤں کرشنا؟"

"رکمی کے پاس جاؤ نا۔ جس کا بڑے چاؤ سے بیاہ رچایا تھا"

"کرشنا!" منی رام نے عاجزی سے کہا۔ "میں تمہیں دکھ نہ دونگا۔ دیا کرو بیٹی"

یہ کہکر جو وہ بیٹھنے لگا تو کرشنا گرج کر بولی

"چلو اٹھو یہاں سے۔ لو اور سنو میرا گھر ہی دلدّر کے لئے رہ گیا"

یہ کہکر وہ خود اٹھی اور جھونپڑی میں کواڑ لگا کر پڑوس کے ہاں جا بیٹھی۔

بیٹی کی سرد مہری دیکھکر منی رام کا جی بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ "ہے رام" کہکر اٹھا اور رکمی کے گھر کی طرف چلا۔ کتا بھی دم ہلاتا ہوا پیچھے ہو لیا۔ رکمی بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ دھواں باہر نکلنے کے لئے اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول رکھا تھا۔ منی رام نے باہر سے آواز دی۔

"اے رکمی"

رکمی باپ کی آواز پہچان کر بولی۔

"اندر آجاؤ"

منی رام اندر جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کتا بھی پاس ہی آبیٹھا۔

"کیسے آئے؟" رکمی نے روٹی بیلتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی! میں بہت لاچار ہوں۔ کوئی پانی دینے والا بھی نہیں۔ تم کہو تو یہیں کہیں کونے میں پڑا رہا کروں"

رکمی بولی۔

"بیٹی کے چولھے پر گر دگے تو لوگ کیا کہیں گے"

"تو پھر کس کا آسرا ڈھونڈھوں کس کے پاس جاؤں" منی رام نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"کرشنا کے پاس کیوں نہ چلے گئے؟" رکمی نے طنزاً کہا۔ "اس کے بیٹے کو جو کنگن بنوا دئے تھے"

"ہے رام"۔ منی رام کے منہ سے نکلا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رکمی نے ایک روٹی پر تھوڑا سا پیاز ڈال کر باپ کے سامنے رکھکر کہا۔

"روٹی کھانی ہو تو کھالو"

"مجھے بھوک نہیں" منی رام بولا۔ "یہ روٹی اُٹھالو ۔۔۔۔۔۔۔ ہے رام"

رکمی نے جو باپ کے آگے سے روٹی اُٹھائی۔ تو کتے نے ذرا سر اُٹھاکر دیکھا۔ اور پھر اسی طرح سکڑ کر بیٹھ گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ منی رام غریب اسی طرح سر جھکائے بیٹھا کھانس رہا تھا۔ رکمی کا خاوند چولھے کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ میاں بیوی کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ رکمی بولی اب جاؤنا رات ہونے کو ہے۔

"کہاں جاؤں بیٹی!" منی رام بولا۔ "ہے رام!"

"دیکھا ہی؟" رکمی نے کہا۔ "تمھیں بھی اور تمہارے رام کو بھی" رام کے پاس ہی جاؤ"

"رام بلالیں تو بپتا نہ کٹ جائے"

"چلو اب اُٹھو گے بھی"

"ہے رام"

"بڑی بپتا پڑی!" کہکر رکمی برتن صاف کرنے لگی۔

منی رام کا پنڈا بخار سے پھنک رہا تھا۔ زبان حلق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ اور پھر بار بار کھانسی اُٹھنے سے سینہ دھونکنی کی طرح دھونک رہا تھا۔ رکمی بولی۔

"تم تو تھوک تھوک کر فرش پر لیپ کر دوگے۔"

"رکمی"! لیکن کھانسی اُٹھنے سے منی رام اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"جاؤ"! بیٹی بولی۔ "ڈھوروں کے پاس جاکر پڑ رہو"

لیکن منی رام میں تو اب بولنے کی سکت بھی نہ تھی۔ وہ پیٹ سے گھٹنے لگا کر زمین پر پڑا کھانس رہا تھا۔

"اب کیا کریں" رکمی نے خاوند کی طرف دیکھکر پوچھا۔

"یہاں مرا تو بپتا ہی پڑے گی"

"یہیں پڑا رہے؟" رکمی بولی۔

"نہیں" خاوند نے جواب دیا۔ "ڈھوروں کے پاس اُٹھا لے چلو۔ سردی سے بھی بچ جائیگا"

دونوں نے ملکر بوڑھے منی رام کو اٹھایا اور مویشیوں والی جھونپڑی میں بھوسے کے اوپر لٹا دیا۔ کتا بھی اپنے بیکس آقا کے پاس ہی پڑ رہا۔

ایک بخار دوسرے پیاس اور اس پر مویشیوں کا ساتھ۔ منی رام کے لئے رات قیامت ہوگئی۔ پچھلا پہر تھا۔ پیاس سے بیتاب ہوکر جھونپڑے سے نکلا۔ اور گرتا پڑتا بیٹی کے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اور آوازے دینے لگا۔

"رکمی تھوڑا پانی پلا دو۔ .... اے رکمی! ہے رام!"

غریب کے منہ سے بار بار یہی الفاظ نکلتے تھے۔ برف روئی کے پھیدگالوں کی طرح پڑنے لگی۔ صبح جب لوگ جھونپڑیوں سے نکلے۔ تو انھوں نے منی رام کو بیٹی کے دروازے پر مرا ہوا پایا۔ غریب برف کے نیچے دبا پڑا تھا۔ اور اس کے پاس ہی پیٹ سے منہ لگائے اس کا کتا بھی مرا ہوا تھا۔

محبّت

(جناب ڈاکٹر خان شاطر غزنوی سرحدی)

محبت میں فنا ہونا مجھے جینے سے آساں ہے
محبت ہی میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے
وہ افسانہ ہوں "تکمیل محبت" جس کا عنواں ہے
محبت کا میں بندہ ہوں، محبت میرا ایماں ہے۔

محبت کی نگاہوں سے ہے وابستہ خوشی میری
فدا ہے رسم و آئینِ محبت پر خودی میری
محبت سے عبارت ہے سراسر زندگی میری
میں بندہ ہوں محبت کا، محبت میرا ایماں ہے۔

محبت ہے کلیسا میں، تو وہ مقصود ہے میرا
محبت دیر میں ہے گر، تو وہ مسجود ہے میرا
محبت ہے غرض جس جا وہی معبود ہے میرا
میں بندہ ہوں محبت کا محبت میرا ایماں ہے۔



سراج الدین ظفر • بی • اے



مقبول انور داؤدی



جاسوسی افسانہ

غیر مطبوعہ

سُراغرساں کی موت

(مرزا مصطفٰے اعلی ہمدانی منشی فاضل سیکرٹری بزمِ غالب - لاہور)

دسمبر کے مہینہ کی ایک رات کو جبکہ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور بادل کی مہیب گرج سے دل دہلے جاتے تھے۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بمبئی ایسے بارونق شہر میں سناٹا ہو رہا تھا۔ تجارتی مراکز میں دکانیں وغیرہ بند ہو چکی تھیں۔ کہیں کسی جگہ کوئی ہوٹل کھلا نظر آتا تھا۔ ورنہ اکثر ہوٹل بھی بند ہو چکے تھے۔ ہوٹلوں کے ملازم سردی کی وجہ سے سمٹے سمٹائے کسی کونے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بڑے بڑے بازاروں میں ہو کا عالم تھا۔ اِکّے دُکّے راہرو جو سینما دیکھ کر لوٹ رہے تھے تیز تیز قدم اٹھائے جا رہے تھے۔ کہیں کوئی وکٹوریہ گاڑی جس کا کوچوان اور گھوڑا دن بھر کے کام سے تھک کر چور سڑک پر سے گزر جاتی۔ یا کبھی کبھار پختہ سڑک پر رات کو گشت کرنے والے سپاہی کے بھاری اور بھدے بوٹوں کی چاپ سکوتِ شب کو توڑتی تھی۔ بمبئی کے مضافات "ماٹنگا" کی ایک سنسان اور خاموش سڑک پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص تیز تیز قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ بجلی چمکتی تو سڑک پر سیاہ لباس میں ایک متحرک چیز نظر آ جاتی۔ بظاہر وہ مینہ سے بچنے کے لئے تعجیل سے کام لے رہا تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بیسیوں غریب اور بے خانماں لوگ کڑکڑاتے جاڑے میں اپنے معمولی چیتھڑوں کے اندر لپٹے سو رہے تھے۔ اور بعض جن کے پاس سردی سے بچنے کے لئے کافی کپڑے بھی نہ تھے آگ جلا کر تاپ رہے تھے۔ بمبئی میں ایسے ہزاروں لوگ عموماً سڑکوں پر پڑے رہتے ہیں۔ اور کوئی پاس سے گزرنے والا ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بڈھا راہرو ایک مقام پر سڑک سے علیحدہ ہو کر دائیں ہاتھ کی گلی میں گھس گیا۔ مینہ کی ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جو کسی راہرو کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ کتے کی بھوں بھوں ختم ہوئی تو کسی کے کراہنے کی آواز نے راہرو کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ٹھہر گیا اور دائیں بائیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ مگر آس پاس کوئی متنفس نظر نہ آیا۔ بڈھا پھر سے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ بمشکل پچاس گز کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ کہ معاً پھر کراہنے کی آواز آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھر رُک گیا۔ اب کے آواز بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ اس نے اپنی برقی مشعل (ٹارچ) روشن کی۔ پاس ہی تین چار گز کے فاصلہ پر گلی کے فرش پر دیوار کے ساتھ ایک شخص کمبل میں پڑا کراہ رہا تھا۔ بڈھا اس کے پاس پہنچا۔ اور مشعل کی روشنی اس کے چہرہ پر ڈال کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر وہ بدستور ہائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے کئے جا رہا تھا۔ بڈھا زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے فقیر کے بدن کو چھوا۔ اس کا بدن لوہے کی طرح تپ رہا تھا۔ ہاتھ لگنے سے فقیر نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیوں بابا جی تمہیں کیا تکلیف ہے؟" اس نے فقیر سے پوچھا۔

فقیر نے ایک بار کھانسا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہولے سے جواب دیا "کچھ نہیں بابا۔ مرتا ہوں"۔

اس نے فقیر کا ہاتھ تھام لیا اور نبض دیکھنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "تم کو تو نمونیہ ہو رہا ہے۔ کیا سینے میں درد بھی ہوتا

سہجتا" اس نے کہا

"جی ہاں"۔ فقیر نے جواب دیا۔

اس اثنا میں گشت کرنے والا کانسٹیبل بھی آگیا۔ اس نے جھک کر ان دونوں کو دیکھا اور بولا "ڈاکٹر جی آپ یہاں کاہے کو مینہ میں بھیگ رہے ہیں؟"

ڈاکٹر نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "اس غریب کو دیکھ رہا ہوں۔ بیچارہ بیمار ہے"

"کون غریب؟ اجی یہ تو لنگڑا بدمعاش ہے۔ رہنے بھی دیجئے۔ یہ لوگ اسی طرح بہانہ بنا کر لوگوں کو جل دیتے ہیں" کانسٹیبل نے کہا۔

"نہیں نہیں کانسٹیبل اسے نمونیہ ہو رہا ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو اسے اٹھا کر مکان پر لیجائیں۔ ورنہ یہاں بارش میں تو غریب یقیناً مر جائیگا" ڈاکٹر نے کہا۔

"بڈھا بدستور کراہ رہا تھا کانسٹیبل کی بات سنکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔.......... پھر وہ زور زور کھانسنے لگا۔ مینہ کی بڑی بڑی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اور کانسٹیبل اس لنگڑے فقیر کو اٹھا کر مکان میں لے آئے۔ فقیر کو ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ اور ڈاکٹر اس کے لئے دوا بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پانچ منٹ میں دوا تیار کر کے لنگڑے کو پلا دی۔

لنگڑے فقیر نے دوا کا پیالہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "رحمدل ڈاکٹر.......... آپ کس قدر نیک نفس اور فرشتہ سیرت آدمی ہیں۔ کانسٹیبل کیا چلا گیا؟"

ڈاکٹر حیران تھا کہ فقیر ایسی شستہ زبان کیونکر بولتا ہے۔ اس نے فقیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ ہاں کانسٹیبل چلا گیا۔ تم دعا پیو۔ ابھی تمہیں نیند آجائیگی۔ اور صبح ہونے تک تم اچھے ہو جاؤ گے"

فقیر ڈاکٹر کی باتیں سنکر مسکرا دیا۔ "ہاں ہاں میں اچھا ہو جاؤنگا۔ ایسا کہ پھر کبھی بیمار نہ ہونگا......... ڈاکٹر ڈاکٹر" لنگڑے نے بلند آواز سے کہا اور آنکھیں بند کر کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ دس پندرہ منٹ تک فقیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ یکایک وہ بڑبڑانے لگا۔ "میرے مالک......... میرے مالک......... مجھے بخشدے.......... میں گنہگار ہوں.......... سیاہ کار پاپی.......... نہیں نہیں قاتل.......... قاتل.......... بیشک میری یہی سزا ہے.......... بلکہ اس سے بھی بدتر.......... میں.......... میں.........."

ڈاکٹر چپکے بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یکایک فقیر نے آنکھیں کھولدیں۔ اور مارے خوف کے چلانے لگا۔ پھر وہ اٹھکر ڈاکٹر سے چمٹ گیا۔ "خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ ڈاکٹر رحمدل ڈاکٹر۔ بچاؤ۔ بچاؤ" وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے آپکو اس کی گرفت سے بمشکل نکالا۔ اور اسے پھر سے چارپائی پر لٹا دیا۔ لنگڑا فقیر آنکھیں

پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بابا کیا بات ہے بتاؤ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہ دیکھئے ڈاکٹر سامنے کون کھڑا ہے" فقیر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

ڈاکٹر نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر کمرے میں کوئی متنفس نظر نہ آیا۔

"بڑے میاں یہاں تو کوئی شخص نہیں" ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں نہیں ڈاکٹر آپ کو نظر نہیں آتا۔ میں اسے خوب پہچانتا ہوں۔ وہی ہے .... وہی" فقیر نے پھر اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

ڈاکٹر فقیر کی باتیں سنتے سنتے اکتا گیا تھا۔ وہ اُٹھا کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مگر وہاں کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید شدت تپ کی وجہ سے فقیر پر ہذیانی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر فقیر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور بولا "کون وہی؟ یہاں تو کوئی آدمی نہیں۔ میرے اور تمہارے سوا۔ دیکھو تم ڈرو نہیں میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔ تمہیں کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکتا"

"دیکھو دیکھو وہ میری طرف خشم آلود نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ دیکھو اس کے ساتھ بڈھا کاؤس بھی کھڑا ہے۔ ڈاکٹر خدا کے لئے مجھے اس کی آنکھوں سے بچاؤ۔ وہی ہے .... دلاور .... دلاور" فقیر نے پھر ایک بار اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا "دلاور۔ کون دلاور؟"

فقیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اور زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ مینہ موسلا دھار برسنے لگا تھا اور مینہ کی بوچھاڑ کھڑکی کے راستے کمرے میں آرہی تھی۔ ڈاکٹر نے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد فقیر نے پھر آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے دوا کی دوسری خوراک اسے پلائی۔ دوا پینے کے بعد فقیر کے ہوش و حواس درست ہونے لگے۔

"ابھی ابھی تم کسی شخص کا نام لے رہے تھے۔ شاید دلاور۔ وہ کون ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"دلاور .... ہاں ہاں" فقیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" فقیر نے کہا۔

"نہیں تو" ڈاکٹر نے جواب دیا "ابھی ابھی تم سوتے میں کہہ رہے تھے۔ مجھے دلاور سے بچاؤ"

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا تھا" فقیر نے کہا اور رُک گیا .... پھر وہ بولا "ڈاکٹر یہ بڑا دردناک قصہ ہے جس کا میری زندگی اور موجودہ حالت کے ساتھ گہرا تعلق ہے"

"اچھا تو کیا تم مجھے یہ داستان نہیں سنا سکتے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"آہ ڈاکٹر یہ ایک راز ہے۔ راز۔ جسے دنیا میں میرے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اور نہ ہی میں نے آج تک کسی سے اس کا ذکر کیا۔"

اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں آپ کو یہ داستانِ غم سنائے دیتا ہوں .... مگر آہ! میری داستانِ غم بڑی پُر درد ہے آپ کو سنکر صدمہ ہوگا۔ بہتر ہے آپ مجھ سے اس کے سننے کی خواہش نہ فرمائیں! فقیر نے روتے ہوئے کہا۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ تم بے کھٹکے سناؤ" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں اب مجھے چھاتی میں درد بھی نہیں ہوتا۔ اور شائد بخار بھی کم ہو رہا ہے۔ میں آپ کو یہ قصہ ضرور سناؤنگا" فقیر نے کہا۔ اور اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سر جھکائے شائد کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"سنئے ڈاکٹر صاحب! میرا نام جمشید ہے۔ اور میں کسی زمانہ میں بمبئی کا مشہور معروف سراغرساں تھا"

"جمشید ڈیٹیکٹو؟" ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ "نہیں تم جمشید نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک معزز آدمی ہے"

"ہاں ڈاکٹر صاحب میں ہی وہ معزز جمشید ہوں۔ وہ جس نے رتن بائی کے قاتلوں کا سراغ لگایا۔ سیٹھ ہرمزجی کی نوجوان لڑکی کو اغوا کرنے والے گروہ کو گرفتار کرایا۔ بمبئی کے مشہور ڈاکو ہیرا کو پہچانا۔ اور مسٹر جمیز سپرنٹنڈنٹ پولیس کے حملہ آوروں کو ڈھونڈ نکالا۔ میں ہی وہ بدنصیب جمشید ہوں۔ جب آپ میری رام کہانی سنیں گے تو آپ کو یقین آجائیگا" جمشید نے کہا۔

پھر وہ کھانسنے لگا .... اور پھر ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ "اچھا تو سنئے ڈاکٹر صاحب آج سے دو سال قبل کی بات ہے شائد یہی دسمبر کا مہینہ تھا .... بہرحال جاڑے کا موسم تھا۔ کہ ایک روز علی الصباح میرے ہاں پولیس انسپکٹر مسٹر نولٹن اور سب انسپکٹر مہتاب آئے۔ پولیس بسا اوقات قتل اور ڈاکے کی غیر معمولی وارداتوں میں مجھ سے مدد لیا کرتی تھی۔ اور اس طرح مجھے بیش قرار معاوضہ بھی ملجاتا تھا۔ انسپکٹر نولٹن نے مجھے سیٹھ بالکشن کے جواہرات کی چوری کا حال سنایا جو اسی رات کا واقعہ تھا مجھے اس سے پیشتر اس کا علم ہو چکا تھا۔ شائد آپ نے بھی اس کے متعلق کچھ سنا ہوگا؟"

"ہاں میں نے اخبارات میں پڑھا تھا" ڈاکٹر نے جواب دیا؟

"اچھا تو پولیس کو چوری کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملسکا تھا" جمشید نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اس لئے مجھ سے مدد چاہتے تھے۔ چنانچہ میں انسپکٹر کے ساتھ موقعِ واردات پر پہنچا۔ تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا جس کمرے سے جواہرات چرائے گئے تھے وہاں ابھی تک پولیس کا پہرہ تھا۔ میں نے سیٹھ سے بھی مبادلۂ خیالات کیا۔ مگر اس نے کسی شخص پر شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ جائے وقوع سے کوئی ایسی چیز بھی دستیاب نہ ہو سکی جس کے ذریعہ مجرموں کا پتہ لگایا جاتا۔ بہرحال میں نے اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ کاش میں اس دن حامی نہ بھرتا۔ اور اس طرح مجھے یہ روز بد دیکھنا پڑتا۔ قصہ کوتاہ کئی دنوں تک میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ مگر کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ جواہرات دو ڈھائی لاکھ روپیہ کی مالیت کے تھے۔ اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ چور انھیں بمبئی کے سوا کہیں اور فروخت نہیں کر سکتے۔ یا دوسری جگہ ہندوستان میں کلکتہ ہے۔ کیونکہ دوسرے شہروں میں ایسے جوہری نہیں ہیں۔ جو دو ڈھائی لاکھ کی مالیت کے جواہرات خرید سکیں۔ چنانچہ اس باب میں پہلا اقدام میں نے یہ کیا کہ بمبئی کے تمام بڑے بڑے جوہریوں سے ملا۔ انھیں جواہرات کی تفصیل بتائی اور مکمل طور پر ہینڈی کر

ایک روز صبح کے وقت عبدالرحمٰن اسٹریٹ کے مشہور جوہری پالا مل کا پیغام پہنچا۔ میں اس سے ملا۔ پالا مل نے مجھے بتایا کہ کل شام کے وقت ایک نوجوان میرے پاس آیا تھا۔ اور ایک الماس کا دانہ بیچنے کی خواہش ظاہر کرتا تھا۔ اس نے مجھے دانہ بھی دکھلا دیا جو بالکل آپ کے بیان کے مطابق تھا۔ وزن میں بھی اتنا ہی۔ چنانچہ اس کی قیمت پندرہ ہزار روپیہ لگائی گئی۔ نوجوان نے پندرہ ہزار سنکر کسی قدر ناک بھوں چڑھائی اور بولا کہ اچھا میں دو ایک اور جوہریوں کو بھی دکھاؤنگا۔ اگر انھوں نے اتنی ہی قیمت لگائی تو آپ کو ہی دے ڈالوں گا۔ چنانچہ وہ آج شام آٹھ بجے آنے کا وعدہ کر گیا ہے۔

چنانچہ اسی دن شام کے چار بجے میں جوہری کے ہاں پہنچ گیا۔ اور جوہری کے کلرک کی حیثیت سے میز کے پاس بیٹھ گیا۔ جوہری کے کلرک کو اس دن کے لئے رخصت دیدی گئی۔ سات بجے کے قریب دکان کے سامنے ایک بھورے رنگ کا موٹر آکر ٹھہرا۔ اور ایک نوجوان انگریزی لباس میں ملبوس دکان میں داخل ہوا۔ جوہری نے اسے دیکھکر مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں اس کا مطلب پا گیا کہ وہی شخص ہے۔ نووارد نے جوہری سے کہا: "مجھے ایک جوہری نے اس دانہ کے لئے بیس ہزار پیش کئے ہیں۔ مگر میں بیس ہزار پر بھی دینے کے لئے تیار نہیں۔ اگر آپ پچیس ہزار دیں تو ...." وہ رک گیا۔ پھر تھوڑے وقفہ کے بعد بولا "میں نے خود اسے تیس ہزار میں خریدا تھا"۔

"یہ آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ نے تیس ہزار میں خریدا ہوگا۔ مگر اس وقت تو آپ اسے بیچ رہے ہیں۔ اسلئے پندرہ ہزار بھی بہت ہیں" جوہری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"او ہو۔ پندرہ ہزار ہرگز نہیں" اس نے کہا۔

"اچھا تو بیس ہزار آپ کو کیا منظور ہیں۔ مگر وہ بھی ایک شرط کے ساتھ کہ آپ کارپوریشن کے کسی ممبر کو تصدیق کے لیے ساتھ لائیں۔ کیونکہ ہم آپ کو جانتے بھی نہیں۔ یہ معاملہ کسی قدر خطرناک ہی ہوا کرتا ہے۔" جوہری نے کہا۔

نوجوان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ "دیکھیے سیٹھ صاحب آپ میری ہتک کر رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"مگر حضور اس میں ہتک کی کونسی بات ہے۔ میرا تو یہ اصول ہے" جوہری نے کہا۔

"مگر یہاں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ بیس ہزار بھی مجھے منظور نہیں۔ البتہ اگر آپ پچیس ہزار دیں تو اس کے متعلق بھی سوچا جا سکتا ہے"۔ اس نے کہا۔

"نہیں صاحب میں تو بیس ہزار سے ایک کوڑی بھی زیادہ دینے کے لئے تیار نہیں" جوہری نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد نوجوان دکان سے نکلکر موٹر میں سوار ہو گیا۔ میں بھی بہت جلد موٹر میں اس کے پیچھے چلدیا۔ موٹر کا انتظام میں نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ اگلا موٹر عبدالرحمٰن اسٹریٹ کے راستے کرافورڈ مارکیٹ کے چوک میں پہنچا۔ یہاں آکر موٹر رک گیا۔ اور نوجوان موٹر سے اترکر پاپیادہ روانہ ہو گیا۔ میں بھی موٹر سے اترا۔ اس نے مڑکر میری طرف غور سے دیکھا۔ اور پھر جلد جلد قدم اٹھاتے دھوبی تالاب کیطرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے کامل طور پر احتیاط سے کام لیا تھا۔ مگر خدا جانے اسے کیونکر مجھ پر شک گزرا۔ بہر حال مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ مجھے شکوک جانتا ہے۔ مگر میں بھی اس کے پیچھے چلدیا۔ شام کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ بازاروں میں روشنی بھی ہو چکی تھی۔ نوجوان بازار میں سے لوگوں

کے ہجوم کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ یکایک "بوری کے ہوٹل" کے سامنے جہاں دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ بھیڑ بھاڑ کا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اس وقت کافی فاصلہ پر تھا۔ اس لئے اسے میری نظروں سے بچکر نکلنے کا موقع مل گیا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جمشید پھر کھانسنے لگا۔۔۔۔۔۔۔ "ڈاکٹر صاحب" جمشید نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہا "یہیں سے میری بدقسمتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر وہ بوری کے ہوٹل کے سامنے غائب نہ ہو جاتا تو میں آج ہرگز ہرگز اس حالت میں نہ ہوتا۔ مگر میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ یہ حالت دیکھکر میں بہت سٹ پٹایا۔ ادھر ادھر بھاگتا پھرا مگر سوائے ناکامی کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر اس خیال سے کہ چلکر ہوٹل میں دیکھوں شاید اسی جگہ ملجائے۔ میں ہوٹل کی طرف گیا اسی میں سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا کہ سامنے وہی شخص نظر آیا۔ وہ ہوٹل سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ بالکل چپ چاپ باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے غور سے دیکھا وہی تھا مگر جب میری نظر اس کے سوٹ پر پڑی تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ کیونکہ مقدم الذکر ہلکے بھورے رنگ کا سوٹ پہنے تھا اور یہ نوجوان خاکستری رنگ کا۔ مگر میں نے بہت جلد یہ خیال دل سے نکال دیا۔ میں نے سوچا کہ شاید مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ اس کی صورت اور قد و قامت بالکل ویسی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ میں تذبذب میں پڑا رہوں۔ مزید براں وہ اسی جگہ سے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ممکن ہے ہوٹل میں داخل ہو گیا ہو۔ اور مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا ہو۔ ان دلائل کی موجودگی میں مجھے شک و شبہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ میں اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ کرافورڈ مارکیٹ کے چوک میں وہ ٹرام میں سوار ہوا۔ میں بھی اس سے کسی قدر فاصلہ پر ٹرام میں آ بیٹھا۔ اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر اس نے میری طرف ایک بار بھی نہ دیکھا۔ شاید اسے میری موجودگی کا علم نہ تھا۔ ٹرام روانہ ہوا تو اس نے سگرٹ سلگایا۔ پھر جیب سے ایک اخبار نکالکر پڑھنے لگا۔ وہ اخبار پڑھنے میں ایسا منہمک تھا کہ جب بھنڈی بازار آیا تو اسے مطلقاً خبر نہ ہوئی۔ کنڈکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سیٹھ بھنڈی بازار آگیا"۔ وہ جلدی سے اٹھا اور ٹرام سے نیچے اترا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ مغل مسجد کی طرف چلدیا۔ اور دائیں ہاتھ کی ایک گلی میں ۵ نمبر کے مکان میں داخل ہوا۔ مکان کے باہر ایک چھوٹے سے بورڈ پر "ڈاکٹر اے علی فزیشن اینڈ سرجن" لکھا ہوا تھا"۔

ڈاکٹر جمشید کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر علی کا نام سنکر وہ چونکا ہو گیا۔ جمشید نے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "شاید آپ ڈاکٹر علی کو جانتے ہوں"۔

"نہیں تو" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "بمبئی ایسے شہر میں جہاں ایک ہی مکان میں رہنے والوں کو انسان کم جانتا ہے۔ بھلا دور دراز مقامات پر رہنے والوں کو کوئی کیونکر جان سکتا ہے"۔

"میرا خیال تھا کہ شاید ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے آپ سے ان سے شناسائی ہو" جمشید نے کہا اور پھر کھانسنے لگا۔۔۔۔۔

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے جمشید نے کہا "نوجوان کے مکان میں داخل ہو جانے کے بعد میں اپنے گھر چلا آیا۔ اس دن کے واقعات ڈائری میں قلمبند کرنے کے بعد میں سو گیا۔ دوسرے دن تڑکے ہی میں ڈاکٹر علی کے مکان پر پہنچا۔ آس پاس کے رہنے والوں سے نوجوان کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچائیں۔ اس نوجوان کا نام دلاور تھا۔ اور وہ ڈاکٹر علی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پچیس چھبیس برس کا سن ہوگا۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ چند عیاش لوگوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ سٹے کا بڑا دلدادہ تھا۔ اور شراب نوشی کی

لت بھی پڑگئی تھی۔ باپ اس کا ایک شریف آدمی تھا۔ اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا تاہم ہر چھوٹا بڑا اس کا ثنا خواں نظر آتا تھا اور یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ والدین عموماً اپنی اولاد کی بے راہروی دیکھتے ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے۔ یہاں ڈاکٹر علی دلاور کی ہر بات کو اس سبب سے برداشت کر رہا تھا۔ کہ دلاور اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس دن مجھے صبح سے شام تک ڈاکٹر علی کے مکان کے اردگرد چکر کاٹنا پڑے۔ مگر دلاور اس دوران میں ایک بار بھی باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت دو نوجوان اس جگہ آئے اور کسی روک ٹوک کے بغیر مکان میں داخل ہوگئے۔ میں ان دونوں کو جانتا تھا۔ بمبئی کے مشہور سٹہ باز پیارے لال اور حامد آٹھ بجے کے قریب دلاور۔ حامد اور پیارے لال تینوں مکان سے برآمد ہوئے۔ میں بھی کچھ فاصلہ پر ان کے پیچھے ہولیا۔ بھنڈی بازار میں پہنچکر وہ تینوں ایک ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔ میں نے بھی ایک ٹیکسی لی اور ان کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ دھوبی تالاب میں لوری کے ہوٹل کے سامنے ان کا موٹر جاکر تھم گیا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں سے شب گذشتہ میں نے دلاور کو نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے بھی اپنے ٹیکسی ڈرائیور کو موٹر روک لینے کی ہدایت کی۔ چنانچہ موٹر ہوٹل سے پچاس گز کے فاصلہ پر ٹھہر گیا۔ دلاور اور اس کے ساتھی موٹر سے اتر کر ہوٹل میں جا چکے تھے۔ میں بھی موٹر سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل کے بڑے کمرے میں جہاں لوگ کھانا کھانے یا چائے پینے کے لئے بیٹھتے ہیں وہ تینوں موجود نہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پچھلے کمرے میں ہونگے۔ جہاں عموماً اوباش لوگ شراب پینے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی اس کمرے میں پہنچ گیا۔ میرا خیال درست نکلا۔ دلاور اور اس کے ساتھی ایک بڑی میز کے سامنے جو ہوٹل کے بیچوں بیچ رکھی ہوئی تھی۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ دلاور ہوٹل کے ملازم سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی قریب ہی ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا تو دلاور نے میری طرف دیکھا۔ میں ان کے پاس سے گزر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد ان میں سے کسی نے بھی میری طرف توجہ مبذول نہیں کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل کا ملازم ان کے لئے تین شراب کی بوتلیں لایا۔ میں نے بھی اپنے لئے شراب منگوائی۔ اگرچہ میں بھی شراب کا عادی تھا۔ لیکن کام کے اوقات میں اسے منہ نہیں لگایا کرتا تھا۔ یہاں یہ مجبوری آپڑی تھی کہ اگر میں شراب نہ پیتا تو اس کمرے میں کیونکر بیٹھتا۔ میرا خیال تھا کہ شائد نشہ کی حالت میں ان کے منہ سے کوئی کام کی بات نکلے۔ مگر میرا اندازہ غلط تھا۔ دلاور نے خود تینوں گلاسوں میں شراب انڈیلی۔ حامد اور پیارے کو پیش کی چنانچہ تینوں نے اپنا اپنا گلاس ہوا میں بلند کیا۔ تینوں گلاس بیک وقت ہوا میں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اور دور شراب شروع ہوگیا۔ میرے سامنے کوئی ساتھی نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً میں نے بوتل کے ساتھ گلاس کو مس کیا اور پینے لگا۔ دلاور اور اس کے ساتھی پے در پے جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ ان کے برعکس میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ بیجا نہ ہوگا کہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ شراب نہیں۔ بلکہ پانی پی رہے تھے۔ میں نے اپنی پچاس برس کی عمر میں ایسے پینے والے کبھی نہیں دیکھے تھے جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں میں تینوں بوتلیں خالی کر دیں۔

دلاور نے لڑکھڑاتی زبان میں چلا کر کہا "بو......... تلے......... بو....... آئے"

ہوٹل کا ملازم چشم زدن میں آگیا۔

"دیکھو لیا ئے..... ت.ت...... تین بوتل اور لا..... ہو" دلاور نے کہا۔ اور گنگنانے لگا۔ پھر اس نے

پیارے کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالدیں۔

ہوٹل کا ملازم "بہت بہتر حضور" کہتے ہوئے کسی قدر جھکا اور چلا گیا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہوٹل کے ملازم ایسے لوگوں سے منہمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں گرانقدر انعام کی امید ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل کا ملازم بوتلیں لاکر میز پر رکھ گیا۔ پھر دور چلنے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ انھوں نے کسقدر شراب پی۔ بہرحال پونے بارہ بجے تک یہ شغل جاری رہا۔ اس کے بعد چونکہ ہوٹل بند ہوجاتا ہے۔ اس لئے انھیں چاروناچار اٹھنا پڑا۔ ملازم "بل" لیکر آیا تو دلاور نے جیب سے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالکر میز پر ڈال دیا۔ بل ادا کرنے کے بعد ایک پانچ روپیہ کا نوٹ ملازم کو بطور انعام دیا گیا۔ ملازم نے جھک ایک فرشی سلام کیا۔

دلاور اور اس کے ساتھی ہوٹل سے نکلکر بازار میں کھڑے ہوگئے۔ ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اور مارے نشہ کے وہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔

حامد اور پیارے لال نسبتاً کم مدہوش تھے۔ دلاور پیارے لال کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"پیارے کیا سینما دیکھنے نہیں چلو گے" دلاور نے پیارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی" پیارے نے کہا "مگر حامد سے بھی تو پوچھ لو"

"ارے کمبختو! ہوش کی دوا کرو۔ عقل کے ناخن لو۔ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا۔ بھلا رات کے بارہ بجے تمہارے باوا کا سینما ہوتا ہے" حامد نے کہا۔

"ہاں بھئی حامد تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا سینما کا خط مارو۔ کہیں سے اگر تھوڑا سا اور مال مل جائے تو ......" دلاور نے کہا۔

"مگر میرا تو جی نہیں چاہتا" پیارے نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"اور میری بھی یہی رائے ہے" آدھی رات ہوچکی ہے۔ اب مناسب نہیں کل سہی" حامد نے کہا۔

"مگر بھائی میں تو تھوڑی اور پیونگا" دلاور نے کہا۔

"مگر اس وقت کہاں سر پھوڑنے جاؤ گے۔ ہوٹل بند۔ شراب خانے بند" حامد نے کسی قدر درشت لہجہ میں کہا۔

"ہاں اس بڑھے کاؤس کو بھول گئے ہو" دلاور نے جواب دیا۔

"اچھا اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو اور تمہارا کام۔ ہم تو جاتے ہیں" یہ کہکر حامد نے پیارے کا ہاتھ تھام اور دونوں چلدئے۔ دلاور نے انہیں پکارا۔ "پیارے یہ لو۔ کچھ پیسے تو لیجاؤ۔ پیدل کیونکر گھر جاؤ گے" یہ کہکر دلاور آگے بڑھا اور جیب سے ایک نوٹ نکالکر پیارے کی طرف بڑھایا۔

پیارے نے نوٹ تھامتے ہوئے کہا "دیکھو دلاور اس وقت کہاں مارے مارے پھروگے آؤ گھر چلیں" مگر دلاور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ایک سمت کو چلدیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اور جھومتا جا رہا تھا۔ وہ اسی طرح کچھ دور گیا ہوگا کہ یکایک اس نے ٹھوکر کھائی۔ اور منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ ......

"مطلب پرست دنیا۔ غدار دوست۔ آہ گندم نما جو فروش۔ ریاکار۔ مطلب کے ساتھی۔ غرض پرست۔ پیسے کے یار۔" یہ تھے وہ الفاظ جو اس نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہے۔ اور پھر چلنے لگا۔ چوک میں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈرائیور موٹر میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ولاور تیز تیز قدم اٹھاتے موٹر کا دروازہ کھولکر موٹر میں جا بیٹھا۔ دھچکا لگنے سے ڈرائیور کی آنکھ کھل گئی۔ اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو پچھلی نشست پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔

"سیٹھ کہاں جائیے گا" موٹر ڈرائیور نے پوچھا۔

" بالا گلی" ولاور نے کڑک کر کہا۔ اور موٹر روانہ ہو گیا۔ میں نے ولاور کے الفاظ سن لئے تھے۔ میں ادھر ادھر ٹیکسی کی تلاش میں چکر کاٹنے لگا۔ مگر کوئی ٹیکسی نظر نہ آئی۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد میں مایوس ہو کر پیدل ہی چلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ کہ معاً دور سے موٹر کی روشنی نظر آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ جب موٹر قریب پہنچا تو میں نے اسے پکارا "ٹیکسی ٹیکسی"۔ موٹر میرے پاس آ کر رک گیا۔ میں اچک کر موٹر میں جا بیٹھا۔ اور موٹر ڈرائیور سے بالا گلی چلنے کو کہا۔ پندرہ منٹ کے بعد موٹر بالا گلی کے نکڑ پر جا کر رکا۔ موٹر سے اتر کر میں گلی میں داخل ہوا۔ اس جگہ بڈھے کاؤس کا شرابخانہ ایک اچھی جگہ ہے۔ بڈھا کاؤس معمولی اوقات کے علاوہ بھی بہت رات گئے شراب فروشی کیا کرتا ہے۔ اور اس کام کے لئے اسے آبکاری والوں اور پولیس کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ بارہ بجے کے بعد شرابخانہ کا صدر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف سے ایک چھوٹا سا دروازہ جسے عوام کی زبان میں "چور دروازہ" کہا جاتا ہے کھلا رہتا ہے۔ اسی راستہ لوگ چوری چھپے یہاں آتے جاتے ہیں۔ اور رات کے دو بجے تک شرابیوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ایک بج گیا تھا کہ میں چور دروازہ سے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ایک کرسی پر ولاور بیٹھا تھا۔ اس کا سر دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ بڈھا کاؤس اس کے پاس کھڑا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں بھی چپکے سے جا کر پاس ہی بیٹھ گیا۔ بڈھے نے میری طرف دیکھا اور بولا "اخاہ۔ آپ ہیں جمشید جی"۔ میں نے اشارے سے اسے چپ رہنے کے لئے کہا۔ چنانچہ اس نے میرا مطلب پا کر کہا "۔ اچھا تو وائٹ ہارس کی بوتل لاؤں۔ آپ کیلئے"

"ہاں وائٹ ہارس" میں نے جواب دیا۔

بڈھا پھرتی سے بوتل گلاس اور سوڈا وغیرہ لا کر میز پر رکھ گیا۔ ولاور نے بھی آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بڈھے کاؤس نے آگے بڑھ کر پوچھا "سیٹھ کیا شوق فرمائیے گا"

"ہوں .... جانی واکر .... لیں" ولاور نے کہا۔

بڈھا مسکرایا اور ایک لمحہ کے بعد بوتل وغیرہ لا کر رکھ گیا۔

جمشید یہاں تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ اور بولا "ڈاکٹر صاحب۔ آہ! یہ شراب ام الخبائث اس نے کتنوں کو خراب کیا اور جانے ابھی کتنوں کو برباد کرے گی۔ آہ یہ تلخ سیال لعنت۔ جانے اس میں کیا جادو ہے کہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ڈاکٹر صاحب کاؤس کے شرابخانہ میں اس دن میری شراب خوری کا آخری جام تھا۔ اس کے بعد میں نے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آہ! اس کمبخت رنگین پانی نے جس کے ایک ایک قطرہ میں لاکھوں شیطان پوشیدہ ہیں۔ میرے ہاتھوں کو دو بیگناہوں کے خون

سے رنگین کیا۔ آج بھی جب مجھے وہ دن یاد آتا ہے تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آہ۔ آہ ...."

جمشید رونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا: دلاور نے بوتل کو اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر وہ گنگنانے لگا۔ پھر بلند آواز سے یہ شعر پڑھتا جاتا تھا ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

اور پیئے جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو گئیں۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

اس نے گلاس بھرا اور پھر منہ سے لگا کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ .... اور دیکھتے ہی دیکھتے بوتل خالی ہو گئی۔۔۔

پھر وہ یکایک میری طرف گھورنے لگا: "اوہو آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔ کہیئے مزاج تو اچھے ہیں معاف فرمایئے میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا...... ہاں آپ کچھ شوق فرمائیں گے....... بولئے....... بولئے....... اوہو آپ تو پی رہے ہیں۔ معاف فرمایئے......"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھکر میری طرف لپکا اور میز سے بوتل اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ واہ۔ وا۔ وائٹ ہارس کیا کہنے ہیں..... ...... یعنی سفید گھوڑا........ نہیں نہیں سفید گھوڑے کا موت..... اہاہا آپ شوق سے پئیں" پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔
اس کی بکواس سنکر مجھے بھی طیش آگیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے پیچھے دھکیل کر بیٹھ گیا۔ وہ لڑھکتا ہوا دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ ایک بار پھر وہ میری طرف آیا۔ اور بولا "جناب میں نے آپ کی شان میں گستاخی تو نہیں کی تھی" یہ کہکر اس نے میرے سامنے پڑے ہوئے شراب کے گلاس کو ہاتھ میں لیا اور اسے میرے سر پہ انڈیل دیا۔ گرمی کا موسم ہوتا تو شاید اسے ایک معمولی بات سمجھکر توجہ نہ کی جاتی۔ مگر جاڑے کا یہ عالم تھا کہ بند کمرے میں دانت سے دانت بج رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اٹھکر ایک تھپڑ اس زور سے اسکی گال پر رسید کیا کہ وہ تلملا اٹھا۔ اس نے بھی جوتا میرے منہ پر ایک سکا لگایا۔ بس پھر کیا تھا دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ بڈھا کاؤس کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے آنے تک بوتل۔ گلاس۔ میز۔ کرسی وغیرہ کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ مگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کے بھی چوٹ نہ آئی۔ دلاور نے میری کنپٹی پر اس زور سے ایک گھونسا مارا کہ میں لوٹیں کھاتا صدر دروازہ کے پاس جا گرا۔ اس نے مجھے گرتے دیکھکر ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ زمین پر گرتے وقت میرا سر کسی سخت چیز کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا تو لوہے کی ایک موٹی اور لمبی نالی تھی۔ وہ نالی لیکر میں دلاور کی طرف بڑھا۔ معاً بڈھا کاؤس بھی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ یہ سماں دیکھکر مبہوت رہ گیا۔ دلاور نے بھی موقع کی نزاکت کا احساس کر لیا تھا۔ ہمیں بڈھے کو دیکھتے ہی وہ مدد کے لئے پکارنے لگا۔ کمبخت بڈھا ہم دونوں کے درمیان آگیا۔ میں مارے غصے کے پاگل

ہو رہا تھا۔ اور پوری قوت سے وار کر چکا تھا۔ نتیجہ معلوم۔ لوہے کی نالی بڈھے کے سر میں جا لگی۔ اور وہ تیورا کے زمین پر گر گیا۔ میں نے دلاور پر بھی دوسرا وار کیا مگر خوش قسمتی سے لوہے کی نالی اس کے کندھے پر پڑی۔ وہ اس صدمہ سے گر پڑا۔ دلاور کو چھوڑ کر میں بڈھے کاؤس کی طرف گیا۔ اسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ بحیس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض بالکل ساکت تھی۔ میں نے اسکے دل کی جگہ پر کان لگایا مگر حرکت قلب بھی بند تھی۔ آہ! بڈھا کاؤس ختم ہو چکا تھا۔ یہ حالت دیکھکر میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ میں دلاور کی طرف لپکا۔ وہ ابھی پڑا کراہ رہا تھا۔ ایک خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں نے جلدی سے لوہے کی سلاخ دلاور کے ہاتھ میں رکھدی۔ آہ! وہ کس قدر نازک وقت تھا۔ میں ایک بیگناہ کو قربانی کا بکرا بنا رہا تھا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی مگر اس کے سوا چارہ کار ہی نظر نہ آیا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ معاً میں نے دلاور کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور نوٹوں کا پلندہ نکال لیا۔ مگر پھر کچھ سوچا۔ میں نے نوٹ وہیں زمین پر پھینکدئے۔ اور خود شرابخانہ سے نکلکر گلی میں آ گیا۔ ابھی میں گلی میں پہنچا ہی تھا کہ پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی شخص اس سمت آ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس جگہ روشنی نہیں تھی۔ ورنہ میرا بچکر نکلنا محال ہو جاتا۔ میں جلدی سے پیچھے پلٹ آیا اور چور دروازہ کے داہنی جانب ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا گھپ تھا۔ اس لئے مجھے کوئی شخص دیکھ نہ سکتا تھا۔ ابھی میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا ہی تھا۔ کہ ڈیوڑھی کے بالمقابل گلی میں دو شخص آکر رکے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ "دیکھو تو اس بڈھے بدمعاش کو ڈھائی بج چکے ہیں۔ اور ابھی تک اس کی دوکان کھلی ہے"

"ہاں ہاں۔ آج بچا خوب پھنسا ہے۔ ایک بوتل دیگا تو اس کا پیچھا چھوڑینگے" دوسرے نے کہا۔

پھر ان میں سے ایک نے برقی مشعل روشن کی۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ مگر جلد ہی روشنی بندکر دی گئی۔ پھر دونوں چور دروازے کے پاس آ گئے۔ مجھ میں اور ان میں پانچ قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میرا بدن کانپنے لگا۔ آہ مجھے موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ پھانسی کا پھندا میرے سر پر لٹک رہا تھا۔ کمرے میں کی روشنی اگرچہ مدھم تھی تاہم جب وقت انھوں نے دروازے کو دھکیلا تو میں نے روشنی میں دیکھا تو دونوں پولیس کانسٹیبل تھے۔ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے اور میں دبے پاؤں گلی میں نکل آیا۔

دوسرے دن اخبار میں میں نے بڈھے کاؤس کے قتل کی خبر پڑھی۔ اور ساتھ ہی قاتل کی گرفتاری کا حال بھی۔۔۔۔۔۔ دلاور کو قتل کے الزام میں دھر لیا گیا۔ میرا داؤ چل گیا تھا۔ پولیس کے لئے کافی شہادت موجود تھی۔

اس واقعہ کے دوسرے دن میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام ایک خط لکھا جس میں سیٹھ بالکشن کے جواہرات کی چوری کا سراغ لگانے کے کام سے دست برداری ظاہر کی۔ اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی کہ میں ایک خانگی قضیہ کے سلسلہ میں دہلی جا رہا ہوں۔ چنانچہ اسی روز میں بمبئی سے روانہ ہو کر پونا چلا گیا۔ پونہ میں اخبارات کے ذریعے مجھے مقدمہ کے حالات معلوم ہوتے رہے۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد میں نے اخبار ہی میں یہ خبر پڑھی کہ دلاور کو کاؤس شرابفروش کے قتل کے الزام میں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا ہے۔ جس دن میں بمبئی واپس آیا اس سے دو روز پیشتر دلاور دار پر کھینچا گیا تھا۔ جس دن میں شہر میں پہنچا اسی روز مجھے یہ خبر ملی کہ پولیس نے سیٹھ بالکشن کے جواہرات کی چوری کا سراغ لگا لیا ہے۔ اور ایک شخص کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شام کے وقت تھانہ میں جا کر میں نے اس شخص کو دیکھا۔ وہی نوجوان تھا جو بالا ل

جوہری کے ہاں الماس کا ٹکڑا فروخت کرنے آیا تھا۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں ہی اس کی گرفتاری کا ذمہ دار ہوں۔ میں خود حیران تھا کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ میں تو دلاور کو چور سمجھے ہوئے تھا۔ اور یہاں جواہرات چرانے والا میرے سامنے زندہ سلامت کھڑا تھا۔ دلاور اور اس کی صورت بالکل مشابہ تھی۔ سر مو فرق نہ تھا۔ ویسی ہی صورت۔ ویسی ہی قامت۔ آہ میں نے دھوکا کھایا۔ چوری کے ہوٹل سے نکلتے ہوئے میں نے جس شخص کو دیکھا تھا۔ اس کا جواہرات کی چوری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آہ دلاور بے قصور تھا۔ بے قصور ہمشکل ہونے کی وجہ سے دلاور نے زندگی گنوائی۔ ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے انصاف فرمائیں۔ کہ ان حالات کے ماتحت کیا دنیا کی کوئی عدالت مجھے مجرم ٹھہرا سکتی ہے۔ میں نے دیدہ دانستہ یہ فعل نہیں کیا۔ البتہ میں نے کاؤس کے قتل میں دلاور کو بے گناہ دلاور کو پھنسایا۔ .... واقعی اس باب میں گنہگار ہوں .... اور میری یہ حالت اسی گناہ عظیم کی پاداش میں ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر علی اور جمشید دونوں زار زار رو رہے تھے۔ یکایک وہ پھر بولنے لگا۔ "ڈاکٹر صاحب سنیئے۔ دلاور کو پھانسی ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ قدرت نے مجھ سے انتقام لیا۔ میری بائیں ران پر ایک پھنسی نمودار ہوئی۔ جو بڑھتے بڑھتے ناسور کی صورت اختیار کر گئی۔ میرا تمام اندوختہ خرچ ہو گیا۔ مگر آرام نہ آیا۔ بلکہ میری ٹانگ گل سڑ گئی۔ اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ آخر جب ہسپتال میں میری ٹانگ کاٹ دی گئی .... مصیبتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ ایک ماہ بعد میرے مکان میں آگ لگ گئی۔ بیوی بچے جل کر راکھ ہو گئے۔ تمام مال و اسباب خاک سیاہ ہو گیا۔ میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ آہ قدرت کے سخت گیر ہاتھ نے دنوں میں مجھ سے انتقام لیا۔ عرصہ تک میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر کہیں وسیلہ نہ مل سکا۔ آخر کو تنگ آ کر بھک منگوں میں شامل ہو گیا۔ جہاں آج آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میرے مالک مجھے معاف کر دے۔ آہ اس سیاہ کار کو بخش دے۔"

ڈاکٹر جو رو رہا تھا۔ جمشید نے ڈاکٹر سے کہا۔ "آہ رحمدل ڈاکٹر آپ میری حالت پر روتے ہیں۔ روئیے نہیں۔ بلکہ دعا کیجئے۔ کہ پروردگار مجھے بخش دے۔"

ڈاکٹر سسکیاں لیکر رونے لگا۔ "جمشید جمشید خدا تمہارے گناہوں کو معاف کرے۔ آہ۔ آہ میں تمہاری حالت پر نہیں روتا۔ جمشید تم نے مجھے برباد کیا۔ ہائے دلاور میرا پیارا بیٹا .... کمبخت ڈاکٹر علی تیرے سامنے بیٹھا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ جمشید نے ایک لمبی چیخ ماری۔ اور پچھاڑ کھا کر چارپائی پر گر گیا .... ڈاکٹر علی نے اٹھ کر اسے دیکھا ..... سراغرساں موت کی نیند سو رہا تھا۔"

ایک شعر

چشم ہے اشک فشاں اپنا جگر جلتا ہے
کیا قیامت ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

بدصورتی

(جناب عبدالرشید ابراہیم سرحدی)

عنوان کو دیکھتے ہی آپ صاحبان نے یہ اندازہ کرلیا ہوگا۔ کہ یا تو بدصورتی کی مذمت میں کچھ لکھا ہوگا۔ یا مزاحیہ طور پر اس کی تعریف کی گئی ہوگی۔ لیکن دراصل یوں نہیں بلکہ اتنی سنجیدگی سے جس کی کہ بدصورتی مستحق ہے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ خوبصورتی کو بدصورتی پر کسی پہلو سے بھی ترجیح نہیں دینی چاہئے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمیں عام خیال کو ضرور ماننا پڑتا ہے۔ خواہ ہمیں اس پر یقین ہو یا نہ۔ مثلاً چھپے ہوئے کاغذوں کے ایک مجموعے کو چونکہ سب لوگ کتاب کہتے ہیں تو ہمیں بھی یہی نام اختیار کرنا ہوگا۔ اگر اور کوئی نام رکھ دیا جائیگا تو وہ ۔علیٰ ہٰذالقیاس! انہی حالات کے اندر بدصورتی کو بُرا کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور خوبصورتی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ عام خیال یہی ہے۔ ورنہ افریقہ میں حبشیوں کے قبیلہ میں اگر سفید رنگ کا کوئی آدمی چلا جائے (جو باقی ملکوں میں تو خوبصورت سمجھا جاتا ہو) تو سب اسے حیرت و نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہاں سب مرد و عورت کالی رنگت۔ موٹے ہونٹوں اور بے ڈھنگے نقش والے ہوتے ہیں۔ تو ان کے لئے یہی خط و خال خوبصورتی میں شامل ہیں۔ اور سفید رنگ وہاں بدصورتی میں خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کی بدصورتی باقی دنیا میں خوبصورتی ہے۔ اور وہاں کی خوبصورتی باقی دنیا میں بدصورتی۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقتاً بدصورتی اور خوبصورتی کوئی مقررہ چیز نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو خیال آیا ویسے ہی انھوں نے اختیار کرلیا۔

خوبصورتی پسند کیوں ہے؟ چونکہ خوبصورت چیزیں کم ہیں۔ اور بدصورت زیادہ۔ لیکن اگر اس کے برعکس ہوتا۔ یعنی بدصورتی کم ہوتی اور خوبصورتی زیادہ تو یقیناً بدصورتی پسند کی جاتی۔ مثلاً آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اگر تمام پھول گلاب کے ہو جائیں تو کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو انھیں پسند کرے۔ کون انھیں اپنے کوٹ کے کاج میں جگہ دیگا۔ یا گلدستوں میں رکھے گا۔ کوئی شاعر بھی اس کی تعریف میں اتنے قصیدے نہ لکھتا جتنے کہ آج تک گلاب کی تعریف میں لکھے جاچکے ہیں۔ اسی طرح اگر زیادہ لوگ عالم ہوجائیں تو علم کی قدر نہ رہے۔ اور زیادہ چیزیں خوبصورت ہوجائیں تو خوبصورتی کی وقعت نہ رہے۔ اسی لئے خداوندکریم نے اکثر کو بدصورت بنایا اور چند کو خوبصورت۔ تاکہ تمیز ہوسکے۔ ورنہ بقول اقبالؔ ع پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی۔ جسے جونسی صفت پسند آئے وہ قبول کرے۔ اکثر داناؤں کے نزدیک خوبصورتی کوئی صفت ہے ہی نہیں۔ ع سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا۔

بدصورتی کی فوقیت اسی بات سے معلوم ہوجاتی ہے کہ اگر سفید رنگ کے چہرے پر سیاہ داغ ہو تو کیا خوبصورت معلوم ہوگا۔ لیکن اگر سیاہ رنگ پر سفید داغ ہو تو کڑوا کریلا نیم چڑھا کے مصداق ہوگا۔

بدصورتی اس کے علاوہ زیادہ پاک اور بے ضرر ہوتی ہے۔ خوبصورت چیزوں میں اکثر دھوکا اور فریب پایا جاتا ہے۔ لیکن

چونکہ عام یہی پسند کی جاتی ہے تو سوداگر اور دوکاندار اس نکتہ سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور ایسا مال بناتے ہیں جو صرف جمالی خربوزہ ہی ہوتا ہے۔ دیکھنے میں تو نہایت اچھا لیکن ویسے بیکار۔ اور ناپائیدار۔ گلاب کے پھول کو دیکھئے کیسا خوبصورت اور دلکش ہے لیکن اسے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا نہیں کہ کانٹوں نے ڈس کھایا۔ اور تمام مزہ کرکرا ہوگیا۔ باقی پھول اگرچہ کم خوبصورت ہیں لیکن ان کے ساتھ کمبخت کانٹے تو نہیں۔ بعینہ یہی حالت آدمیوں کی بھی ہے۔ جو اپنی وضع قطع اور لباس کی آڑ میں خلقِ خدا کو دھوکا دیتے پھرتے ہیں۔ فرشتہ صورت لیک شیطان سیرت۔ ظاہری اور صوری معنوں میں تو اچھے ہوتے ہی ہیں لیکن اخلاق۔ محبت اور پاکبازی اکثر ان میں عنقا ہوتی ہے۔ اتی شخص اگرکم خوبصورت ہوتے ہیں لیکن حسد اور غرور دیغرہ برائیوں سے پاک ہوتے ہیں۔

ان تمام نقائص کے علاوہ خوبصورتی میں ایک اور عیب ہے۔ جو بدصورتی میں کبھی بھی نہیں ہوا۔ خوبصورتی اکثر دفعہ کئی جانوں اور سلطنتوں کے اجڑنے کا باعث ہوئی ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو اکثر جنگوں کا باعث یہی ہوتی ہے۔ کمبخت ہیلن کی وجہ سے ٹرائے کا ملک تباہ و برباد ہوگیا۔ اور کئی ہزار جانیں تلف ہوگئیں مگر ہیلن خوبصورت نہ ہوتی تو کیا یہ حشر بپا ہوتا۔ شاہ علاؤالدین نے پدمنی کی خوبصورتی کی وجہ سے چتوڑ کی سرزمین پر خون کے دریا بہا دئے۔ اور بھلا یہ تو بتائیے۔ جے چند والئی قنوج کے دل میں پرتھوی راج کے برخلاف آگ کس وجہ سے بھڑکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہند میں ہندو سلطنت کا جنازہ اُٹھ گیا۔

چند سال ہوئے امریکہ کے ایک من چلے ڈاکٹر نے بدصورت اور خوبصورت لڑکیوں کے ذہن اور سلیقہ شعاری کے مختلف تجربے کرکے امتحان لیا۔ تو اس نے معلوم کیا کہ بدصورت لڑکیاں خوبصورت لڑکیوں سے بدرجہا ذہین اور ہوشیار ہوتی ہیں چنانچہ آجکل اکثر معزز خواتین خوبصورتی کے نقائص دیکھکر اس کے مخالف ہوچکی ہیں۔ اور انھوں نے ایک بڑی سوسائٹی قایم کی ہے جس کے ممبر تمام دنیا میں موجود ہیں۔ ان کا مقصد اولیٰ یہی ہے کہ بدصورتی کو کسی نہ کسی طرح خوبصورتی پر ترجیح دلوائی جائے۔

میرے خیال میں آپ میرے نظریہ کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ اور بدصورت صاحبان کو کافی تسلی بھی ہوگئی ہوگی۔ اس لئے میں مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

رباعی

رنج و غم ہے ملال ہے دنیا سر بسر اک وبال ہے دنیا
رنگ رلیاں منانے والے دیکھ ایک خواب و خیال ہے دنیا

جگنو

(از جناب نفیس سندیلوی)

مہتاب کی روشنی میں صحرائی جھاڑیوں کے قریب تر مقامات پر روشن پتنگے جگنو نظر آتے ہیں۔ یہ جگنو کیا ہیں؟ تحریر قدرت کے صفحہ نیچر پر چمکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سیمیں نقطے جن کو کلک قدرت سے ٹپکے ہوئے نور کے قطرے کہتے ہیں۔ یا حسین مہتاب کی پیشانی پر چمکتے ہوئے افشانی ذرے! وہ ذرۂ نور ہیں۔ آویزۂ حور ہیں یا آتش محبت سے جلے ہوئے طور کی چنگاریاں جس کے اندر حضرت موسیٰ بیہوش و وارفتہ تھے۔

آہ...... جگنو میری آنکھوں سے تیری محبت میں ٹپکے ہوئے اشک ہیں۔ تیرے فراق میں میری آرزوؤں کے نقش قدم جن کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ کہ کیا جگنو آسمان کے وہ ستارے ہیں۔ جو شب تار میں تیرے حسن کے سامنے اتر آتے ہیں۔ اور عرق آلودہ پیشانی کے سامنے اس لئے سجدہ کر رہے ہیں کہ میں ان کو ان قطرات سے تشبیہ دوں جو میرے دل کے اندر بوئے محبت پیدا کر رہے ہیں۔

جگنو تیری در دنداں ہیں جو دم تبسم کچھ کچھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ جگنو ترے تراشیدہ ناخن ہیں جو جان پاکر شب تار میں آسمان پر ماہ نو بنے ہوئے ہیں اور پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ ہم وہ دولت لازوال ہیں جس کا وجود آج سے قیامت تک باقی رہیگا۔ سچ تو یہ ہے۔ وہ نگین خاتم سلیمان ہیں جس کے قبضہ میں تمام کائنات ہے۔

جگنو خود کہتا ہے کہ میں تحریر قسمت بتاں کا حرف ہوں اور حسن لازوال کا چمکتا ہوا عروج اور اس کا نشان ——— لیکن میں تو یہ کہونگا کہ جگنو تیرے حسن کا پروانہ ہے۔ اور میری محبت کا دیوانہ جو اس صورت میں دشت و بیابان کے اندر مثل قطرۂ سیماب نظر آتا ہے!

جگنو میرے قلب کی شوریدگی ہے جو ہجر کی سیاہی دیکھکر سینے سے نکل آئی ہے۔ جگنو میری محبت کا تقاضا ہے جو ہر ایک

معشوق کے سامنے موجود نظر آتا ہے۔ جگنو میری آنکھوں کی روشنی ہے۔ جو صورت نماز عاشقان جنگل کی کھلی فضا میں سربسجود ہو کر روئے خالق نظر آتی ہے۔ مگر مجھ کو تسکین نہیں ہوتی۔ اور میں اپنے خیالات کو بلند کر کے جگنو کے لئے کچھ اور کہتا ہوں۔

جگنو کہیں تمہارے منہ سے نکلا ہوا میری محبت میں مزین کوئی مصرع۔ شعر تو نہیں یا تمہاری نازکی سے بار بار میرے قتل پر چھپٹ جانے والا آبدار خنجر تو نہیں۔ ہاں مجھ کو یاد آیا ہمارے لئے دعا نے جو ارادے پیدا کئے تھے وہ جوش مسرت میں اڑ کر آنکھوں کے سامنے جگنو بنے ہیں ہاں جگنو تیری محبت کا موتی ہے۔ اور میری فریاد کا نتیجہ جس کو کہ نہ تو چھو سکتا ہے اور جس پر نہ میں فخر کر سکتا ہوں۔ کیونکہ جگنو تو قدرت کی کاری گری ہے۔ جو صحیفۂ کائنات پر روشن مطلب بنکر نمایاں ہے۔ وہ تفصیل عبارت کی زرین تحریروں کے نکات کا ایک لفظ ہے۔ جس کو بزم قدرت نے ہمارے لئے شمع معرفت بنا کر روشن کیا ہے۔ تاکہ ہم اس کے عرفان سے نہ بھٹکیں۔ اور گمراہ ہو کر نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ لیکن جب میں نے اپنے تصورات کے اندر کسی کا جلوہ دیکھا تو بیتاب ہو کر کہا کہ جگنو کچھ نہیں۔ تیری تابش نور کے سامنے وحشتناک جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا دیوانہ اور ہوا پر جوئے شیر کی لکیر بناتا ہوا جگنو فرہاد کا ایک کام اور شیریں کے امتحان عشق کا پرچہ۔ یوسف کے حسن یمین کی جھلک سے قلب زلیخا میں روشن ہو جانے والا تپش عشق کا چھالا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

میں نے وادی مثال میں بہت ڈھونڈھا اور تلاش کیا۔ لیکن اس کو خیال موہوم کی جھلک اور بجھی ہوئی آگ کے دھوئیں کی صورت اس وقت پایا جبکہ آفتاب بلند ہو چکا تھا اور صبح نمودار تھی۔ اس لئے جگنو میرے لئے کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ میں جگنو بنانے والے کو پہچانتا ہوں۔

رباعی

قبائے زندگانی چاک تا کے
چوں موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاش دانہ در خاشاک تا کے

(اقبال)

بلھے شاہ اور ان کی "کافیاں"

(از جناب میر ولی اللہ بی۔اے۔ ایل ایل بی وکیل۔ ایبٹ آبادی۔ سرحدی مظلہ العالی)

میر بلھے شاہ قادری شطاری۔ قصوری قدس سرہٗ۔ حضرت شاہ عنایت قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شاہ عنایت خود حضرت شاہ رضا لاہوری رحؒ کے مرید اور قوم کے ارائیں یعنی باغبان تھے۔ مدتوں اپنے پیر طریقت کی خدمت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا اور پھر مامور ہو کر قصور چلے گئے۔ وہاں سید بلھے شاہ جو قصور کے رہنے والے تھے ان کے مریدوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

بلھے شاہ کی نسبت ارادت بچند واسطہ شاہ محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتی ہے۔ آپ عابد و زاہد اور صاحب جذب و سکر تھے۔ اکثر مجالس سماع منعقد فرمایا کرتے تھے اور دوران سماع میں آپ پر وجد کی حالت طاری ہو جایا کرتی تھی۔

مسٹر سی۔ ایف۔ ازبورن کا بیان ہے کہ بلھے شاہ پنڈوک ضلع لاہور میں جو ایک معمولی قصبہ ہے ۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۵۳ء میں انتقال فرما گئے۔ لیکن خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے "کہ وفات وے در سال یک ہزار و یکصد و ہفتاد و یک ہجری است" اس قول کے مطابق آپ گویا ۱۷۵۷ء میں فوت ہوئے۔ نہ کہ ۱۷۵۳ء میں۔

آپ کے خاندانی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ آپ کے والد ماجد کا نام محمد درویش تھا۔ سوانح حیات بھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ آپ مدت العمر مجرد رہے۔ شادی نہ کی۔ کہتے ہیں کہ آپ کی ہمشیرہ نے بھی اس بارہ میں آپ کی تقلید کی۔

آپ پنجابی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ فلسفۂ تصوف کے حقائق و معارف کو جس خوبصورتی سے آپ نے پنجابی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ کسی شخص کا مقولہ ہے کہ بلھے شاہ نے بان کی رسیوں میں موتی پروئے ہیں۔

آپ کی کافیاں آج تک مقبول خاص و عام ہیں۔ قوال مجالس سماع میں جب ان کی کافیاں سناتے ہیں تو سننے والے وجد و طرب میں آ جاتے ہیں۔

بلھے شاہ صوفی مشرب تھے۔ اور اس لئے ظاہری عبادات کی رسوم و قیود کے مقابلہ میں تزکیہ باطن کی اہمیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نکے گیاں گل مکدی ناہیں بھچر آپ نہ دلوں مکائیے
گنگا گیاں گل مکدی ناہیں بھاویں سو سو غوطہ لائیے

گیا گیاں گل مکدی ناہیں بھاویں کتنے پنڈ بھرا سیئے
بلھے شاہ گل مکدی تاہیں جدوں میں نوں کھڑے لٹا سیئے

یعنی مکے جانے (اور حج کرنے) سے جھگڑا ختم نہیں ہوتا جب تک آپ دل سے ہی اس جھگڑے کو ختم نہ کریں۔ گنگا جا کر اشنان کرنے سے یہ قصہ ختم نہیں ہوتا۔ خواہ آپ دریا میں سینکڑوں غوطے کیوں نہ لگا ڈالیں۔ گیا جانے سے یہ قضیہ تمام نہیں ہوتا۔ گو آپ کتنے ہی پنڈ بھروالیں۔ اے بلھے شاہ بات صرف اسی صورت سے پوری ہو سکتی ہے کہ اپنے آپ کو (یعنی اپنی خودی کو) کھڑے کھڑے لٹوا دو۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

"اک نقطہ وچ گل مکدی ہے"

پھڑ نقطہ چھوڑ حساباں نوں۔ کر دور کفر دیاں باباں نوں
لاہ دوزخ گور عذاباں نوں۔ کر صاف دلے دیاں خواباں نوں
گل اسے گھر وچ ڈھکدی ہے۔ اک نقطے وچ گل مکدی ہے

اینویں متھا زمین گھسائی دا۔ لما پا محراب دکھائی دا
پڑھ کلمہ لوک ہسائی دا۔ دل اندر کجھ نہ لیائی دا
کدی بات سچی بھی لکدی ہے۔ اک نقطے وچ گل مکدی ہے

کئی حاجی بن بن آئے جی۔ گل نیلے جامے پائے جی
حج ویچ ٹکے لے کھائے جی۔ بھلا ایہہ گل کینوں بھائے جی
کوئی بات سچی بھی لکدی ہے۔ اک نقطے وچ گل مکدی ہے

اک جنگل بحریں جاندے نی۔ اک دانہ روزی کھاندے نی
بے سمجھ وجود تھکاندے نی۔ گھر آون ہو کے ماندے نی
اینویں چلیاں وچ گل لکدی ہے۔ اک نقطے وچ گل مکدی ہے

یعنی ایک نقطہ میں سارا قصہ تمام ہو سکتا ہے۔ اس ایک نقطے کو پکڑ لو اور باقی سارے حساب چھوڑ دو۔ ان کفریات سے دور ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو عذاب قبر اور عذاب دوزخ سے بچا لو۔ اور اپنے دل کے خیالات کو پاکیزہ بنا لو۔ بات اسی طرح سچی ہے۔ ایک نقطے میں سارا قصہ تمام ہو سکتا ہے۔

لوگ یونہی زمین پر ماتھا گھساتے ہیں۔ اور لمبے لمبے محراب پیشانیوں پر لگا کر لوگوں کو دکھلاتے ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہیں۔

تو لوگ ان پر ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل میں کلمہ کا خیال نہیں ہوتا۔ سچی بات کبھی چھپ نہیں سکتی۔ ایک نقطے میں سارا قصہ تمام ہو سکتا ہے۔

کئی لوگ حاجی بن کر آجاتے ہیں۔ اور نیلے کپڑے پہنے پھرتے ہیں۔ حج بیچکر پیسے کماتے ہیں۔ بھلا اس بات کو کون پسند کر سکتا ہے۔ سچی بات کیونکر پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ ایک نقطہ میں سارا قصہ تمام ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ جنگلوں اور دریاؤں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور روزانہ ایک دانہ کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بیوقوفی سے اپنے جسم کو تھکاتے ہیں۔ جب گھر واپس آتے ہیں تو بالکل زار و نحیف ہوتے ہیں۔ یونہی بلاوجہ اپنی جان کو چلے کاٹ کاٹ کر خشک کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک نقطے ہی میں سارا قصہ تمام ہو سکتا ہے۔

یہ نقطہ کیا ہے؟ بلھے شاہ نے خود بتایا ہے۔ کہ یہ نقطہ دل کی صفائی ہے۔ اور بس۔ صرف حج پر جانے سجدہ کرنے کلمہ پڑھنے اور چلے کاٹنے سے کچھ نہیں بنتا۔ اصلی بات تزکیہ نفس ہے۔ باطن کو صاف کر لو تو سمجھ لو کہ سب کچھ کر لیا۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں

بھٹھ نمازاں تے چکڑ روزے کلمے تے پھر گئی سیاہی
بلھے شاہ شوہ اندر ملیا بھلی پھرے لوکائی

یعنی نمازیں بھاڑ میں گئیں۔ اور روزے کیچڑ میں اور کلمے پر سیاہی پھر گئی۔ بلھے شاہ ہمیں محبوب اپنے گھر میں ہی ملگیا۔ دنیا کہاں کہاں بھولی بھٹکی پھرتی ہے۔

بلھے نوں لوگ متیں دیندے بلھیا تو جا بہہ مسیتی
وچ مسیتاں دے کیہ ہوندا جو دلوں نماز نہ نیتی
باہروں پاک کیتے کیہ ہوندا جو اندروں نہ گئی پلیتی
بن مرشد کامل بلھیا تیری اینویں گئی عبادت کیتی

یعنی بلھے کو لوگ نصیحت کرتے ہیں۔ کہ جا کر مسجد میں بیٹھ۔ مسجد جانے سے کیا ہوتا ہے اگر دل سے نماز نہ پڑھی گئی۔ جسم کو باہر سے پاک کرنے کا کیا فائدہ ہے اگر دل کے اندر سے پلیدی نہ گئی۔ اے بلھے شاہ بغیر کامل مرشد کے تیری تمام عبادتیں بیکار ہیں۔

عبادات ظاہری کی طرح بلھے شاہ ظاہری علوم کے فوائد کے بھی قائل نہیں۔ ان کے نزدیک صرف ایک حرف کافی ہے۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

علموں بس کریں او یار + علم نہ آوے وچ شمار

اکو الف ترے درکار۔ جاندی عمر نہیں اعتبار
علموں بس کریں اویار۔ علموں بس کریں اویار

پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر۔ قرآن کتاباں چار چوفیر
گردے چانن وچ اندھیر۔ باجھوں رہبر خبر نہ سار
علموں بس کریں اویار۔ علموں بس کریں اویار

پڑھ پڑھ مسئلے روز سناویں۔ کھانا شک شبہ والا کھاویں
دسیں ہور تے ہور کماویں۔ اندر کھوٹ باہر سچیار
علموں بس کریں اویار۔ علموں بس کریں اویار

علموں پئے قضیئے ہور۔ اکھیں والے انھے کور
پھڑے سادھ تے چھڈے چور۔ دوہیں جہانیں ہویا خوار
علموں بس کر اویار۔ علموں بس کریں اویار

بہتا علم عزازیل نے پڑھیا۔ جھگا جھایا اس دا سڑیا
گل وچ طوق لعنت دا پڑیا۔ آخر گیا اوہ بازی ہار
علموں بس کریں اویار۔ علموں بس کریں اویار

یعنی اے دوست علم پڑھنا ختم کرو۔ علموں کی کوئی شمار نہیں۔ صرف ایک الف تمہارے کام کی چیز ہے۔ اور بس۔ عمر جا رہی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ علم پڑھنا ختم کرو۔ علم پڑھنا ختم کرو۔

علم پڑھ پڑھ کر تم نے ڈھیر لگا دیئے۔ قرآن اور کتابیں تمہارے چاروں طرف پڑی ہیں۔ گرداگرد روشنی ہے۔ اور اندر اندھیرا۔ (یعنی چاروں طرف کتابوں کی روشنی کے باوجود تمہارا دل سیاہ ہے) کسی رہنما کے بغیر تمہیں کچھ نہ ہو سکے۔ علم پڑھنا ختم کرو۔ علم پڑھنا ختم کرو۔

مسئلے لوگوں کو مسئلے پڑھ پڑھ کر سناتے ہو۔ اور جو کچھ تم کھاتے ہو اس کے حلال ہونے میں شک ہے۔ لوگوں کو

اور کچھ بتاتے ہو۔ اور خود اور کچھ کرتے ہو۔ تمہاری زبان پر سچ ہے اور دل میں جھوٹ۔ علم پڑھنا ختم کرو۔ علم پڑھنا ختم کرو۔

علم پڑھنے سے نئے نئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ آنکھوں والے اندھے بن جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاہ پکڑے جاتے ہیں۔ اور چور چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اور دونوں جہانوں میں خواری ہوتی ہے۔ علم پڑھنا ختم کرو۔ علم پڑھنا ختم کرو۔

عزازیل (یعنی شیطان) نے بہت علم پڑھا تھا۔ اس کا گھر اور سامان جل گیا۔ گلے میں لعنت کا طوق پڑ گیا۔ اور آخر کار وہ بازی ہار گیا۔ پس علم پڑھنا ختم کرو۔ علم پڑھنا ختم کرو۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ؎

ہک الف پڑھو چھٹکارا ہے

اس الفوں دو تن چار ہوئے - پھر لکھ کروڑ ہزار ہوئے
پھر اتھوں بے شمار ہوئے - ہک الف دا نکتہ نیارا ہے
ہک الف پڑھو چھٹکارا ہے

کیوں پڑھنا ئیں گڈ کتاباں دی - سر چائیں پنڈ عذاباں دی
ہن ہویا شکل جلاداں دی - اگے پینڈا مشکل بھارا ہے
ہک الف پڑھو چھٹکارا ہے

بن حافظ حفظ قرآن کریں - پڑھ پڑھ کے صاف زبان کریں
پھر نعمت وچ دھیان کریں - من پھردا جوں ہرکارا ہے
ہک الف پڑھو چھٹکارا ہے

بلہا بی بوہڑ دا بو یا سی - اوہ برھ وڈا جیا ہو یا سی
جد برچھ اوہ فانی ہویا سی - پھر رہ گیا بی اکارا ہے
ہک الف پڑھو چھٹکارا ہے۔

یعنی صرف ایک الف پڑھو۔ اسی میں تمہارا چھٹکارا ہے۔ اسی ایک الف سے دو تین اور چار بنے۔ بڑھتے بڑھتے ہزار لاکھ اور کروڑ بن گئے۔ پھر اتنے بڑھے کہ کوئی شمار نہ رہا۔ یہ الف ایک عجیب و غریب نکتہ ہے۔ صرف ایک الف پڑھو۔ اسی میں تمہارا چھٹکارا ہے۔

پوری گاڑی کا بوجھ کتابیں کیوں پڑھتے ہو۔ اپنے سر پر عذابوں کی یہ گٹھڑی کیوں رکھتے ہو۔ جلادوں کی سی شکل کیوں بنائی ہے۔ سفر جو تمہارے درپیش ہے۔ وہ بہت لمبا اور مشکل ہے۔ صرف ایک الف پڑھو۔ اسی میں تمہارا چھٹکارا ہے۔

حافظ بن کر قرآن حفظ کرتے ہو۔ اور پڑھ پڑھ کر اپنی زبان (یعنی قرات) کو صاف کرتے ہو۔ لیکن دھیان دنیا کی دولت میں رہتا ہے۔ اور تمہارا دل ادھر ادھر اس طرح پھرتا ہے جس طرح ہرکارہ۔ صرف ایک الف پڑھو۔ اسی میں تمہارا چھٹکارا ہے۔ اسے بلھے بڑا بیج بویا گیا۔ وہ بہت تنومند درخت بن گیا۔ جب وہ درخت فنا ہو گیا۔ تو پھر رہ کیا گیا؟ صرف ایک بیج۔ صرف ایک الف پڑھو۔ اسی میں تمہارا چھٹکارا ہے۔

یہاں الف سے مراد ذاتِ خدا ہے۔ الف کا حرف اور ایک کا ہندسہ ہمشکل ہیں۔ ایک سے ہی دو تین چار۔ دس۔ سو۔ ہزار۔ لاکھ اور کروڑ بن گئے۔ اعداد بے انتہا ہیں۔ لیکن تمام کا اصل ایک کا ہندسہ ہے۔ وحدت وجودی کے قایل صوفی یہی کہتے ہیں۔ کہ موجود صرف ایک ذات خدا کی ہے۔ باقی تمام موجودات صرف اسی ایک ذات کے کرشمے ہیں۔ اس اصول کی تمثیل بلھے شاہ نے بڑ کے بیج سے دی ہے۔ کہ ایک چھوٹا سا بیج تھا بویا گیا۔ تو ایک پودا پیدا ہوا۔ وہ پودا بڑھتے بڑھتے ایک عظیم الشان درخت بن گیا۔ لیکن درخت آخرکار پھر فنا ہو گیا۔ اور وہی بیج باقی رہ گیا۔ موجودات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کہ بے انتہا نظر آتی ہے لیکن اصل میں قایم اور دایم ذات خدا کی ہے۔ باقی سب چیزیں عارضی اور فانی ہیں۔

فلسفہ تصوف میں سب سے زیادہ مہتمم بالشان مسئلہ "ہمہ اوست" کا مسئلہ ہے۔ وحدت وجودی کے قائل کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں موجود صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی موجودات اسی ایک ذات کے جلوے ہیں۔ اصل وہ ہے اور عکس یہ۔ انھیں سوائے خدا کی ذات کے دنیا میں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں میں تصوف۔ ہندوؤں میں ویدانت اور یورپ میں بارکلے اور ہیوم اور ان کے معتقدوں کا فلسفہ قریب قریب اسی خیال کی تائید میں ہیں۔ ان کے نزدیک مادی موجودات قایم بالذات نہیں ہیں۔ بلھے شاہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہُن کِیں تھیں آپ چھپائی دا
ہُن کیں تھیں آپ چھپائی دا
کتے لاں ہو بلیندے ہو ... کتے سنت فرض دسیندے ہو
کتے رام دہائی دیندے ہو ... کتے ماتھے تلک لگائی دا
ہن کیں تھیں آپ چھپائی دا
ہن کیں تھیں آپ چھپائی دا
بِندرابن میں گاؤ چراوے ۔ لنکا چڑھ کے ناد بجاوے
مکے دا بن حاجی آوے ۔ واہ واہ رنگ وٹائی دا

ہن کیں بھتیں آپ چھپائی دا
ہن کیں بھتیں آپ چھپائی دا

بلہا شوہ ہن صحیح سمجھاتے ہو ٭ ہر صورت نال پچھاتے ہو
کتے آتے ہو کتے جاتے ہو ٭ ہن میں تو نیں نہ جائی دا

ہن کیں بھتیں آپ چھپائی دا
ہن کیں بھتیں آپ چھپائی دا

بلھے شاہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ کہ اب اپنے آپ کو کس سے چھپا رہے ہو۔ کبھی ملا بن کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہو۔ کبھی سنت اور فرض کے مسائل بیان کرتے ہو۔ کبھی رام کی دہائی دیتے ہو۔ کبھی ماتھے پر تلک لگا رہے ہو۔ اب اپنے آپ کو کس سے چھپا رہے ہو۔

کبھی (کرشن بن کر) بندرابن میں گائے چراتے ہو۔ کبھی (رام چندر بن کر) لنکا پر چڑھائی کر کے ناد بجاتے ہو۔ کبھی مکے جا کر حاجی بن کر آجاتے ہو۔ عجیب عجیب رنگ بدل رہے ہو۔ اب اپنے آپ کو کس سے چھپا رہے ہو۔

بلھے نے اے حضور اب آپ کو صحیح طور پر شناخت کر لیا ہے۔ ہر صورت میں آپ کو پہچان لیا ہے۔ کبھی کہیں سے آتے ہو۔ کبھی کہیں چلے جاتے ہو۔ اب مجھ سے کہاں بھول سکتے ہو۔ اب اپنے آپ کو کس سے چھپا رہے ہو۔

بلھے شاہ کی وسعتِ مشرب جابجا نمایاں ہے مکے کا ذکر ہے تو گنگا اور گیا کا مذکور بھی موجود ہے۔ سجدہ یاد آتا ہے۔ تو ماتھے کے تلک کو بھی نہیں بھولتے۔ خدا رنگ بدل کر اگر حاجی بنتا ہے۔ تو کرشن اور رامچندر کے جامہ میں بھی آ جاتا ہے۔ فلسفہ تصوف کی یہ ہمہ گیری بلھے شاہ کی کافیوں میں نہایت وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کافیوں کو اس درجہ قبول عام نصیب ہوا۔

اسی مضمون پر ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

کیوں لامکانی دسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو
کن فیکون میں آپ کہایا۔ میں باجھوں ہور کیہڑا آیا
عشقوں سب ظہور بنایا۔ عاشق ہو کے دسدے ہو
کیوں لامکانی دسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

پچھوں آدم کس نے آندا ہے۔ کتوں آیا ہے کتوں جاندا ہے
اتھے کس واتینوں لا بجھا ہے۔ اتھے کھادا نا لا نسدے ہو

کیوں لامکانی وسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

توہیں سناویں توہیں گاویں۔ اناالحق کی تار ملاویں
منصور سولی تے چا چڑھاویں۔ اتے کول کھلوکے ہسدے ہو
کیوں لامکانی وسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

کتے رومی ہو کتے زنگی ہو۔ کتے ٹوپی پوش فرنگی ہو
کتے میخانے وچ بھنگی ہو۔ کتے مہر مہری مل بوسدے ہو
کیوں لامکانی وسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

کتے ہو سکندر طرف نوشاباں۔ ہو رسول لیاویں کتاباں
یوسف ہو کے اندر خواباں۔ زلیخا دا دل کھسدے ہو
کیوں لامکانی وسدے ہو۔ تسیں ہر رنگ دے وچ وسدے ہو

یہاں بھی مخاطب خدا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ آپ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔ کن فیکون خود ہی نے کہلوایا تھا۔ بغیر میرے اور کون آیا تھا۔ یہ تمام مخلوقات عشق کا ظہور ہے۔ اب آپ عاشق بنے پھرتے ہیں۔ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔

آدم کو وہاں سے کون لایا۔ وہ کہاں سے آیا ہے۔ اور کہاں جا رہا ہے۔ یہاں آپ کا کیا پڑا تھا۔ وہاں سے دانہ کھا کر اُٹھ بھاگے۔ آپ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔

آپ ہی سب کچھ سناتے ہیں۔ آپ ہی گاتے ہیں۔ آپ ہی اناالحق کی تار ہلاتے ہیں۔ آپ ہی منصور کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ اور آپ ہی پاس کھڑے ہو کر ہنستے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔

آپ کہیں رومی ہیں اور کہیں زنگی بن جاتے ہیں۔ کہیں ٹوپی پوش فرنگی بن جاتے ہیں۔ کہیں آپ میخانے میں جا کر بھنگ پیتے ہیں۔ کہیں مہر و مہری بن کر آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔

کبھی آپ سکندر بنکر نوشابہ کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی پیغمبر بن کر کتابیں لاتے ہیں کبھی یوسف بنکر خواب میں زلیخا کا دل چھین لیتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو لامکانی کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ تو ہر رنگ میں سما رہے ہیں۔

نوشابہ دارا کی بیٹی کا نام ہے۔ جو سکندر سے بیاہی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ خدا ہی خدا ہے۔ خالق بھی وہی ہے۔ اور مخلوق بھی وہی۔ خود آدم بن کر جنت میں رہا۔ پھر ایک دانہ کھا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ خود ہی انا الحق کہا اور خود ہی سزا دی۔ خود ہی منصور تھا۔ اور خود ہی منصور کو سولی پر لٹکایا۔ اور خود ہی پاس کھڑے ہو کر ہنستا رہا۔ رومی بھی وہ خود ہے۔ اور زنگی بھی خود۔ فرنگی بھی خود ہے اور حبشی بھی خود۔ خود ہی عاشق ہے۔ اور خود ہی معشوق۔ خود ہی مہر ہے اور خود ہی مہری۔ خود ہی یوسف ہے۔ اور خود ہی زلیخا۔ خود ہی سکندر ہے اور خود ہی نوشابہ۔ خود ہی رسول ہے اور خود ہی خدا۔

اسی مضمون پر فرماتے ہیں:-

ڈھولا آدمی بن آیا
آپے آہو آپے چیتا، آپے مارن دھایا
آپے صاحب آپے بردا، آپے مول وکایا
ڈھولا آدمی بن آیا
کہوں ہاتھی تے اسوار ہویا۔ کہوں ٹھوٹھا ڈانگ چنوایا
کہوں راول جوگی ہوگی تو۔ کہوں سوانگی سانگ بنایا
ڈھولا آدمی بن آیا
بازی گر نے بازی پائی۔ مینوں پتلی کر کے نچایا
میں اس پر تالی نچاں ہاں۔ جس گت مت یار رکھایا
ڈھولا آدمی بن آیا
ہابیل قابیل آدم دے جائے۔ آدم کس دا جایا
بلھا اتھاں نوں بھی آگے آہا۔ دادا کو دکھلایا
ڈھولا آدمی بن آیا

مطلب یہ ہے کہ معشوق (یعنی خدا) آدمی بن کر آگیا ہے۔ وہ خود ہی ہرن ہے۔ اور خود ہی چیتا۔ اور خود ہی شکاری بن کر مارنے آگیا ہے۔ وہ خود ہی آقا ہے۔ اور خود ہی غلام اور خود ہی بک گیا۔ معشوق آدمی بن کر آگیا ہے۔

کہیں تو وہ ہاتھی پر سوار ہوتا ہے۔ کہیں کشکول اور ڈنڈا لیکر مانگتا پھرتا ہے۔ کہیں راول جوگی بنجاتا ہے۔ اور کہیں جوگی۔ اور کہیں سوانگی بن کر سوانگ بھرتا ہے۔ معشوق آدمی بن کر آگیا ہے۔

بازی گر بازی کر رہا ہے۔ مجھے پتلی کی طرح نچا رہا ہے۔ جس تال پر وہ چاہتا ہے مجھے نچاتا ہے۔ معشوق آدمی بن کر آگیا ہے۔

ہابیل قابیل تو آدم کے بیٹے تھے۔ آدم کس کا بیٹا تھا۔ بلہا ان سب سے پہلے کا ہے۔ اس نے اپنے دادا لوگوں میں کھلایا ہے۔ معشوق آدمی بن کر آگیا ہے۔

ایک اور مقام پر وحدت وجودی کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ہُن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حسن دا گرم بازار
جد احد اک اکلا سی۔ نہ ظاہر کوئی تجلی سی
نہ رب رسول نہ اللہ سی۔ نہ جبار قہار!
ہُن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حسن دا گرم بازار

بیچون وبیچگونہ سی! بے شبہ بے نمونہ سی
نہ کوئی رنگ نمونہ سی ہن گوناں گوں ہزار
ہن میں لکھیا سوہنا یار جس دے حسن دا گرم بازار

پیارا پہن پوشاکاں آیا۔ آدم اپنا نام دھرایا
احد تے بن احمد آیا۔ نبیاں دا سردار
ہن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حسن دا گرم بازار

کن کہا فیکون کہایا۔ بے چونی سے چون بنایا
احد دے وچ میم رلایا۔ تاں کیتا ایڈ پسار
ہن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حسن دا گرم بازار

بجوں مسیت بجوں بتخانہ۔ برتی رہاں نہ روزہ جانا
بھل گیا وضو نماز دوگانہ۔ تیں پر جان سدا بلہار
ہن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حسن دا گرم بازار

یعنی اب میں نے اپنے حسین دوست (یعنی معشوق حقیقی یا خدا) کو پوری طرح پہچانا ہے۔ جس کے حسن کا بازار گرم ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ احد تھا، اور اکیلا تھا۔ تجلیات کا ظہور ابھی نہیں ہوا تھا۔ نہ کوئی رب تھا نہ رسول نہ کوئی جبار تھا نہ قہار۔ اب میں نے اپنے حسین دوست کو پوری طرح پہچانا ہے جس کے حسن کا بازار گرم ہے۔

ایک وقت تھا کہ وہ بیچون و بے چگون تھا۔ بے شبہ تھا۔ اور بے نمونہ تھا۔ اس کا کوئی رنگ نہ تھا۔ لیکن اب ہزاروں رنگوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اب میں نے اپنے حسین دوست کو پوری طرح پہچانا ہے جسکے حسن کا بازار گرم ہے۔

میرا پیارا پوشاکیں پہن کر آ گیا ہے۔ اپنا نام آدم رکھ لیا ہے۔ احد سے احمد بن گیا ہے۔ جو پیغمبروں کا سردار ہے اب میں نے اپنے حسین دوست کو پوری پہچان لیا ہے۔ جس کے حسن کا بازار گرم ہے۔

خود ہی کُن کہا اور خود ہی فیکون ہو گیا۔ بیچون تھا چون بن گیا۔ احد میں میم ملا کر احمد ہو گیا۔ اس لئے اتنا پھیلاؤ بنا دیا۔ اب میں نے اپنے حسین دوست کو پوری طرح پہچان لیا ہے جس کے حسن کا بازار گرم ہے۔

میں نے مسجد بھی چھوڑی اور بتخانہ بھی۔ نہ برت رکھتا ہوں نہ روزہ۔ وضو اور نماز سب بھول گئے۔ تجھ پر جان قربان کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں نے اپنے حسین دوست کو پوری طرح پہچان لیا ہے۔ جس کے حسن کا بازار گرم ہے۔

بلھے شاہ کہتے ہیں کہ جب چاروں طرف اسی کا جلوہ ہے اور ما سوا اسکے اور کوئی چیز موجود نہیں۔ تو پھر کیا مسجد اور کیا بتخانہ۔ نماز کیا اور وضو کیا۔ روزے کیا اور برت کیا۔ جب معشوق کو دیکھ لیا تو پھر عاشق کے لئے یہی کام باقی ہے کہ اس پر اپنی جان قربان کر دے۔

پھر اسی مضمون پر فرماتے ہیں:۔

پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گور نے الکھ لکھایا ہے
کہوں ویر پڑا کہوں بیلی ہے۔ کہوں مجنوں ہے کہوں لیلی ہے
کہوں آپ گرو کہیں چیلی ہے۔ سب اپنا راہ دکھایا ہے
پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گور نے الکھ لکھایا ہے

کہوں چور بنا کہوں ساہ جی ہے۔ کہیں منبر تے بہ قاضی ہے
کہوں تیغ بہادر غازی ہے۔ آپ اپنا پنتھ بتایا ہے
پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گور نے الکھ لکھایا ہے

کہوں مسجد کا ورتارا ہے۔ کہوں بنیا ٹھاکر دوارہ ہے

کہوں بیراگی جپ دھارا ہے۔ کہوں شیخن بن بن آیا ہے
پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گورنے الکھ لکھایا ہے

کہوں ترک مصلا پڑھتے ہو۔ کہوں بھگت ہندو جپ کرتے ہو
کہوں گور کھنڈی وچ پڑتے ہو۔ ہر گھر گھر لاڈلڈا یا ہے
پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گورنے الکھ لکھایا ہے

بلھا شوہ کا میں محتاج ہویا۔ مہاراج ملے مرا کاج ہویا
درشن پیا دا مرا علاج ہویا۔ لگا عشق تاں ایہ گن گایا ہے
پایا ہے کچھ پایا ہے۔ ست گورنے الکھ لکھایا ہے

یعنی معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گورو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔ کہیں وہ دشمن بن جاتا ہے کہیں دوست۔ کہیں مجنوں بن جاتا ہے کہیں لیلیٰ۔ کہیں گورو بن جاتا ہے کہیں چیلا۔ ہر کہیں اپنا ہی راستہ بتایا ہے۔ معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گورو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔

کہیں چور بن جاتا ہے کہیں شاہ۔ کہیں منبر پر بیٹھ کر قاضی بن جاتا ہے۔ اور کہیں تیغ بہادر غازی۔ خود اپنا راستہ دکھا رہا ہے۔ معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گورو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔

کہیں خود ہی مسجد بن جاتا ہے۔ کہیں ٹھاکردوارہ۔ کہیں بیراگی بن جاتا ہے۔ اور کہیں شیخ۔ معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گورو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔

کہیں ترک بنکر مصلے پر نماز پڑھتا ہے۔ کہیں ہندو بھگت بنکر پوجا کرتا ہے۔ عجیب عجیب بھیدیوں میں پڑتا ہے۔ اور گھر گھر تماشا لگا رکھا ہے۔ معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گرو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔

اے بلھا میں اپنے معشوق کا محتاج بن گیا مہاراج ملے تو میرا کام بنے اسکا درشن میرے سب دردوں کا علاج ہے جب عشق کی چوٹ لگی تب میں نے یہ گن گانے شروع کئے معلوم کرلیا ہے معلوم کرلیا ہے۔ سچے گرو نے پوشیدہ راز ظاہر کر دیا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:—

سیو ہتی ساجن میں پا لوئی۔ ہر ہر دے وچ سما لوئی
بھر کے وحدت جام پلایو۔ منصورے نوں مست کرایو
اس توں انا الحق آپ کہایو۔ پھر سولی پکڑ چڑھا یوئی
سیو ہن ساجن میں پا لوئی۔ ہر ہر دے وچ سما یوئی

باطن ہو کے ظاہر وساایو۔ گھونگھٹ کھول جمال وکھایو
شاہ عنایت بن کر آیو۔ آتے بلہا نام دھرایوی
سیو ٹنی ساجن میں پایوئی۔ ہر ہر دے وچ سمایوئی

یعنی اے سہیلیو میں نے اب ساجن کو پایا ہے۔ وہ ہر دل میں سمایا ہے۔ اس نے وحدت کا پیالہ بھر کر پلایا۔ اور منصور کو مست کر دیا۔ پھر اس سے انا الحق کہلوایا۔ اور اسے پکڑ کر سولی پر چڑھوایا۔ اے سہیلیو میں نے اب ساجن کو پایا ہے۔ وہ ہر دل میں سمایا ہے۔
وہ پوشیدہ تھا پھر ظاہر ہوگیا۔ گھونگھٹ کھول کر اپنا جمال دکھا دیا۔ اور شاہ عنایت بن کر آگیا۔ پھر اپنا نام بلہا رکھ لیا۔ اے سہیلیو میں نے اب ساجن کو پایا ہے۔ وہ ہر دل میں سمایا ہے۔
ناظرین پڑھ چکے ہیں کہ شاہ عنایت بلہے شاہ کے پیر تھے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب حقیقی ہر پردے میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہی شاہ عنایت ہے۔ اور وہی بلہے شاہ۔
ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

واہ سوہنیا تیری چال عجائب۔ لٹکاں نال چلیندے ہو
آپے ظاہر آپے باطن۔ آپے لک لک بہندے ہو
آپے ملاں آپے قاضی۔ آپے علم پڑھیندے ہو
واہ سوہنیا تیری چال عجائب لٹکاں نال چلیندے ہو

گھت زنار کفر دا گل وچ۔ بتخانے وڑ بہندے ہو
لولاک لما افلاک وجا رو۔ آپے دھوم مچیندے ہو
واہ سوہنیا تیری چال عجائب لٹکاں نال چلیندے ہو

یعنی اے معشوق تیری چال عجیب ہے۔ مٹک مٹک کر چلتے ہو۔ خود ہی ظاہر ہو خود ہی باطن۔ اور خود ہی چھپ چھپ کر بیٹھتے ہو۔ خود ہی ملا ہو خود ہی قاضی اور خود ہی علم پڑھتے ہو۔ اے محبوب تیری چال عجیب ہے مٹک مٹک کر چلتے ہو۔
کبھی کفر کا زنار گلے میں ڈالکر بت خانے میں جا بیٹھتے ہو۔ اور کبھی لولاک لما افلاک کہکر دھوم مچا دیتے ہو۔ اے محبوب تیری چال عجیب ہے۔ مٹک مٹک کر چلتے ہو۔
صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا خدا کو پہچاننا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں۔

بلھیا کے جاناں میں کون!

ناں میں مومن وچ مسیتاں۔ نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں۔ نہ میں موسیٰ ناں فرعون
بلھیا کے جاناں میں کون

ناں میں اندر بید کتاباں۔ نہ وچ بھنگاں نہ شراباں
نہ وچ رنداں مست خراباں۔ نہ وچ جاگن نہ وچ سون
بلھیا کے جاناں میں کون

ناں میں بھیت مذہب دا پایا۔ ناں میں آدم حوا جایا!
ناں میں اپنا نام دھرایا۔ ناں وچ بیٹھن نہ وچ بھون
بلھیا کے جاناں میں کون

اوّل آخر آپ نوں جاناں۔ ناں کوئی دوجا ہور پچھاناں
میں تو ہور نہ کوئی سیاناں۔ بلھا شوہ کھڑا ہے کون
بلھیا کے جاناں میں کون

یعنی اے بلھے شاہ۔ میں کیا جانوں میں کون ہوں۔ نہ میں مسجد میں مسلمان ہوں۔ نہ میں کفر کی رسموں میں ہوں۔ نہ میں پاکوں میں ہوں نہ پلیدوں میں۔ نہ میں موسیٰ ہوں نہ فرعون۔ اے بلھے شاہ میں کیا جانوں میں کون ہوں۔

نہ میں ویدوں اور کتابوں میں ہوں۔ نہ میں بھنگ اور شراب میں ہوں۔ نہ میں رند مست و خراب ہوں۔ نہ میں جاگ رہا ہوں نہ سو رہا ہوں۔ اے بلھے شاہ میں کیا جانوں میں کون ہوں۔

نہ تو میں نے مذہب کا بھید پایا۔ اور نہ میں آدم اور حوا کی اولاد سے ہوں۔ نہ میں نے اپنا کوئی نام رکھا یا ہے نہ میں بیٹھا ہوں نہ چل رہا ہوں۔ اے بلھے شاہ میں کیا جانوں میں کون ہوں۔

میں اپنے آپ کو ہی اول اور آخر جانتا ہوں۔ میں کسی دوسرے کو نہیں پہچانتا۔ مجھ سے سیانا اور کون ہے۔ وہ کون معشوق کھڑا ہے۔ اے بلھے شاہ میں کیا جانوں میں کون ہوں۔

فلسفۂ تصوف کی رو سے موجودات کی آفرینش کا باعث عشق ہے۔ نظام کائنات کے قیام کا باعث عشق ہے۔ اسی لئے صوفی تمام عبادات پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر عشق ہے تو سب کچھ ہے اور اگر عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اسی مضمون پر بلھے شاہ فرماتے ہیں۔

عشق دی نویوں نویں بہار

جاں میں سبق عشق دا پڑھیا۔ مسجد کولوں جیوڑا ڈریا!
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا۔ جتھے وجدے ناد ہزار
عشق دی نویوں نویں بہار

جاں میں رمز عشق دی پائی۔ مینا طوطا مار گوائی
اندر باہر ہوئی صفائی۔ جت ول دیکھاں یارو یار
عشق دی نویوں نویں بہار

ہیر رانجھے دے ہو گئے میلے۔ بھلی ہیر ڈھونڈیندی بیلے
رانجھا یار بغل وچ کھیلے۔ سدھ نہ رہیا سرت سنبھال
عشق دی نویوں نویں بہار

بید قرآناں پڑھ پڑھ تھکے۔ سجدیاں کردیاں گھس گئے متھے
ناں رب تیرتھ ناں رب مکے۔ جس پایا تس نور جمال
عشق دی نویوں نویں بہار

پھوک مصلاتے بھن سٹ لوٹا۔ نہ پھڑ تسبیح عاصا سوٹا
عاشق کہندے دیدے ہوکا۔ ترک حلالوں کھا مردار
عشق دی نویوں نویں بہار

عمر گنوائی وچ مسیتی۔ اندر بھریا نال پلیتی
کدے نماز وحدت نہ نیتی۔ ہن کے کرنا ایں شور پکار
عشق دی نویوں نویں بہار

عشق بھلایا سجدہ تیرا۔ ہن کیوں ایویں پاویں جھیڑا!
بلہا ہوندا چپ بہتیرا۔ پر عشق کریندا مارومار
عشق دی نویوں نویں بہار

یعنی عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔ جب سے میں نے عشق کا سبق پڑھا ہے مسجد سے دل ڈر گیا ہے۔ اور ٹھاکروں کے ڈیرے میں جا داخل ہوا ہے۔ جہاں ہزارہا ناقوس بج رہے ہیں۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔
جب سے میں نے عشق دی رمز پائی ہے۔ طوطے مینا کے قصے چھوڑ دیتے ہیں۔ اندر باہر صفائی ہو گئی ہے۔

جدھر دیکھتا ہوں یار ہی یار نظر آتا ہے عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

ہیر اور رانجھا کی ملاقات ہوگئی۔ لیکن غافل ہیر اب تک بیلوں میں اس کی تلاش کر رہی ہے۔ حالانکہ رانجھا اس کی بغل میں کھیل رہا ہے۔ نہ سدھ بدھ رہی نہ عقل اور ہوش۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

وید اور قرآن پڑھ پڑھ کر تھک گئے۔ سجدے کر کر کے ماتھے گھس گئے۔ خدا نہ تیرتھوں میں ہے نہ مکے میں۔ جس نے اسے پالیا۔ نور جمال حاصل ہو گیا۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

مصلّا جلا دے اور لوٹا توڑ دے۔ نہ تسبیح ہاتھ میں لے اور نہ عصا۔ عاشق پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حلال کو ترک کردو۔ اور مردار کھاؤ۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

تمام عمر مسجد میں ضائع کردی۔ اور دل پلیدی سے بھرا رہا۔ کبھی نماز وحدت نہ پڑھی۔ اب شور پکار کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

(اے خدا) عشق نے تیرا سجدہ بھلا دیا ہے۔ اب تو کیوں جھگڑا کرتا ہے۔ بلہا چپ رہنے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ لیکن عشق زور کرتا ہے۔ اور چپ نہیں رہنے دیتا۔ عشق کی نئے سے نئی بہار ہے۔

راہ عشق کی مشکلات کے بارے میں بلھے شاہ فرماتے ہیں:۔

رہ رہ وے عشقا ماریائی۔ کہہ کس نوں پار اتاریائی
آدم کنکوں منع کرایا۔ آپے مڑ شیطان دوڑایا
کڈھ بہشتوں زمین رلایا۔ کیڈ پسار پساریائی!
رہ رہ وے عشقا ماریائی۔ کہہ کس نوں پار اتاریائی

خواب زلیخا نوں دکھلایو۔ یوسف کھوہ دے وچ پوایو
بھایاں نوں الزام دوایو۔ تاں مراتب چا ودھیائی
رہ رہ وے عشقا ماریائی۔ کہہ کس نوں پار اتاریائی

بھیڑ سلیماں تو جھکوایو۔ ابراہیم چخہ وچ پایو
صابر دے تن کیڑے پایو۔ حسن زہر دے ماریائی
رہ رہ وے عشقا ماریائی۔ کہہ کس نوں پار اتاریائی

یعنی اے عشق بس کر تو نے ہمیں مار ڈالا۔ بتا تو نے کبھی کسی کو پار بھی اتارا ہے۔ پہلے تو نے آدم کو دانۂ گندم سے منع کرایا۔ پھر خود ہی اس کے پیچھے شیطان دوڑایا۔ اسے بہشت سے نکال کر زمین پر آوارہ کیا۔ تو نے کتنا پھیلاؤ پھیلایا ہے۔ اے عشق بس کر تو نے ہمیں مار ڈالا۔ بتا تو نے کبھی کسی کو پار بھی اتارا ہے۔

زلیخا کو خواب دکھائی۔ پھر یوسف کو کوئیں میں گرایا۔ اور الزام اس کے بھائیوں پر لگوایا۔ تب کہیں جا کر اسے مراتب دلوائے۔ اے عشق بس کر تو نے ہمیں مار ڈالا۔ بتا تو نے کبھی کسی کو پار بھی اتارا ہے۔

سلیمان سے بھاڑ جھونکوائے۔ ابراہیم کو جلتی آگ میں ڈالا۔ صابر کے جسم میں کیڑے ڈالے۔ اور امام حسن کو زہر دے کر مارا۔ اے عشق بس کر تو نے ہمیں مار ڈالا۔ بتا تو نے کبھی کسی کو پار بھی اتارا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

بھرواسا کے اشنائی دا - ڈر لگدا بے پرواہی دا!
زکریا سر کروت چلایو - صابر دے تن کیڑے پایو
صنعاں گل زنار پوایو - کتے اُلٹا پوست لہائی دا
بھرواسا کے اشنائی دا - ڈر لگدا بے پرواہی دا

پیغمبر تے نور آ پایو - نام امام حسین دھرایو
جھولا جبرائیل جھلایو - پھر پیاسا گلا کہائی دا
بھرواسا کے اشنائی دا - ڈر لگدا بے پرواہی دا

یحییٰ اس دا یار کہایا - نال اہی دے نیونہ لگایا
راہ شرع دا آن بتایا - سر اس دا تھال کٹائی دا
بھرواسا کے اشنائی دا - ڈر لگدا بے پرواہی دا

یعنی آشنائی کا کیا بھروسہ ہے۔ (معشوق کی) بے پرواہی سے ڈر لگتا ہے۔ زکریا کے سر پر آرے چلوائے۔ صابر کے جسم میں کیڑے ڈالے۔ صنعان کے گلے میں زنار ڈالا۔ کہیں کسی کا الٹا چمڑا اتروایا۔ آشنائی کا کیا بھروسہ ہے بے پرواہی سے ڈر لگتا ہے۔

پیغمبر پر نور بھیجا۔ نام امام حسین رکھا۔ جبرائیل سے اس کا جھولا جھلوایا۔ اور آخر کار پیاسا اسے ذبح کرا دیا۔ آشنائی کا کیا بھروسہ ہے۔ بے پرواہی سے ڈر لگتا ہے۔

یمیٰ اس کا دوست کہلایا۔ اسی کے ساتھ عشق لگایا۔ شریعت کا راستہ بتایا۔ اور پھر اس کا سر طشت میں کاٹ کر رکھ دیا۔ آشنائی کا کیا بھروسہ ہے۔ بے پرواہی سے ڈر لگتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

عشق اساں نال کیہی کیتی لوک مریندے طعنے
دل دی ویدن کوئی نہ جانے اندر ویس بیگانے
جس نوں چاٹ امر دی ہووے سوئی امر پچھانے
اس عشق دی اوکھی گھاٹی۔ جو چڑھیا سو جانے
عشق اساں نال کیہی کیتی لوک مریندے طعنے

آتش عشق فراق تیرے نے پل وچ ساڑ وکھایا
اس عشق دے ساڑے کولوں جگ وچ دہاں دوہایاں
جس تن لاگی سو تن جانے دوجا کوئی نہ جانے
عشق اساں نال کیہی کیتی لوک مریندے طعنے

میں وے ایانی نیونہ کے جاناں جانے سگھڑ سیانی!
اس ماہی دے صدقے جاواں جس دا ہور نہ ثانی!
روپ سروپ انوپ ہے اُس دا شالا جوانی مانے
عشق اساں نال کیہی کیتی لوک مریندے طعنے

عشق قصائی نے جیہی کیتی ہرگز خبر نہ کائی!
عشق چواتی لائی چھاتی پھر نہ جھاتی پائی!
ماپیاں کولوں چھپ چھپ روواں کر کر لکھ بہانے
عشق اساں نال کیہی کیتی لوک مریندے طعنے

ہجر تیرے توں جھلی بن کے کملی ناؤں سدایا
صمٌ بکمٌ عمیٌ ہو کے۔ اپنا وقت لنگھایا

کرہن نظر کرم دی سایاں نہ کر زور دھگانے!
عشق اساں نال کیہی کیتی لوگ مریندے طعنے

فضل ترا درکار اساں نوں ہر ویلے ہر حیلے
پاک رسول محمد صاحب میرے خاص وسیلے
بلھیا شوہ جے ملے پیارا لکھ کراں شکرانے
عشق اساں نال کیہی کیتی لوگ مریندے طعنے

یعنی عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ اُلٹے طعنے مارتے ہیں۔ دل کی لگی کو کوئی نہیں جانتا۔ ہم اپنے دیس میں پردیسی ہیں۔ امر کو وہی لوگ جانتے ہیں جن کو امر کی جاٹ لگی ہو۔ عشق کی گھاٹی بہت مشکل ہے جو چڑھتا ہے وہی جانتا ہے۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

تیرے عشق اور فراق کی آگ نے ایک پل میں مجھے جلا دیا۔ عشق کے سوز سے میں جہان میں فریاد کر رہی ہوں جس تن کو لگتی ہے وہی تن جانتا ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

میں انجان ہوں پریت کو کیا جانوں۔ کوئی عقل والی جانتی ہوگی۔ میں اس معشوق پر قربان ہو جاؤں جس کا کوئی ثانی نہیں اس کا روپ سروپ انوپ ہے۔ خدا کرے کہ وہ جوانی سے بہرہ اندوز ہو۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

ظالم عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اس کی کسی کو خبر تک نہیں۔ ہماری چھاتی میں آگ لگا کر چلا گیا۔ اور پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ ماں باپ سے چھپ کر نئے نئے بہانے بنا کر میں روتی رہتی ہوں۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

میں تیرے ہجر میں پاگل ہو گئی۔ اور دیوانی اپنا نام رکھا یا ہے۔ بہری۔ گونگی اور اندھی ہو کر وقت گذارا۔ اے میرے مولا اپ کرم کی نظر کر اور زور زبردستی چھوڑ۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

ہمیں ہر وقت اور ہر حیلے تیرا فضل درکار ہے۔ پاک رسول محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے خاص وسیلے ہیں۔ اے بلھے شاہ اگر محبوب ملجائے تو لاکھ لاکھ شکرانے ادا کروں۔ عشق نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اور لوگ الٹے طعنے مارتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

مینوں چھڈ گئے آپ لد گئے۔ میں وچ کی تقصیر
راتیں نیند نہ سکھ ستی دسنے پلستاں نیر
توپاں تے تلواراں کولوں تکھے عشق دے تیر

عشق جیہڈا نہ ظالم کوئی۔ ایہ زحمت بے پیر
اک پل ساعت آرام نہ دیوے۔ بری وچھوڑے دی پیڑ
بلھیا شوہ جے کرے عنایت سب دکھ ہوں تغیر

یعنی مجھے چھوڑ گئے اور آپ روانہ ہوگئے۔ میرا کیا قصور تھا۔ رات بھر آرام سے سو نہیں سکتی۔ اور دن بھر روتی رہتی ہوں۔ توپوں اور تلواروں سے عشق کے تیر زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ عشق جیسا کوئی ظالم نہیں۔ یہ زحمت بے پیر ہے۔ ایک پل ایک ساعت آرام نہیں دیتا۔ ہجر کا درد بُرا ہوتا ہے۔ اے بلھے شاہ اگر معشوق عنایت کرے تو سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

پیاریا سنبھل کے نیونہ لا۔ مڑ کر پچھو تاویں گا!!!
جاندا جا نہ آویں پھیر۔ اُتھے بے پرواہی ڈھیر
اتھے ڈھل کھلوندے شیر۔ توں بھی پھندا جائیں گا
پیاریا سنبھل کے نیونہ لا۔ مڑ کر پچھو تاویں گا

یوسف کھوہ پوا یوسنے۔ جا وچ بازار وکا یوسنے
اک اٹی تل پوا یوسنے۔ توں کوڈی تل وکاویں گا
پیاریا سنبھل کے نیونہ لا۔ مڑ کر پچھو تاویں گا

اکناں دے پوست لہائی دے۔ اک آریاں نال چرائی دے
اک سولی پکڑ چڑھائی دے۔ اتھے توں بھی سیس کٹاویں گا
پیاریا سنبھل کے نیونہ لا۔ مڑ کر پچھو تاویں گا

بلھیا غیر شرع نہ ہو۔ سکھ دی نیندر بھر کے سو
سوہوں تاں انا الحق کو۔ چڑھ سولی ڈھولا گاویں گا
پیاریا سنبھل کے نیونہ لا۔ مڑ کر پچھو تاویں گا

یعنی اے پیارے سوچ سمجھ کر عشق لگا۔ ورنہ پچھتائے گا۔ جاتے ہو تو جاؤ لیکن پھر واپس نہ آؤگے۔

وہاں بے پرواہی زیادہ ہے۔ وہاں شیر بھی مغلوب ہو جاتے ہیں۔ تم بھی پھندے میں پھنس جاؤ گے۔ اے پیارے سوچ سمجھکر عشق لگا۔ ورنہ پچھتائیگا۔

یوسف کو کوئیں میں ڈلوایا۔ پھر بازار میں جاکر کھولا۔ ایک اٹی سوت اس کی قیمت ڈلوائی۔ تو ایک کوڑی پر بک جائیگا۔ اے پیارے سوچ سمجھکر عشق لگا۔ ورنہ پچھتائیگا۔

بعض کے چمڑے اتروائے گئے۔ بعض آریوں سے چروائے گئے۔ بعض سولی پر چڑھوائے گئے۔ وہاں تو بھی سرکٹوانے گا۔ اے پیارے سوچ سمجھکر عشق لگا۔ ورنہ پچھتائیگا۔

اے بلہے شریعت کے خلاف نہ چل۔ سکھ آرام کی نیند سو۔ منہ سے انا الحق نہ کہہ ورنہ سولی پر چڑھکر ڈھولے گائے گا۔ اے پیارے سوچ سمجھکر عشق لگا۔ ورنہ پچھتائیگا۔

ہیر اور رانجھے کا قصہ پنجاب کے افسانہ ہائے عشق و محبت میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول عام ہے۔ اسی قصے کو سامنے رکھکر بلہے شاہ فرماتے ہیں۔

کیونکر جائیے کعبے نوں یار۔ دل لوچے تخت ہزارے نوں
لوگ جو سجدے کتے نوں کردے۔ میرے یار میرے پیارے نوں
کیونکر جائیے کعبے نوں۔ دل لوچے تخت ہزارے نوں

اوگن ویکھ نہ بھُل میاں رانجھا۔ یاد کریں اس کارے نوں
کیونکر جائیے کعبے نوں۔ دل لوچے تخت ہزارے نوں

میں من تارو ترن نہ جاناں۔ شرم پئی تدھ تارے نوں
کیونکر جائیے کعبے نوں۔ دل لوچے تخت ہزارے نوں

ترے نال دا ثانی کوئی نہ لبھیا۔ بلہا ڈھونڈھ رہیا جگ سارے نوں
کیونکر جائیے کعبے نوں۔ دل لوچے تخت ہزارے نوں

یعنی ہم کعبہ کس طرح جائیں۔ ہمارا دل تو تخت ہزارہ کی پوجا کرتا ہے۔ لوگ کعبے کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے پیارے یار کو سجدہ کرتے ہیں۔ ہم کعبے کس طرح جائیں۔ ہمارا دل تو تخت ہزارہ کی پوجا کرتا ہے۔

اے میاں رانجھا مجھے بے ہنر سمجھ کر بھول نہ جانا۔ میرے سوز عشق کو یاد کرنا۔ ہم کیسے کس طرح جائیں۔ ہمارا دل تو تخت ہزارہ کی پوجا کرتا ہے۔

میں تیراک نہیں۔ تیرنا نہیں جانتی۔ تو تیراک ہے۔ تجھے ہی شرم ہے۔ ہم کیسے کس طرح جائیں۔ ہمارا دل تو تخت ہزارہ کی پوجا کرتا ہے۔

تیرا ثانی کوئی نہیں ملتا۔ لہٰذا تمام جہان میں تلاش کر چکا ہے۔ ہم کیسے کس طرح جائیں۔ ہمارا دل تو تخت ہزارے کی پوجا کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

اک رانجھا مینوں لوڑیدا۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا
کن فیکون اگے دیاں لگیاں۔ نیونہ نہ لگڑا چوریدا
اک رانجھا مینوں لوڑیدا۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا

رانجھے جیہا مینوں ہور نہ کوئی۔ منتاں کر کر موڑیدا
اک رانجھا مینوں لوڑیدا۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا

سانولیاں دے نین سلونے۔ سوہا دوپٹہ گوری دا
اک رانجھا مینوں لوڑیدا اک رانجھا مینوں لوڑیدا

احد احمد وچ فرق نہ بلھیا۔ رتی اک بھید مروڑی دا
اک رانجھا مینوں لوڑیدا۔ اک رانجھا مینوں لوڑیدا

یعنی مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔ میرا عشق کن فیکون سے بھی پہلا ہے۔ کوئی چوری کی بات نہیں مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔

رانجھے کا ثانی مجھے اور کوئی نہیں ملتا۔ منتیں کر کر کے اسے واپس بلاتی ہوں۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔

سانولے رنگ والیوں کی آنکھیں نمکین ہوتی ہیں۔ اور گورے رنگ والی کا دوپٹہ سرخ۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔

مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔

اے بلھے شاہ احد اور احمد میں کوئی فرق نہیں۔ صرف ایک رتی بھر (میم) کی مروڑی کا بھید ہے۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔ مجھے صرف رانجھے کی ضرورت ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

حاجی لوگ مکے نوں جاندے۔ اساں جاناں تخت ہزارے
جت ول یار اتی ول کعبہ۔ بھاویں دیکھ کتاباں چارے
حاجی لوگ مکے نوں جاندے۔ میرے گھر وچ نوشہ مکہ
وچے حاجی وچے غازی۔ وچے چور اچکا!

یعنی حاجی لوگ مکے کی طرف جاتے ہیں۔ ہمیں تخت ہزارے جانا ہے۔ جس طرف یار ہے اسی طرف کعبہ ہے بیشک چاروں کتابیں دیکھ لو۔ حاجی لوگ مکے کی طرف جاتے ہیں۔ ہمارے گھر میں مکے کا بادشاہ موجود ہے۔ وہ خود ہی حاجی ہے خود ہی غازی اور خود ہی چور اچکا ہے۔

افراطِ اشتیاق دیدار میں فرماتے ہیں۔

گھونگھٹ اوہلے نہ لک سوہنیاں۔ میں مشتاق دیدار دی ہاں
ایتھے اُتھے دوہیں جہانیں۔ میں باندی دلدار دی ہاں
جانی بوجھ دیوانی ہوئی۔ ٹوکاں کردے لوگ سبھوئی
جیکر یار کرے دلجوئی۔ میں تن فریاد پکار دی ہاں
گھونگھٹ اوہلے نہ لک سوہنیاں۔ میں مشتاق دیدار دی ہاں

باندی مفت وکاندی جاندی۔ بل ماہیا جند ایویں جاندی
اک دم ہجر نہیں میں سہندی۔ میں بلبل اس گلزار دی ہاں
گھونگھٹ اوہلے نہ لک سوہنیاں۔ میں مشتاق دیدار دی ہاں

یعنی اے میرے محبوب گھونگھٹ کے پیچھے نہ چھپ۔ میں دیدار کی مشتاق ہوں۔ یہاں اور وہاں دونوں جہانوں میں میں اپنے دلدار کی غلام ہوں۔ معشوق کے بغیر میں دیوانی ہوگئی۔ لوگ طعنے مارتے ہیں۔ میں ہر وقت فریاد کر رہی ہوں تاکہ دلدار دلجوئی کرے۔ اے میرے محبوب گھونگھٹ کے پیچھے نہ چھپ۔ میں دیدار کی مشتاق ہوں۔ تیری باندی مفت بکی جا رہی ہے۔ اے محبوب چل کہ جان ضائع جا رہی ہے۔ میں تیرا ہجر ایک دم کے لئے بھی

برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں اس باغ کی بلبل ہوں۔ اے میرے محبوب گھونگھٹ کے پیچھے نہ چھپ۔ میں دیدار کی مشتاق ہوں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

بن بس کر جی بن بس کر جی ۔ اک بات اساں نال ہس کر جی
تسیں دل میرے وچ وسدے سی ۔ تد سانوں دور کیوں دسدے سی
تدوں گھت جادو دل کھسدے سی ۔ ہن کت ول جاہو لس کر جی
بن بس کر جی بن بس کر جی ۔ اک بات اساں نال ہس کر جی

تسیں چھپدے ہو اساں پکڑے ہو ۔ اساں وچ جگر دے جکڑے ہو
تسیں اجے چھپن نوں تکڑے ہو ۔ ہن جان نہ ملدا نس کر جی
بن بس کر جی بن بس کر جی ۔ اک بات اساں نال ہس کر جی

بلہا شاہ اسیں تیرے ہاں بردے ۔ تیرے مکھ ویکھن نوں ہاں مردے
نت سو منتاں ہاں کردے ۔ ہن بیٹھ ہجر وچ وس کر جی
بن بس کر جی بن بس کر جی ۔ اک بات اساں نال ہس کر جی

یعنی اب بس کرو اب بس کرو۔ ایک بات ہم سے ہنس کر کرو۔ آپ میرے دل میں رہتے تھے۔ پھر اپنے آپ کو دور کیوں بتاتے تھے ہمارا دل جادو کرکے چھینتے تھے۔ اب بھاگ کر کدھر جاؤ گے۔ اب بس کرو۔ اب بس کرو۔ ایک بات ہم سے ہنس کر کرو۔

آپ چھپتے ہیں ہم نے آپ کو پکڑا ہے۔ ہم نے آپ کو اپنے جگر میں جکڑ رکھا ہے۔ آپ ابھی تک چھپنے کے بہادر ہیں اب آپ بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ اب بس کرو۔ اب بس کرو۔ ایک بات ہم سے ہنس کر کرو۔

اے محبوب ہم تیرے غلام ہیں۔ تیرا چہرہ دیکھنے کے لئے مرتے ہیں۔ ہر روز سو سو منتیں کرتے ہیں۔ اب ہمارے دل و جان میں وس کر بیٹھو۔ اب بس کرو۔ اب بس کرو۔ ایک بات ہم سے ہنس کر کرو۔

اہل دنیا کو خواب غفلت سے جگاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

اٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں ۔ ایہہ سون تیرے درکار نہیں
اک روز جہانوں جانا ہے ۔ جا قبرے وچ سمانا ہے!

تیرا گوشت کیڑیاں کھانا ہے - کر چیتا مرگ وسار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

تیرا ساہا نیڑے آیا ہے - کجھ چولی داج رنگایا ہے
کے اپنا آپ وکھایا ہے - اے غافل تینوں سار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

توں ستیاں عمر وکھائی ہے - تیری ساعت نیڑے آئی ہے
توں چرخے تند نہ پائی ہے - کے کریں داج تیار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

اجکل تیرا مکلاوا ہے - کیوں سُتی کر کے دعویٰ ہے
انڈٹھیا نال ملاوا ہے - ایہہ پھلکے گرم بازار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

توں اس جہانوں جاویں گی - پھر قدم نہ اتھے پاویں گی
ایہہ جوبن روپ وکھاویں گی - تیں رہنا وِچ سنسار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

بلہیا شوہ بن کوئی ناہیں - اتھے اُتھے دوہیں سرائیں
سنبھل سنبھل قدم ٹکائیں - پھر آون دوجی وار نہیں
اُٹھ جاگ گھراڑے مار نہیں - ایہہ سون ترے درکار نہیں

یعنی اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔ ایک روز جہان سے جانا ہے۔ اور قبر میں جا لیٹنا ہے۔ کیڑے تیرا گوشت کھائیں گے۔ موت کو یاد کر اسے نہ بھول۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

تیری شادی کا وقت نزدیک ہے۔ کچھ جہیز تیار کیا ہے۔ تو نے اپنے آپ کو ضائع کر دیا۔ اے غافل تجھے کچھ خبر ہی نہیں۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

تو نے نیند میں عمر ضائع کر دی۔ تیرا وقت نزدیک آگیا ہے۔ تو نے ابھی تک چرخے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تو کیا کرے گی تیرا جہیز تیار نہیں ہے۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

آجکل تجھے سسرال جانا ہے۔ دعویٰ کر کے کیوں سوئی پڑی ہے۔ ان لوگوں کے پاس جانا ہے جنہیں تو نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کل یہ گرم بازاری نہ ہوگی۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

تو اس جہان سے جائیگی۔ پھر واپس آنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ جوبنا اور روپ ضائع ہو جائیگا۔ تجھے اس جہان میں رہنا نہیں ملے گا۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

اے بلھے معشوق کے بغیر اور کوئی نہیں۔ نہ یہاں نہ وہاں دونوں جہان میں۔ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ۔ دوبارہ یہاں آنا نصیب نہ ہوگا۔ اُٹھ جاگ خراٹے نہ مار۔ یہ سونا تیرے کام نہیں آئیگا۔

اسی مضمون پر فرماتے ہیں۔

تسیں آؤ ملو میری پیاری - میرے ٹرنے دی ہویو تیاری
سبھے رل کے ٹورن آیاں ماسیاں پھپھیاں چاچیاں تایاں
سبھے روندیاں زارو زاری - میرے ٹرنے دی ہویو تیاری

سبھے آکھن ایہ گل جانی - رہیں ہردم ہو کے نمانی
تاہیں لگیں گی اُتھے پیاری - میرے ٹرنے دی ہویو تیاری

سبھے ٹور گھراں نوں مڑیاں - میں تاں اِک اکلڑی ہوڑیاں
بھویاں ڈاردیں کونج نیاری - میرے ٹرنے دی ہویو تیاری

بلھیا شوہ مرے من بھاوے - میں وچھی نوں لے گل لاوے
اس شوہ دی بات نیاری - میرے ٹرنے دی ہویو تیاری

یعنی اے میری پیاریو مجھے ملنے آؤ۔ میرے چلنے کی تیاری ہوگئی ہے۔ مائیں۔ پھوپھیاں۔ چاچیاں اور تایاں بلکہ سبھی وداع کرنے آئیں۔ اور زار وزار رو رہی ہیں۔ میرے چلنے کی تیاری ہوگئی ہے۔

سب کہتی ہیں کہ یہ بات یاد رکھو کہ ہمیشہ عاجز ہو کر رہنا تب ہی وہاں پیاری لگوگی۔ میرے چلنے کی تیاری ہو گئی ہے۔ مجھے الوداع کہکر سب گھروں کو واپس ہوئیں۔ میں تن تنہا روانہ ہو گئی۔ اپنے ڈار سے کونج کی طرح علیحدہ ہو گئی۔ میرے چلنے کی تیاری ہو گئی ہے۔

اے بلھے شاہ معشوق میرے دل کو بھاتا ہے۔ مجھ بے سلیقہ کو گلے لگاتا ہے۔ اس معشوق کی ہر بات انوکھی ہے۔ میرے چلنے کی تیاری ہو گئی ہے۔

حقائق تصوف کا بیان عموماً خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اور صوفیائے کرام ہمیشہ شکایت کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے۔ اس کے اظہار کی انہیں تاب نہیں۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں۔

منہ آئی بات نہ رہندی ہے
جھوٹا آکھاں تے کجھ بچدا ہے۔ سچ آکھاں بھانبڑ مچدا ہے
جی دوہاں گلاں توں جچدا ہے۔ جچ جچ کے جیبھا کہندی ہے
منہ آئی بات نہ رہندی ہے
اک لازم بات ادب دی ہے۔ سانوں بات معلومی سبھ دی ہے
ہر ہر وچ صورت رب دی ہے۔ کتھوں ظاہر کتھوں چھپیندی ہے
منہ آئی بات نہ رہندی ہے
جس پایا بھیت قلندر دا۔ راہ کھوجیا اپنے اندر دا
سکھ واسی ہے اس مندر دا۔ جتھے چڑھدی ہے نہ لہندی ہے
منہ آئی بات نہ رہندی ہے
جدوں ظاہر ہوئے نور ہوریں۔ جل گئے پہاڑ کوہ طور ہوریں
تدوں دار چڑھے منصور ہوریں۔ اتھے شیخی نہ میں ڈھیندی ہے
منہ آئی بات نہ رہندی ہے
اساں پڑھیا علم تحقیقی ہے۔ اتھے اکو حرف حقیقی ہے
ہور جھگڑا سب ودھیکی ہے۔ ایویں رولا پایا بہندی ہے
منہ آئی بات نہ رہندی ہے
بلھا شوہ اساں تھیں وکھ نہیں۔ بن شوہ تھیں دوجا کجھ نہیں

پھر تکنے والی دکھ نہیں ۔ تاہیں جان پئی دُکھ سہندی ہے

منہ آئی بات نہ رہندی ہے

یعنی منہ پہ آئی ہوئی بات رُک نہیں سکتی ۔ جھوٹ کہوں تو کچھ بچتا ہے ۔ سچ کہوں تو شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں ۔ دل دونوں باتوں کو تولتا ہے ۔ پھر تول تول کر زبان کہتی ہے ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رک نہیں سکتی ۔

ادب لازم ہے ۔ ورنہ سب کی بات مجھے معلوم ہے ۔ ہر چیز میں خدا کی صورت ہے ۔ کہیں ظاہر ہے اور کہیں پوشیدہ ہے ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رُک نہیں سکتی ۔

جس نے قلندر کا بھید پا لیا ۔ اور اپنے اندر کے راستے کا کھوج نکالا ۔ وہ اس مندر میں سکھ آرام سے رہتا ہے جس کا نہ کوئی مشرق ہے ۔ نہ مغرب ۔ نشیب ہے نہ فراز ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رک نہیں سکتی ۔

جب نور صاحب ظاہر ہوئے ۔ کوہ طور صاحب جل گئے ۔ اور منصور صاحب سولی پر چڑھ گئے ۔ وہاں نہ تیری شیخی چلتی ہے ۔ نہ میری ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رُک نہیں سکتی ۔

ہم نے تحقیقی علم پڑھا ہے ۔ وہاں حرف ایک ہی حرف ہے جو حقیقی ہے ۔ باقی جھگڑے فضول ہیں ۔ یونہی شور مچا رکھا ہے ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رُک نہیں سکتی ۔

اے بلھے شاہ معشوق ہم سے جدا نہیں بلکہ معشوق کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جان تکلیفیں برداشت کر رہی ہے ۔ منہ پہ آئی ہوئی بات رُک نہیں سکتی ۔

امید ہے کہ ناظرین اس انتخاب سے حضرت بلھے شاہ کے صوفیانہ خیالات کا صحیح اندازہ کر سکیں گے ۔ انتخاب قدرے طویل ہو گیا ہے ۔ لیکن مدعا یہ تھا کہ پنجابی کے اس مشہور صوفی شاعر کی شاعری کے تمام خصوصیات کو با لوضاحت اردو خوان پبلک کے پیش کر دیا جائے ۔ بایں ہمہ مضمون بعض مطالب کی رو سے بالکل تشنہ رہ گیا ہے ۔

اس تشنگی اور طوالت کے لئے ناظرین سے معافی کی درخواست ہے ۔ ختم کلام پر بلھے شاہ کے ایک رندانہ شعر کا مذکور غالباً بیجا نہ ہوگا ۔ فرماتے ہیں ۔

بلھیا پی شراب تے کھا کباب ۔ ہیٹھاں بال ہڈاں دی اگ !
چوری کرتے بھن گھر رب دا ۔ اس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

محرومہ

(ازجناب مولانا صادق الخیری دہلوی)

شب کا پہلا حصہ ختم ہورہا تھا۔ اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔ دمکتے ہوئے چاند کی ہلکی اور صاف روشنی درختوں کو سبز رنگتی ہوئی سڑکوں پر اور شیشوں میں سے گزرتی ہوئی مکان کے اندر پھیل رہی تھی۔ چاندنی رات میں بارش کی سفید جھیڑی خوب چمک رہی تھی۔ درختوں کے نازک پتوں پر برف کی ہلکی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھیں۔ سرو اور شمشاد کے مست درخت چاند کی روشنی، بارش اور ہوا سے کھیل رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے آتے اور شیشوں پر جمے ہوئے قطروں کو بہا دیتے۔ شاد لبتر پر پڑی اپنے ڈھائی سالہ بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے تھی۔

بجلی رہ رہ کر کوندتی، بادل جو چاند کے چاروں طرف پھیلے تھے، پھٹ پھٹ کر شور مچاتے۔ ہوا کے جھونکے تھم تھم کر آتے۔ اور بارش ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی کو توڑ کر سڑکوں پر آواز پیدا کرنے لگتی۔ قریب المرگ نحیف بچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چونکتا اور کہتا "اماں! ابا کہاں گئے؟" بچے کے یہ الفاظ ماں کے کلیجے میں تیر بنکر چبھتے۔ جب ہوا چلتی وہ اس کو بھینچنے لگتی۔ جب بادل گرجتے وہ اس کے زرد گالوں پر تھپکی دینے لگتی۔ اور بجلی کی کڑک کے ساتھ اس کے لب بچے کے سر پر لگ جاتے۔

(۲)

بچہ ماں کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ گھڑی گھڑی کہتا "اماں! ابا کہاں گئے"! ماں نے یہ سوچکر کہ بچہ اس خیال کو بھول جائے کہا "بیٹا! کہانی سنو گے؟" بچے نے ماں کی سیاہ آنکھوں کو دیکھا۔ اور ہچک کر بولا "اماں! ابا کہاں گئے؟" ماں چپ ہو گئی۔ بچے نے پھر وہی سوال کیا جس سے وہ بیتاب ہو کر بولی "کہانی سنو گے؟" بچہ خاموش ہو گیا۔ اور وہ کہانی سنانے کے لئے تیار ہو گئی۔ لیکن شروع کرنے سے پہلے وہ کچھ کھوسی گئی۔ پھر دفعتاً چونک اٹھی۔ اور بولی "کہانی؟" بچہ اس کی غمناک آنکھیں دیکھنے لگا۔ اور ماں اس خیال سے کہ بچہ پھر وہی سوال نہ کر بیٹھے، فوراً کہنے لگی:-

"زہرہ کو پانچ سال کی عمر سے پہلے کا تو کچھ معلوم نہیں۔ مگر ہاں جب اس نے اپنی عمر کے پانچویں سال میں قدم رکھا تو وہ محسوس کرنے لگی کہ اب وہ ایک نئی زندگی شروع کر رہی ہے۔ وہ اب علیحدہ مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ترستی اور پھڑکتی مگر ظالم باپ کبھی اپنی صورت نہ دکھاتا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ یہ وجہ اس کے باپ کی دوسری شادی تھی جس نے شادی کرتے ہی نئی دلہن کو گھر کی ملکہ بنا دیا۔ اور زہرہ اور اس کی ماں کو کچھ دن تو اپنے ہاں رہنے دیا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد اپنی تازہ انداز والی دلہن کی خوشنودی کے لئے ان دونوں بدنصیبوں کو الگ مکان میں بھیجدیا۔ وہ ہر مہینے زہرہ اور اس کی ماں کے لئے کچھ روپیہ بھیجدیتا۔ جو تین ہفتے بھی مشکل کافی ہوتا۔ چار سال تک اس کی زندگی اسی طرح گذری اور اس عرصے میں باپ نے ہکر نہ کبھی ان کی شکل دیکھی۔ اور نہ اپنی دکھائی۔ زہرہ باپ کی شکل کو ترستی اور اکثر رو کر کہتی "اماں، ابا کہاں ہیں؟" بچہ فوراً بول

اُمّاں! اماں ابا کہاں گئے ہیں؟

ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر کہنے لگی" ——— زہرہ اب وہ محسوس کرنے لگی جس کا اسے پہلے سان و گمان بھی نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اس کو دن بھر میں صرف ایک دفعہ کھانے کو ملتا۔ اور جہاں وہ ہمیشہ صاف ستھری رہتی تھی وہاں اب کئی کئی دن تک میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنتی۔ غرض اس کی جان ایک کس مپرسی کی حالت میں تھی۔

زہرہ غریب موت اور زندگی کیا سمجھے۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کا بُرا حال ہے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ تو وہ بیچاری بھی رونے لگی۔ ماں بچی کو روتا دیکھ کر اور بھی بے قابو ہو گئی۔ بالآخر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگی ——— معصوم زہرہ اب بن باپ کی بچی تھی۔

خواہ کیسا ہی تھا مگر تھا تو باپ!

(۳)

بیکس زہرہ جب اب نو برس کی تھی ماں کو غمگین دیکھتی اور خود بھی رونے لگتی۔ غریب ماں سے جس طرح بھی ہوتا زہرہ کے لئے کھانے کا انتظام کرتی۔ خود بھوکی رہتی۔ مگر زہرہ کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ پہنچا دیتی۔ ان ستم زدوں کو کبھی ایک سانس پیٹ کو ٹکڑا اور تن کو کپڑا میسر نہ آتا۔ مفلسی ان پر اپنا پوری طرح تسلط جمائے ہوئی تھی۔ سردیوں میں ماں زہرہ کو سینے سے چمٹا کر لیری کپڑوں میں گذارہ کرتی۔ اور گرمیوں میں کسی جھلسے ہوئے درخت کے نیچے! مگر فلک کج رفتار اب بھی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔

آخر جب دو سال اور اس حالت میں گزر گئے۔ تو ماں بھی بیچاری زہرہ کو تنہا اس دنیا میں مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے چھوڑ کر چل بسی۔

گیارہ سال کی ناسمجھ بچی زہرہ کا اب دنیا میں کوئی نہ تھا۔ پیٹ کی آگ بری چیز ہوتی ہے۔ وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور ——— زہرہ اب ایک بھکارن تھی۔

(۴)

پانچ سال اور اس نے اس طرح کاٹے کہ جب بھوک اسے بہت ستاتی تو وہ کہیں چلی جاتی۔ اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں رحم کی درخواست کرتے ہوئے سارا حال بیان کر دیتیں۔ اور یہاں تک کہ وہ شخص بھی جس نے کبھی کسی کو کچھ نہ دیا ہو سخی بن جاتا۔

سورج طلوع ہوتا اور وہ سڑکوں اور بازاروں کی خاک چھانتی پھرتی۔ سورج غروب ہوتا اور وہ تاریک گلیوں کے کسی کونے میں رات کاٹنے کے لئے پڑ جاتی۔

اس وقت جب زہرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچی۔ تو لوگ کہتے تھے کہ وہ کالے کالے بادلوں میں چمکتا ہوا ماہتاب دیکھتے ہیں"۔ اس کے سیاہ بال کمر سے نیچے لہراتے۔ اور وہ انہیں پھٹے پرانے دوپٹے سے ڈھانکنے کی کوشش کرتی تو جس طرح پانی

دبانے سے تڑپتا ہے۔ اسی طرح اس کے دوپٹے کے دامن سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنی چمکدار آنکھیں جن ہلکے گلابی ڈورے پڑے ہوتے کسی طرف اٹھاتی تو گویا جادو سا کر دیتی۔ اس کی حسین ٹانگیں بعض اوقات لیری کپڑوں میں سے باہر نکل پڑتیں۔ تو نیرِ اعظم کی بے تاب کرنیں ان ساقہائے سیمیں کو بے اختیار چومنے لگیں۔

بدنصیب زہرہ جب موسم گرما میں ماری ماری پھرتی تو اس کے پاؤں میں آبلے پڑجاتے۔ اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ اور جب سردی ہوتی، تو اس کی نازک ننگی ٹانگیں ٹھٹھر کر رہ جاتیں اور وہ کانپنے لگتی۔

(۵)

شام ہو چکی تھی۔ دریا میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اور دوسرے کنارے سے چاند اپنی شعاعیں عکس ریز کر رہا تھا۔ زہرہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی سرنگوں تھی۔ چاند کی روشنی پتوں میں سے چھن چھن کر اس پر اس طرح پھیلا ہو رہی تھی کہ کہیں سایہ تھا اور کہیں روشنی۔ اس وقت ایک رحمدل امیر دریا پر سیر کرنے کی غرض سے آیا۔ زہرہ کو اس حالت میں دیکھ کر پہلے تو دیکھا کیا۔ اور جب اس نے اس کی شکستہ حالی سے خود ہی اندازہ لگا لیا۔ تو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور بولا "بہن! کھانا کھاؤ گی"

زہرہ نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"کچھ روپیہ لو گی؟" امیر نے پوچھا۔

اس نے اسی طرح اپنا سر ہلا دیا۔

وہ متعجب ہوا کہ بھکارن ہو کر کچھ نہیں مانگتی۔ پھر ٹھیر کر بولا "بہن کپڑے پہنو گی؟"۔

زہرہ نے اپنا سر نیچے جھکا دیا۔

امیر بولا "کیسے؟ سبز یا سفید۔ جو گیا یا سیاہ؟"

وہ بولی بالکل سیاہ اور آنکھیں نیچے کر لیں۔

امیر تھوڑی دیر بعد اس کے لئے کپڑے لایا۔ زہرہ کی آنکھیں شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اور وہ واپس چلا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو گردن سے ٹخنوں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس کیا۔ لطیف ہوا کے خوشگن جھونکے چلنے لگے۔ اور قدرتی ہاتھوں نے حسین زہرہ کے بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے بال خود بخود کسی قدر ٹھیک ہو گئے۔

مہتاب اور اوپر چڑھ گیا۔ اور اپنی ضیا پاش روشنی دریا اور زہرہ پر ڈالنے لگا ——— زہرہ اس وقت ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔

وہ دریا کے کنارے بیٹھ گئی۔ اور کچھ گنگنانا شروع کیا۔ اس کی درد ناک آواز لہروں کو تڑپا رہی تھی۔ دریا ٹھہر گیا۔ مہتاب ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

مشہور مصور سالم تصویر بنانے میں منہمک تھا جس میں زہرہ کی تصویر خود بخود چلی جاتی تھی۔ نصف شب گزر چکی تھی تصویر تیار ہو گئی۔ اور مصور نے بغور دیکھا۔ اس کے دل میں ایک کامیاب تصویر کی وجہ سے خوشی کا سمندر موجزن تھا۔ مگر —— زہرہ بھی اسے بے چین کر رہی تھی۔

وہ ٹہلتا ہوا وہاں پہنچا۔ اور زہرہ کے نزدیک بیٹھ گیا۔ زہرہ اور سالم ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ زہرہ کو سالم خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اور سالم سیاہ بادلوں میں چمکتا ہوا چاند دیکھ رہا تھا۔"

دوسرے دن دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور مصور اسے اپنے گھر لے آیا۔ جہاں آبادی بہت ہی کم تھی۔ اور جو بلند ہواؤں سے باتیں کرتا تھا۔

ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ مگر زہرہ بہت کم بولتی۔ اس کی آنکھیں عموماً غمناک رہتیں۔ سالم دیکھتا سب کچھ مگر کچھ نہ سمجھتا۔ ایک سال بھی گزر گیا۔ اور زہرہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ سالم مصور اب زیادہ انہماک کے ساتھ زہرہ کی خاموش تصاویر کھینچتا وہ دونوں آپس میں کبھی کبھار ہی باتیں کرتے۔ جب بچہ ڈھائی سال کا ہو گیا تو سالم نے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر دوسری دنیا کی راہ لی۔ سارا گھر سونا ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد زہرہ کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ چارپائی سے بمشکل اُٹھ سکتی تھی۔ ادھر زہرہ اسکی یاد میں روتی اُدھر بچہ بھی گھر میں ہلکان ہوتا اور اسکو بھی رنجیدہ کرتا کہ "اماں! ابا کہاں گئے؟" —— شب کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا تھا۔ بچہ یہ سنکر آخری بار نہایت کمزور آواز میں دفعتاً چیخا۔ "اماں ابا کہاں گئے؟" اور دکھیا شاد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

(۶)

آہ! معصوم بچے! تجھے کیا خبر کہ یہ کہانی، کہانی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے۔ زہرہ اصل میں شاد ہی ہے جو اپنی تمام عمر شاید کبھی بھی شاد نہ ہوئی۔ غریب بچے! زہرہ تو تیری ماں ہی ہے۔ جو محبت پدری و مادری سے محروم ہو گئی۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اسکی محبت کا پھول بھی تھوڑے ہی عرصہ کھل کر مرجھا گیا۔

شعلوں پر بجلی کی بلا سی تہ جم رہی تھی۔ شاد اُٹھی تا کہ انگیٹھی کی آگ کو جو سرد ہو چکی تھی پھر روشن کر دے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ لوٹی اور پلنگ کی طرف بڑھی۔ کہ پھر اپنے شریک مصیبت بچے کو اپنی آغوش میں لے لے۔ مگر —— آہ! اب وہاں صرف بچے کا سرد جسم تھا اور معصوم روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ماں دیوانہ وار لپکی، اچھلی اور "لال" کہکر چیخی۔

طوفان تیز ہو رہا تھا۔ یکایک بجلی پوری طاقت سے چمکی اور بیچاری شاد (زہرہ) کی قوت بینائی دفعتاً جاتی رہی۔

اندھی شاد دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ بچے کے خیال میں آگے بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ گھر سے باہر نکل گئی۔

بارش زور شور سے ہونے لگی۔ بادل گرجنے لگے۔ گھٹائیں اُٹھنے لگیں۔ بجلی کوندنے لگی۔ اور برف پڑنے لگی۔ تھوڑی دیر تک تو بیکس شاد کی دل ہلا دینے والی آوازیں "لال! لال" پکارتی ہوئی سنائی دیں۔ لیکن پھر وہ بھی برف کے ساتھ جم گئیں۔

اس سال وہاں بہت برف پڑی۔ اور کچھ دن کے بعد جب سنہری سی روشنی پھیلی تو بازار جاتے ہوئے لوگوں نے دیکھا مصور کے گھر کا صرف بالائی حصہ نظر آ رہا ہے ——

افسانہ

دفتر حسرات

۱۳ ھ ۵۴

یا

فتنہ پردازی حسن و عشق

۱۳ ھ ۵۴

(از جناب مرزا احمد شاہ بیگ صاحب جوہر مراد آبادی مدظلہ العالی)

[illegible]ھ میں بعہد شاہجہاں شہنشاہ دہلی مرزا یوسف بیگ مخاطب بہ فیروز جنگ وملقب بہ رستم خان نے دہلی سے ایک سو میل کے فاصلہ پر جانب مشرق شہر مراد آباد کی بنیاد ڈالی۔ جو اس زمانے میں سلطنت دہلی کی طرف سے مراد آباد کے فوجدار ہو کر آئے تھے۔ تین میل عریض وطویل شہر پناہ تعمیر کی اور لب دریائے رام گنگا ایک مستحکم قلعہ بنایا۔ بعض مخالفین نے بادشاہ کو ورغلا کر رستم خان کو باغی سلطنت قرار دیا۔ دربار سے طلبی پر اور شہر کا نام دریافت کرنے پر رستم خان نے اصلی نام "رستم نگر" کا تو مصلحتاً اخفا کیا اور یہ ظاہر کیا کہ حضور کے نمک خوار نے ایک شہر بسایا ہے۔ اور گردو نواح کے سرکش راٹھور ٹھاکروں سے تحفظ کے لئے ایک قلعہ بھی معہ شہر پناہ کے تعمیر کیا ہے جس کا نام جہاں پناہ کے فرزند اصغر شاہزادہ مراد کی کے نام نامی پر مراد آباد رکھا ہے۔ مخالفین نے غریب رستم خان کو اقبالی مجرم قرار دیکر کیفر کردار کو پہنچانے کی التجا کی۔ بادشاہ نے رستم خان کو بغاوت گجرات فرو کرنے پر تعینات کیا۔ اور عقب سے کافی فوجی امداد کی۔ روانگی کی امید دلائی۔ کوئی فوجی امداد نہیں دی گئی۔ اور رستم وقت رستم خان معہ اپنے چار رجالمرد فرزندوں کے دشمن کی بے شمار فوج میں گھر کر جاں بحق ہو گیا۔ ان کی اولاد کے افراد اب بھی محلہ طویلہ اور مفتی ٹولہ میں بحالت عسرت موجود ہیں۔ جو رستم خانی مغل کہلاتے ہیں۔

ایام غدر میں فیروز شاہ عزیز شاہ ظفر مرحوم نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر رسد میسر نہ آنیکی وجہ سے دہلی کو مراجعت کی۔ گورنمنٹ نے قلعہ کو مسمار کرا دیا۔ اور گورنمنٹ ہائی سکول تعمیر کرا دیا۔ صرف ایک دالان کی عقبی دیوار بطور یادگار لب دریا اپنی حسرت خیز ہستی کا سماں پیش کر رہی ہے اور معہ مساجد جن میں سے لب دریا ایک شہر کی جامع مسجد ہے جس کی تاریخ تعمیر یہ ہے۔ بکر رستم خان زالطاف الٰہی ، بنائے خانہ دین کردہ [illegible]ھ۔ علاوہ ان کے چند چاہات رستم خان کی یادگار کے طور پر قائم ہیں۔

بحالت موجودہ شہر کی آبادی ایک لاکھ دس ہزار متنفس پر مشتمل ہے۔ چار لائینوں کا جنکشن ہے۔ اور بلحاظ

کے برتنوں کی صنعت کی بدولت چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ ظروف سازی کے صدہا چھوٹے چھوٹے کارخانے مراد آباد میں قائم ہیں۔ جو بیشمار غریبوں کی روزی کا سامان بنے ہوئے ہیں۔

(۲)

شہر مراد آباد کے ایک محلہ میں دو حقیقی بھائی اسرار حسین اور دلدار حسین رہتے تھے۔ جن کو دو حقیقی بہنیں منسوب تھیں۔ یہ دونوں بہنیں اب دیورانی جٹھانی بھی بن گئی تھیں۔ دوسرا رشتہ ایسا نازک رشتہ ہے کہ ان میں کٹی چھنی رہنا لازمات سے ہے۔ مگر چونکہ محمدی اور احمدی نے ایک ہی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے تھے انہوں نے جدید رشتہ کی کچھ پروا نہ کی۔ قدیمی ناتے کو قایم رکھا۔ اور بجائے رات دن کی دانتا کلکل کے دونوں میں دانت کاٹی روٹی رہی۔ جہاں ایک کا پسینہ گرتا وہاں دوسری اپنا خون گرانے کو تیار رہتی۔ دونوں بھائیوں میں بھی ابتداءً اتفاق رہا۔ اور باپ کے متروکہ سے ظروف مراد آبادی کا ایک مشترکہ کارخانہ کھول لیا۔ یہ کارخانہ خوب چلا۔ اور معقول آمدنی ہونے کی وجہ سے خوب اللے تللے رہے۔ گویا دن عید اور رات شب برات تھی۔ بعض خود غرض کاریگروں کو دونوں بھائیوں کا اتفاق ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ رات دن اسی خیال میں ڈوبے رہتے کہ اگر ان کے نااتفاقی سے علیحدہ علیحدہ کارخانے ہو جائیں تو دونوں کے باہمی تجارتی رقابت سے ہم کافی فائدہ اٹھا کر خوب گلچھرے اڑائیں۔ الغرض ان فتنہ پردازوں نے جھوٹی سچی لگائی بجھائی کرکے دونوں میں دو ٹوک کرا دی۔ مسکونہ مکان کے درمیان دیوار کھچ گئی۔ کارخانے جدا جدا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا لی۔ چونکہ کارخانہ کا دار و مدار کاریگروں پر ہے اس لئے دونوں کارخانہ دار اپنے اپنے کاریگروں کی نازبرداری کرتے۔ ورنہ ذرا سی بے رخی پا کر کاریگر ایک کے یہاں سے دوسرے کے یہاں چلے جاتے۔ پہلے کارخانہ دار کے برائیاں کرتے اور دوسرے کی تالیف کے لئے اس کے گیت گاتے۔

(۳)

اسرار حسین کے یہاں آج بڑی چہل پہل ہے۔ ڈوم ڈھاری بدھائیاں لا رہے ہیں۔ نقال نقلیں کر رہے ہیں۔ پنچی مانگنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ دروازہ پر بندوال بندھے ہیں۔ دوست احباب بندوقیں چھوڑ رہے ہیں۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اسرار حسین کے زمانہ عروج کی یہ پہلی خوشی ہے۔ یعنی فرزند نرینہ پیدا ہوا ہے۔ اسرار حسین خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے پنچی بانٹ رہے ہیں۔ زنانخانہ میں میراثنیں گا رہی ہیں۔ ڈومنیاں ناچ رہی ہیں۔ محمدی تو زچہ خانہ میں اندرونی دالان میں دراز ہیں۔ مقنع سر سے بندھا ہوا ہے۔ پردے چھوٹے ہوئے ہیں۔ میراثنیں "بیل بیل" کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ اور احمدی پیسے اور اکنیاں خوشی خوشی دے رہی ہیں۔ دوسری طرف اجاڈومنی اور بچے سر دل میں الاپ رہی ہے۔

پردہ میں بولو میری زچہ ۔ جگ جگ جیوے تیرا بچہ ۔ نت نت جیوے تیرا بچہ

پردہ میں بولو میری زچہ ....

(۴)

بچہ کا نام چھٹی کے بعد نثار حسین رکھا گیا۔ اور اب ماشاءاللہ چشم بددور وہ سوا مہینہ کا ہو گیا۔ محمدی چلہ نہا کر پاؤں پھیرنے کے لئے احمدی کے یہاں گئیں۔ ان کی موجودگی ہی میں احمدی کو درد زہ شروع ہوا۔ اور شب کو جیتی جاگتی چندے آفتاب چندے ماہتاب دختر پیدا ہوئی۔ چونکہ سلسلۂ تولید کی یہ پہلی بسم اللہ تھی اس لئے بسم اللہ نام رکھنا تجویز ہوا۔ محمدی نے بطور ٹھیکری کی مانگ کے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں بچی کے ہاتھ میں ڈالدیں جو اس کے کاندھوں تک آئیں۔ اور نثار حسین کے لئے بسم اللہ کا پیام دیا گیا۔ احمدی نے بخوشی اس چڑھاوے کو قبول کیا۔ اور کہا اللہ تعالےٰ دونوں کی عمر میں برکت دے۔ اور پروان چڑھائے۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں خدا راست لائے کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ محمدی چھٹی تک بہن کے پاس ہی اور تقسیم مکان اور علیحدگی کارخانہ سے جو شکر رنجی دلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ان بچوں کی بدولت رفع دفع ہو گئی۔

(۵)

یوں تو اسرار حسین اور دلدار حسین نے بوقت تقسیم مکانات وغیرہ برابر کا حصہ پایا تھا۔ مگر اسرار حسین میں تجارتی فطرت زیادہ تھی۔ اس لئے چند ہی بعد میں ان کا کارخانہ خوب ترقی کر گیا۔ وہ ہر کام کو اپنی آنکھ سے دیکھتے روزانہ کا حساب کتاب خود تحریر کرتے۔ اور پتہ لگاتے رہتے کہ کس قسم کے مال کی زیادہ مانگ ہے۔ اسی کو تیار کراتے۔ برعکس ان کے دلدار حسین دن بھر داستان امیر حمزہ بوستان خیال۔ فسانہ عجائب۔ سروش سخن۔ فسانہ سرشار اور ناول بینی میں مصروف رہتے۔ حساب لکھنے اور کام کی نگرانی کے لئے ایک چلتے پرزے منشی صاحب کو رکھ لیا تھا۔ وہ ہی کارخانہ کے سفید و سیاہ کے مالک تھے۔ کاریگروں اور منشی صاحب میں سازباز تھا۔ اس لئے جس کام میں کاریگروں کو سہولت ہوتی اور مزدوری زیادہ پڑتی وہی کام کاریگر نفع کا کام بتاتے اور منشی صاحب مہر تصدیق ثبت کر دیتے۔

اسرار حسین نے جنگ عظیم میں صرف لوٹے تیار کرائے جن کی فوجیوں کے لئے زیادہ مانگ تھی۔ اور اس طرح زمانہ جنگ میں ہزاروں روپے کے وارے نیارے کر دئے۔ دلدار حسین کاریگروں اور منشی جی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ وہ نفیس اشیاء مثل سیاہ قلم وغیرہ منقش تھالیاں وغیرہ بنواتے رہے۔ جن کی سمندر غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے قطعی نکاسی بند رہی۔ اور سارا تیار شدہ مال گھر گھوڑا ہو کر رہ گیا۔

(۶)

آج اسرار حسین کے کارخانے میں تعطیل ہے۔ مگر کاریگر سب جمع ہیں۔ فرش بچھایا جا رہا ہے۔ کرسیاں قرینہ سے لگائی جا رہی ہیں۔ کارخانہ کا مکان آراستہ کیا جا رہا ہے۔ زنانی ڈیوڑھی پر عورتوں کی ٹولیاں آ رہی ہیں۔ حمام چھڑکواں کپڑے پہنے سرخ

ماذ (جس میں بقیس کا بہنتا لگا ہوا ہے) سر سے اور دوسرا صافہ کمر سے باندھے ہوئے نہایت سرعت سے کام کاج میں معروف ہے۔ ایک چولہے پر ایک دیگ کھڑک رہی ہے۔ اور کارخانہ دار کاریگروں کے جھرمٹ میں شاہ دولہا بنے ہوئے بیٹھو ہیں۔ اور حسب ذیل چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں:-

پہلا کاریگر۔ میر صاحب خدا نے بڑی آرزو سے یہ دن دکھایا ہے کہ ننھے میاں کی آج ختنہ ہے۔ "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے" آج تو ڈیرہ والی کا ناچ اور چوک والی کا مجرا ہونا چاہیے۔

دوسرا کاریگر۔ بھئی ہماری رائے میں تو بھنڈیلوں کی نقلیں اور ہیجڑوں کا ناچ بھی ہونا چاہیے۔

تیسرا کاریگر (مسنجیدگی سے) ارے میاں یہ سرکار دوعالم کی یادگاری رسم ہے اس میں سوائے دعوت کے مولوی ملا جی اور کوئی ناشروع بات نہ ہونا چاہیے۔

چوتھا کاریگر۔ ماہ سے بے دال کے بودم۔ ڈھولی چڑھی نہ چھل چوں ہوئی تو کیا جانے آج سارے شہر میں ہمارے کارخانہ دار صاحب کا طوطی بول رہا ہے۔ اگر ناچ رنگ نہ ہوا تو سبکی ہو جائیگی۔ اور منہ دکھانے کی جگہ نہ رہیگی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے نام ہی بڑی چیز ہے۔ قدم ڈھاری اور نقال الگ اور احمد ہیجڑا الگ سارے شہر میں ڈونڈی پیٹتے پھرینگے۔ اور کنجوس مکھی چوس کہتے پھرینگے۔ بنی بنائی بات بگڑ جائیگی۔ اور ساری شیخی کرکری ہو جائیگی۔ بہتی گنگا میں جو ہاتھ دھوئے اچھا ہے۔

پانچواں کاریگر۔ یہ الو کی دم ناختہ ان باتوں کو کیا جانے۔ بقول شخصے "چہ داند بوزنہ لذات ادرک" یہ کیا جانے صابن کا بھاؤ۔ یہ تو بالکل لوٹیا ڈبونے کی باتیں کر رہا ہے۔

چھٹا کاریگر۔ بڑے بنے خیر خواہ۔ دیکھو تو لمبے بیڈول عوج بن عنق کی باتیں۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون کل سیدھی۔ ابے تکیہ چوسٹے یہ رئیسوں کے چوچلے ریاست کے ٹھاٹھ ہیں۔ اگر دھوم دھام نہ ہوئی تو دو کوڑی کی بات ہو جائیگی۔ دنیا تھو تھو کریگی۔

ساتواں کاریگر۔ بھئی جو بات سب سے پہلے ہونی چاہیئے وہ کسی کو بھی یاد نہ آئی۔ میاں لڑکا نوشہ بن کر سہرا سر پر سجا کر سلطان پیر غیب کے مزار پر انوار پر سلام کو جائیگا۔ کم سے کم ایک ہاتھی نوشہ کے لئے اور آٹھ دس جوڑے کاریگروں کے لئے مہیا ہونے چاہئیں۔ میرٹھ والے آتشباز سے رنگ برنگی باغ ماڑی (باغ و بہار) بنوانی چاہیئے گھر کا کارخانہ ہے۔ کاغذی درختوں میں پیتل کی تھالیاں اور چھوارے بادام ناریل لگوانے چاہئیں۔ بم کے گولے آگے آگے چھوٹتے ہوں۔ ست رنگا باجہ درمیان میں بجتا چلے۔ سب سے آگے شہنائی نواز ہوں اور ان کے پیچھے جگوتے لونڈے۔ ناچتے گاتے ڈنڈے بجاتے چلیں۔ تاکہ دنیا جہان دیکھنے اور جان جائے کہ آج میر اسرار حسین صاحب کارخانہ دار ظروف

ظروف کے لڑکے کی رسم ختنہ ہے۔

حسب
کارخانہ دار صاحب نہایت متانت سے گویا ہوئے۔ بھئی ہم کسی کی پٹی میں آنے والے ہیں نہ کسی کے جھانسے میں۔ ہمارے خیال میں تو جتنی چادر دیکھی جائے اتنے ہی پاؤں پھیلائے جائیں۔ ابھی لڑکے کی تعلیم و تربیت شادی بیاہ سب کچھ کرنا ہے۔ اسلئے اسراف سے کام لینا پہلے درجہ کی حماقت ہے۔ رسم ختنہ طریقہ سنت ہے۔ اس کو مزخرفات بنانا مناسب نہیں۔ ہمیں ملاجی کی رائے پسند ہے۔ حجام کی کٹوری میں ہمارے دوست احباب اگر چار چار آنے بھی ڈالیں گے تو دس روپے ہو جائیں گے۔ اسی قدر ہم اپنے پاس سے دیدینگے۔ حجام خوش ہو جائیگا اور تا صحت بچے کی پوری خدمت کریگا۔ دس روپے کے دمیدے (بڑے بتاسے) تقسیم کر دئے جائیں گے۔ حقہ پان کی تواضع حاضرین کی کر دی جائیگی۔ قریبی عزیزوں کے لئے ایک دیگ پلاؤ کی تیار کرالی گئی ہے۔ اور اپنے کارخانہ کے کاریگروں کو کھانا کھلا دیا جائیگا۔ اس طرح تیس چالیس روپیہ میں سب کام چل جائیگا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ

بعض منہ پھٹ کاریگروں نے منہ بگاڑ کر ایک منہ کو کہا کہ بس تاشے باجے اور راگ بوجھا۔ اس قدر فیاضی کی بھی کیا ضرورت ہے۔ زنانخانہ میں پردہ کرا کر اور حجام کو لیجا کر چپ چپاتے ختنہ کرا دیجئے۔ بس چھٹی ہوئی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی۔ مگر ہوشمند کارخانہ دار نے صاف کہدیا کہ "نکردن یک عیب و کردن صد عیب"۔ مرغی اپنی جان سے گئی اسکھانے والوں کو سواد نہ آیا۔ جو بجٹ میں نے تیار کر لیا ہے اس سے ذرہ بھر زیادہ نہ ہوگا۔ کاریگر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ مگر اسرار حسین نے اس کان سے سنا اُس کان سے اڑا دی۔

بعض گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے کاریگروں میں کانا پھوسی ہو کر یہ مشورہ ہوا کہ کل سے بطور احتجاج اسکے کارخانہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اور اسرار حسین کے کارخانہ میں اڈے جانے جائیں۔ عین ختنہ کے روز یہ فتنہ کھڑا کیا گیا۔ دوسرے روز یہ فتنہ پرداز بلا اسرار حسین کے کارخانہ میں وارد ہو گئے۔ اور کہا کہ آپ کے برادر معظم نے تو باپ دادا کا نام بھی ڈبو دیا۔ کلنک کا ٹیکہ لگا کر سارے شہر میں نکو بن گئے۔ ہم آپ کے شریک حال ہیں۔ خدارا آپ ہی اس کی تلافی کیجئے۔ ورنہ سارے خاندان کی ناک کٹی ہو جائے گی۔ فوراً منشی جی کو کانوں کان خبر کر کے مشورہ دیا گیا کہ بسم اللہ بی بی کا کن چھیدن نہایت شان و شوکت کے ساتھ کیا جائے۔ اور خوب خوب دل کے حوصلے نکالے جائیں۔ اسرار حسین اپنی تعریفیں سنکر کپّا سے پھول گئے۔ فوراً کن چھیدن کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ حجام و میراثی توید دینے کے لئے تعینات ہوئے۔ دروازہ پر نوبت رکھی گئی۔ کارخانہ اصطبل بھیت کو آدمی چاول خریدنے کے لئے بھیجے گئے۔ ارباب نشاط اور ہجڑوں کو سائیاں روانہ کی گئیں۔ اور باظہار دریا دلی روپیہ کنکر کر دیا گیا۔ بہت سا سامان کارخانہ دار صاحب کے اعتبار پر شہر میں محض رقعہ جات بھیجکر منگوایا گیا۔ الہ اللہ آمین سے تقریب کا آغاز ہوا۔ تین روز تک ناچ رنگ کی محفلیں گرم رہیں۔ پلاؤ۔ زردہ۔ بریانی۔ متنجن۔ شیرمال

باقرخانی۔ کباب۔ قورمہ وغیرہ سے سارے شہر کے کارخانہ داروں اور کاریگروں کی دعوت کی گئی۔ سارے شہر میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوئے۔ مگر بعد ختم تقریب جب حساب لگایا گیا تو جس قدر قیمت کا مال کارخانہ کے سٹاک میں موجود تھا اس سے پانچ ہزار زائد صرف ہو گیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ایک حادثہ اور پیش آیا۔ یعنی کارخانہ میں شب کو بھی کام ہوتا تھا۔ اور چھت میں ایک گیس کا ہنڈا روشن ہوا کرتا تھا وہ اتفاق سے پھٹ گیا۔ ایک کونہ میں مٹی کے تیل کا بھرا ہوا پیپہ (کنستر) رکھا ہوا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا سارے مکان میں آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔ کاریگر تو اپنی جان لیکر بھاگ نکلے مگر چھت میں آگ پہنچ گئی۔ اور نہ صرف سارا مکان ہی جلکر خاک سیاہ ہو گیا بلکہ تیار شدہ ہزارہا روپیہ کا مال بھی راکھ کے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ شہر کے قریب ہی دریائے رام گنگا کے کنارے بزرگوں کے وقت کی ایک ملک تھی۔ یکایک دریا میں سیلاب آیا۔ دریا کی دھار نے رخ بدلا۔ ساری کی ساری ملک دریا برد ہو گئی۔ قرضخواہوں نے رقعات کے ذریعہ سے نالشیں داغ دیں۔ کارخانہ کی زمین اور زنانہ مکان سب قرق ہو کر نیلام ہو گئے۔ اور ایک سنگدل ڈگری دار نے روپیہ نہ پٹنے کی وجہ سے دیوانی جیل میں کارخانہ دار صاحب کو بھجوا دیا۔ غریب احمدی کشاں کشاں مکان سے نکالی گئی۔ اور قریب ہی ایک چھپر کا گھر کرایہ پر لے کر جا پڑی۔ ایک ڈبہ زیور کا جس کو وہ اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے تھی باقی رہ گیا تھا۔ کسی بھیدی نے خبر دیدی چور چھپر اٹھا کر داخل ہوئے اور سینہ زوری سے وہ ڈبہ چھین کر لے گئے۔ اور دونوں ماں بیٹیاں بیک بینی و دو گوش فاقہ کشی کے لئے رہ گئیں۔

(۷)

کئی ماہ کے بعد دلدار حسین جیل سے چھوٹے تو فرطِ غیرت سے منہ دکھلانے کے قابل نہ تھے۔ یہ سوچکر کہ دیس چھوڑی نہ پردیس بھیک کہیں کو کالا منہ کر جا بیٹھا تہیہ کر بیٹھے۔ بی بی نے ہر چند کہا کہ دیس کی آدھی پردیس کی ساری سے بہتر ہے مگر ایک معزز کارخانہ دار نے کسی کو منہ دکھانا گوارا نہ کیا۔ اور کسی دوست سے کچھ قرض لیکر مین پوری کو روانہ ہو گئے۔ وہاں کے ایک نواب صاحب کے یہاں اکثر ان کے کارخانہ سے ظروف جایا کرتے تھے ان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے داستان غم سن کر براہ خدا ترسی اپنے بچہ کی سیپارہ خوانی کے لئے ان کو پانچ روپیہ ماہوار اور کھانے پر نوکر رکھ لیا۔ کھانا تو اس کے یہاں سے ملتا۔ عیدی بقر عیدی کے انعام میں کپڑے بنا لیتے۔ اور پانچ روپیہ بجنسہ بی بی کو بھیجدیتے۔ اس مہنگے سمے میں پانچ روپیہ میں کیا گزر ہو سکتی ہے۔ لہذا بیچاری احمدی دن بھر محلہ والوں اور کنبہ والوں پر شمسہ لگاتی۔ اور بسم اللہ پھولوں اور کانٹوں کی بھرائی کا کام کرتی۔ اس طرح پیٹ کے دوزخ کو بھرا جاتا۔

(۸)

مین پوری کے نواب صاحب کا بچہ سیانا ہو گیا۔ تو قرآن خوانی ترک کرا کر انگریزی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اور دلدار حسین کو اپنے زمرۂ مصاحبین میں شامل کر لیا گیا۔ رفتہ رفتہ رئیس کا اعتبار بڑھتا رہا۔ اور انجام یہ ہوا کہ اپنے داروغہ متوفی کی جگہ دلدار حسین کو داروغہ مقرر کیا گیا۔ اب کیا تھا پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ تمام سامان کی خرید فروخت بازار ہاٹ کا کام کاج دلدار حسین کو سپرد کیا گیا۔ فی روپیہ اکنی دستوری تو کھلے خزانے مقرر تھی۔ اور فی روپیہ تین آنہ خفیہ حق المحنت تھا۔ تنخواہ بھی اب تیس

روپیہ ماہوار ہوگئی۔ اور رئیس کے دسترخوان کے پلاؤ بھی بن گئے۔

گھر کو تو دلدار حسین صرف دس روپے ہی بھیجتے۔ باقی رقم لڑکی کی شادی کے خیال سے پس انداز کرتے تھے۔ مکان سے بی بی کا خط پہنچا کہ اب لڑکی سیانی اور بیاہنے کے قابل ہوگئی ہے۔ اور تمہارے بھائی صاحب اب ہم لوگوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ لڑکے کا بَر کسی اونچی جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ زمانہ نازک ہے جوان بیٹی کا گھر میں رکھنا گویا ہاتھی کا پالنا ہے۔ فوراً آئیے اور اس معاملہ کو طے کر جائیے۔ رئیس دیہات کے دورے اور خاصکر شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ دلدار حسین کو رات دن انتظار تھا کہ کب رئیس آئیں اور کب اجازت لیکر گھر جائیں۔ نواب صاحب شوقین مزاج تھے۔ گھوڑے۔ کتے۔ کبوتر۔ مرغ۔ بیٹر۔ تیتر۔ طوطا۔ مینا کے علاوہ ایک بندریا بھی پال رکھی تھی جو ان سے بہت مانوس تھی۔ خدا خدا کرکے رئیس تشریف لائے۔ بندوق بھری ہوئی چوکی پر رکھ دی۔ اور خود ایک کرسی پر بیٹھکر اخبار بینی میں مصروف ہوگئے۔ بندریا قریب ہی زنجیر میں بندھی ہوئی تھی۔ وہ اچھلکر رئیس کی گود میں بیٹھ گئی۔ اب اس کو دلدار حسین کی حماقت سمجھئے یا نوشتۂ تقدیر کہ ان کو یہ نہ سوجھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے۔ بندریا کو ڈرانے کے لئے بندوق چھتیائی اتفاقیہ بندوق چل گئی۔ رئیس کا ناف سے لیکر زانو تک کا حصہ جسم مع بندریا کے ریزہ ریزہ ہوگیا۔ ایک دردناک آواز "اف مار ڈالا" رئیس کے منہ سے نکلی اور کرسی سے زمین پر گرتے ہی جان دیدی۔ تمام نوکر چاکر ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ دلدار حسین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ حالتِ از خود رفتگی میں حویلی میں گھسکر بیگم صاحبہ کے قدموں پر گر گئے۔ اور فریاد و زاری کرنے لگے۔ بیگم صاحبہ کا دل کچھ تو آپ کی آہ و بکا سے موم ہوا اور کچھ نواب صاحب کی بے رخی اور بے اعتدالیوں سے تنگ آگئی تھیں۔ اور پہلے ہی سے دلدار حسین کے خوشنما چہرے اور سڈول جسم پر ریجھی ہوئی تھیں۔ بظاہر مغموم مگر دل میں خوش ہوئیں۔ پولیس فوراً موقع پر آدھمکی۔ جو کچھ دلدار حسین کا پس انداز سرمایہ تھا وہ تحقیقات کنندہ کے نیگ لگا۔ کچھ بیگم صاحبہ نے بھی خفیہ طور پر پیشکش کیا۔ اور مرگ اتفاقیہ لکھا دیا گیا۔ چالاک سب انسپکٹر پولیس نے چالان تو کر دیا۔ مگر قتل عمد کی الزام سے بَری رکھا۔ عرصہ دراز کی کشاکشی کے بعد بے احتیاطی کے الزام میں دو سال کی قید سخت کا حکم ہوگیا۔

(۹)

احمدی کو جب نواب صاحب کے مرگ ناگہانی کی خبر ملی تو اس نے سر پیٹ لیا اور سمجھ لیا کہ اب شوہر کا بچنا بھی امر محال ہے۔ ضرور تختۂ دار پر لٹکایا جائیگا۔ غریب نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ صدمۂ جانکاہ سے پہلے بخار چڑھا۔ پھر سرسام ہوگیا۔ اور شوہر کے دوران مقدمہ ہی میں جسم جلی بسم اللہ کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ کر جنت الفردوس کی راہ لی۔ محمدی کو بہن کی بیکسی کی موت اور نامراد بسم اللہ کے حال زار پر رحم آیا۔ شوہر کی منت سماجت کرکے تجہیز و تکفین کرائی۔ اور بسم اللہ کو اپنے گھر بلا لیا۔ اسی زمانہ میں ضلع ایٹہ کے رہنے والے ڈپٹی صاحب مراد آباد میں ڈپٹی کلکٹری پر تبدیل ہو کر تشریف لائے جو اپنے خویش عزیزوں سے تنگ آکر ترک سکونت کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ اسرار حسین کے قریب ہی ایک کوٹھے میں مقروض رئیس کی

صفر کی جائیداد اور ایک عالی شان مکان نیلام ہو رہے تھے ڈپٹی صاحب نے کل جائیداد اور مکان خرید لئے۔ اور یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ ڈپٹی صاحب کا صرف ایک فرزند تھا جو فوج میں رسالدار میجر تھا۔ مگر جنگ عظیم میں جاں بحق ہو چکا تھا۔ اس کی صرف ایک دختر تھی جس کی عمر قریب چودہ پندرہ سال کی تھی۔ ڈپٹی صاحب پنشن لے چکے تھے اور چونکہ عمر عزیز کا بڑا حصہ تمام کر چکے تھے انہیں اپنے زمانہ حیات میں اس لڑکی کے فرض سے ادا ہونے کی فکر شدید تھی۔ اسرار حسین کو جب یہ حال معلوم ہوا۔ تو موقع اچھا سمجھ کر فوراً نثار حسین کے لئے پیام دیدیا گیا۔ جس پر ڈپٹی صاحب نے غور و خوض کے بعد جواب دینے کا وعدہ کیا اور تا فیصلہ اس معاملہ کو پردہ راز میں رکھنے کی تاکید کی گئی۔

(۱۰)

بسم اللہ جب اپنی خالہ کے یہاں آئی تو اس کی عمر بھی پندرہ سال کی ہو چکی تھی۔ شباب کی امنگیں، جوانی کے ولولے اور جذبات کی پردہ پوشی سے قاصر تھے۔ حسن صورت صانع قدرت نے روز ازل سے اس کو ودیعت فرمایا تھا۔ چڑھتی جوانی نے اور سونے میں سہاگہ کا کام کیا۔ اور میاں نثار حسین جو پہلے ہی صرف بھائی نثار تھے اب جان نثار بن گئے۔

نثار حسین کا مردانہ حسن، مذہبی پن۔ دلکش انداز نے غریب بسم اللہ کو بھی جان و دل سے فریفتہ کر دیا۔ پہلے پہلے کچھ وضع کا خیال اور کچھ فطری حجاب نظروں سے نظریں ملانے کا مانع رہا۔ کن انکھیاں یا نگاہ غلط انداز ہی جذبات باطنی کی ترجمانی کرتی رہی۔ مگر رفتہ رفتہ نگاہیں ۔۔ اور ایک دوسرے کے پار ہونے لگیں۔ دلوں کی بیٹریاں نگاہوں کے تار کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو حرارت پہنچانے لگیں۔ سرد آہوں کے ناوک دونوں طرف سے چلنے لگے۔ اور عشق کا دیوتا کیوپڈ تاک تاک کر دونوں کے دلوں میں عشق کے تیر پیوست کرنے لگا۔ چونکہ دونوں ایک ہی تیر کے مجروح تھے۔ دونوں میں ہمدردی اور ہم آہنگی ہونا لازمی امر تھا۔ اسلئے تنہائی کے موقعوں میں راز و نیاز کی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جس کا انجام باہمی عہد و پیمان محبت کی صورت میں ختم ہوا۔ ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا۔ کلام پاک درمیان میں لایا گیا۔ اور ایک نے دوسرے کی عزیز ترین جان کی قسم کھائی۔ آئندہ کے نوشتہ تقدیر کا غایت بے صبری کے ساتھ انتظار ہونے لگا۔

(۱۱)

ڈپٹی صاحب کے رشتہ کے فرزند کا اسکی پوتی کے لئے قائم گنج سے پیام آیا جس کی پشت پر سارا خاندان سفارشی تھا۔ چونکہ لڑکا شرابخوار۔ آوارہ منش اور جاہل مطلق تھا۔ اس لئے ڈپٹی صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور اسرار حسین کو بلا کر فوراً ان کی درخواست کو نہ صرف شرف قبولیت بخشا۔ بلکہ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا۔ فوراً سامان شادی ہونے لگا۔ شادیانے بجنے لگے۔ مطلا و مذہب رقعہ جات شادی چھپوائے گئے۔ باہر ڈاک کے ذریعہ سے روانہ ہوئے۔ اور شہر میں فہرست کے ذریعہ تقسیم ہونا شروع ہو گئے۔ شادی سے دو روز دلہن کا جوڑا ڈپٹی صاحب کے یہاں روانہ کیا گیا۔ اور وہاں سے دولہا کا جوڑا۔ اور مانجھے کے کپڑے مع مہندی و

اُبٹن کے آئے۔ نثار حسین نے اپنے باپ سے تو بخیال سعادت مندی و ناخوشی پدر کچھ نہ کہا۔ مگر ماں کی بہت منت سماجت کی۔ اور اس شادی سے انکار کیا۔ مگر وقت گذر چکا تھا۔ کوئی تدبیر نہ چل سکی۔ ماں کے اصرار سے مجبور ہو کر اُبٹن ملوایا مہندی ہاتھ پاؤں میں لگائی۔ اور مانجھے کا لباس زیب بدن کیا۔ گھر والے تو شادی کے انصرام میں مصروف تھے۔ نثار کوٹھے پر جا کر اپنے کمرہ میں لیٹ کر رونے لگا۔ بسم اللہ بھی موقع پا کر جا پہنچی۔ ایک آہ سرد بھر کر اس کے قدموں پر گر گئی۔ رو رو کر اور آنسوؤں سے منہ دھو دھو کر عہد و پیمان مودت کی یاددہانی کرنے لگی۔ اور اپنی جان دینے کے لئے کوٹھے سے گرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ نثار نے موقع کی نزاکت کا خیال کر کے اس کو اُٹھا کر آنسو اپنے رومال سے پونچھے۔ اور کہا کہ میں اپنے عہد پر بدستور قایم ہوں۔ ماں باپ نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ مگر ہماری باہمی ولی الفت کا رشتہ ایسا مستحکم ہے کہ اس کو کوئی زبردست سے زبردست ہاتھ بھی توڑ نہیں سکتا۔ تم اس وقت جاؤ۔ رات کو آدھی رات کے وقت آنا۔ میں ایسی تدبیر بتاؤں گا۔ کہ ہماری تمہاری محبت دوامی اور غیر متزلزل ہو جائے گی۔ اور پھر اس کو جدائی اور تفرقہ کا کوئی اندیشہ ہی نہ رہے گا۔ ایک شاطر کنیز نے پٹ کی آڑ سے سب باتیں سنیں۔ مگر کمبخت نے محمدی سے فوراً اس کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ شب کے وقت کی کارروائی کا بھی انتظار کیا۔ اور مہمانوں کی وجہ سے محمدی تنہا بھی نہ مل سکی۔

(۱۲)

ٹھیک آدھی رات کو جبکہ بساط زمین پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور فضائے آسمانی پر سکون تھی اہل دنیا خواب راحت میں مصروف تھے۔ بسم اللہ نے سر اُٹھا کر ماحول پر نظر ڈالی۔ ہر طرف سکوت مرگ پایا۔ وہ شاطر کنیز بھی جو بسم اللہ کے قریب ہی لیٹی ہوئی تھوڑی دیر پہلے تک کروٹیں بدل رہی تھی دن بھر کے کام کاج کے تکان کی وجہ سے سو گئی۔ بسم اللہ آہستہ سے بستر سے اُٹھی۔ اور سانس روکے ہوئے دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ گئی۔ اب جو کچھ واقعات وہاں پیش آئے ان کا کوئی عینی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے کچھ پتہ نہ چلا۔ صبح کو محمدی نے بسم اللہ کا بستر خالی پا کر تھوڑی دیر حوائج ضروری کا خیال کر کے انتظار کیا۔ مگر جب بہت دیر ہو گئی تو تلاش شروع ہوئی۔ چونکہ دونوں کے اطوار و عادات کے تبادلہ سے کچھ اور وہم بھی تھا۔ اس لئے محمدی خود تنہا کوٹھے پر گئی۔ تو وہاں کچھ اور ہی صورت نظر آئی۔ دیکھا دونوں کی سرد شدہ لاشیں باہم لپٹی ہوئی ہیں۔ ایک رسی دونوں کی کمر میں بندھی ہوئی ہے۔ (جو غالباً اس احتیاط سے باندھی ہو کہ جاں کنی کا کرب ایک کو دوسرے سے جدا نہ کر دے) پاس ہی ایک کھرل جس میں کچھ سفوف سا پیسا گیا تھا پڑا ہوا تھا۔ شادی کے جوڑے کے ساتھ جو ہیرا جڑی ہوئی طلائی انگشتری آئی تھی فرش پر پڑی تھی۔ مگر اس کا ہیرا ندارد تھا۔ دونوں کے منہ پر ایک بدبودار دوا ملا ہوا رومال پڑا تھا۔ (جس میں غالباً کلوروفارم چھڑک کر اس غرض سے منہ پر ڈالا گیا تھا۔ کہ حالت بیہوشی میں ہی کام تمام ہو جائے۔ اور سکرات موت کی تکلیف محسوس نہ ہو) غریب محمدی بدحواس ہو کر بے تحاشہ خسر کو خبر کرنے بھاگی۔ پہلی ہی سیڑھی پر پاؤں ڈگمگایا۔ لڑھکتی ہوئی نیچے آئی ماتھا سر و سینہ کے سب سے نیچے کے پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ ہنوز ڈاکٹر آنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ بیٹے اور بہو

کی روح کے ساتھ عالمِ ارواح کو روانہ ہو گئی۔ خوشی کے گھر میں شورِ قیامت بپا ہو گیا۔ دم بھر میں بجلی کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ زینب احمدی کی برابر محمدی کو اور نثار کے برابر بسم اللہ کو دفن کیا گیا۔ اور چاروں قبریں ایک ہی چبوترہ میں بنائی گئیں۔ کسی دل جلے نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر نثار اور بسم اللہ کی قبروں کے درمیان یہ شعر لکھ کر ایک تختی پر لگا دیا ؎

پھر وہی کلفتِ ازدیاد میں -
پھر وہی قبرِ یار پہلو میں -

نیچے کو حسبِ اتفاق راقم الحروف کا اس طرف سے گذر ہوا تو بالائے شعر بطور عنوان یہ فقرہ تاریخی پنسل سے لکھدیا ؎

کشتگانِ بے نیازئ عشق
۱۳۵۱ھ

ایک دلچسپ حقیقت

(جناب سید ولی اشرف صاحب جنرل پوسٹ آفس دہلی)

حکایت ہے کہ لقمان حکیم کے پاس اول مرتبہ "عقل" آئی۔ پوچھا تو کون ہے، اور کہاں رہتی ہے؟ جواب دیا کہ میں عقل ہوں۔ اور سر میں رہتی ہوں۔ دوسری مرتبہ "شرم" آئی۔ پوچھا تو کون ہے؟ جواب دیا میں "شرم" ہوں۔ فرمایا کہاں رہتی ہے؟ کہا زیرِ چشم۔ تیسری مرتبہ "محبت" آئی۔ دریافت کیا تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ جواب دیا میں محبت ہوں اور دل میں رہتی ہوں۔ چوتھی مرتبہ "تقدیر" آئی۔ پوچھا تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ جواب دیا تقدیر ہوں اور سر میں رہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا وہاں تو عقل رہتی ہے۔ جواب دیا جب تقدیر آتی ہے تو عقل پہلے ہی رخصت ہو جاتی ہے۔ پانچویں مرتبہ "عشق" آیا۔ دریافت کیا تو کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ جواب دیا کہ میں "عشق" ہوں اور آنکھوں میں رہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ وہاں تو شرم رہتی ہے۔ جواب دیا کہ عشق آتا ہے تو شرم اٹھ جاتی ہے۔ چھٹی مرتبہ "طمع" آئی۔ پوچھا تو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟ کہا میں طمع ہوں۔ اور دل میں رہتی ہوں۔ فرمایا اس جگہ تو محبت ہے۔ کہا جب طمع آتی ہے۔ تو محبت اٹھ جاتی ہے۔

احسن الکلام!

(جناب پروفیسر احسن مارہروی مدظلہ العالی)

عاشقی میں کیا بتاؤں کیا کیا — عمر بھر تقدیر کو رویا کیا
جی اٹھا دیکھی جو شرم آگیں وہ آنکھ — مجھکو اک بیمار نے اچھا کیا
کوئی کرتا کیونکر اس پر اعتراض — تھا وہ خود مختار جو چاہا کیا
قتل کے بعد اس نے ٹھکرایا مجھے — جان بھی لی حشر بھی برپا کیا
اور کیا کرتا دل مجروح ناز — جس قدر تڑپا گیا تڑپا کیا
شکوہ اے دل - اور پھر معشوق سے — عشق پھر کیسا اگر ایسا کیا
مجھ پر اعجاز تصور کھل گیا — بند آنکھوں سے انھیں دیکھا کیا
ان کے درباں کو بلا کر خوش ہوں میں — دشمنوں میں دوست اک پیدا کیا
کر گئے دنیا میں سب کچھ اہل کار — میں نکما وقت ہی کھویا کیا

باعث بدنامی احسن نہ پوچھ
نیک نامی نے اسے رسوا کیا

خان صاحب میر کریم بخش خان

(از ابو الکیف کیفی سرحدی)

خان صاحب میر کریم بخش خان انسپکٹر آف ورنیکولر ایجوکیشن شمالمغربی صوبہ سرحد۔ سرزمین سرحد کی ان مایہ ناز ہستیوں میں سے ہیں۔ جو اپنی دلی سچائی اور حقیقی مقصد کے لئے مشہور ہیں۔ خان صاحب اس صوبہ کی پرائمری تعلیم کے موجد کی حیثیت سے بہت معروف ہیں۔

انسپکٹر آف ورنیکلر ایجوکیشن کے لحاظ سے آپ کا اسم گرامی ۱۹۲۵ء سے تقریباً ۱۵ ہائی سکول ۴۰۰ پرائمری اور مڈل سکولوں کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ اپنے ہموطنوں کی حالت بذریعہ تعلیم بہتر بنانے میں آپ کی ہمت عالیہ اور مساعی جمیلہ تشریح طلب نہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے وہ ریویو جو وقتاً فوقتاً ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ پر لکھے جاتے ہیں۔ اس بات پر شاہد ہیں کہ "میر صاحب اپنے صوبہ کے متعلق علم وسیع اور بہترین کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنا کام نہایت خوبی سے سرانجام دیتے رہے ہیں۔ باوجودیکہ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ انسپکٹر آف ورنیکلر ایجوکیشن کا کام بہت مشکل ہے" تاہم یہ ان متعدد خراجہائے تحسین میں سے ایک خراج ہے۔ جو بڑی بڑی ذمہ دار ہستیوں کی طرف سے آپ کو ملا ہے۔

وسعت تجربہ

آپ کی وسیع لیاقت اور تجربہ کا اعتراف بحیثیت ایک علم دوست اور منتظم ہونے کے بلا شک وشبہ کیا گیا ہے۔ جس عہدہ پر بھی آپ متعین کئے گئے ہیں۔ آپ نے اپنی اہلیت اور ذاتی قابلیت کا خاطرخواہ ثبوت دیا ہے۔ آپ کے دلی اور دماغی اوصاف حمیدہ ہی آپ کے حصول ترقی کا باعث ہیں۔ اور اس بات پر اظہار افتخار بیجا نہ ہوگا کہ آپ کے سی سالہ ملازمت کے عرصہ میں ہمیشہ ہی ترقی کے وقت نظر انتخاب آپ ہی پر پڑتی رہی ہے۔ جہاں تمغۂ بزرگی کے عوض حقیقی قابلیت پیش نظر ہوتی ہے۔ کامیابی کا سہرا ہمیشہ آپ کے ہی سر بندھا جاتا رہا ہے۔

عہدۂ انسپکٹر آف ورنیکلر ایجوکیشن ۱۹۲۵ء سے پیشتر آپ دس سال سے زیادہ ڈی۔ پی۔ آئی کے ذاتی معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ جس عرصہ میں متعلقہ حکام نے تعلیمی معاملات میں آپ کی آراء کو بہت پسند کیا ہے۔ اس تجربہ نے جو آپ نے یہاں چھ ڈائرکٹران سے تعلقات کے باعث حاصل کیا ان کو انسپکٹری کے عہدہ کے قابل بنا دیا۔ جہاں سے صرف دوسرا ہی قدم تعلیمی مسند پر پہنچا دیتا ہے۔ جس کو گذشتہ دوسال کے عرصہ میں آپ نے دو دفعہ زینت بخشی۔



خانصاحب صدر کریم بخش خان - پی - ای - ایس - آئی - وی - ای
شمال مغربی صوبہ سرحد ۔

آپ کے متعلق سرکاری بیان ہے کہ آپ نے صوبہ سرحد کے تقریباً آٹھ ڈی۔ پی۔ آئی۔ کے درمیان زنجیر کی کڑی کا کام دیا ہے۔ اور بحیثیت ڈی۔ پی۔ آئی کا ذاتی معاون ہونے کے کام بہت خوبی اور خوشنودی سے سرانجام دیا ہے۔

آپ کا صبر اور کام کرنے کا دلی شوق اور صحیح اور غلط میں امتیاز کرنیکی محنت بے نظیر ہے۔ آپ کی دلی سخاوت۔ حسیات کی سچائی اور ہر معاملہ میں راست روی نے تعلیمی دایرہ میں آپ کیلئے ایک ابدی نام پیدا کر دیا ہے جس کو زمانہ کبھی بھی مٹا نہیں سکتا۔

خان صاحب کو (وہ اعزاز حاصل کرنے سے پیشتر جو آج آپ کے نام کو مزیب کر رہے ہیں) راہ پُرخار پر بھی چلنا پڑا تھا جو سنگہا ئے توکدار بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ محکمہ تعلیم میں سنی ۳۵ سالہ خدمات کے دوران میں آپ کو بہت سی مشکلات عظیم کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا مقابلہ آپ نے جرأت اور دلیری سے کیا۔ یہ وہ خواص ہیں جو ایک نرم دل اور سنس مکھ انسان کا خاصہ ہیں۔

اگرچہ خان صاحب میر کریم بخش خان زینے کے سب سے نچلے ڈنڈے یعنی ۱۹۰۷ء میں مڈل سکول کی ہیڈ ماسٹری سے اب محکمہ تعلیم میں اعلیٰ ترین عہدہ پر متمکن ہیں۔ نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ایک گریجویٹ بھی نہیں۔ لیکن جیسا کہ جانسن نے کہا ہے: "بڑے آدمی شاذونادر ہی کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوا کرتے ہیں"۔

خان صاحب میر کریم بخش خان کئی دفعہ ڈی۔ پی۔ آئی کے عہدۂ جلیلہ پر بھی عارضی طور پر فائز ہوئے ہیں۔ علمی دائرہ میں آپ کی ذہانت کافی شہرت یافتہ ہے۔ تعلیمی معاملات میں آپ کے لاانتہاہی شوق کی سب نے ستائیش کی ہے۔

آپ علاوہ دیگر زبانوں کے اردو زبان سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور زبان اردو کے ہر سچے خادم کی ہر ممکن صورت سے آپ امداد فرماتے ہیں۔ خصوصاً صوبہ سرحد کے واحد علمی و ادبی مجلہ سفیر سخن کے ساتھ آپ کو جو دلچسپی ہے۔ وہ آپ کی سخن پروری اور علم نوازی کی بین دلیل ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم علم و ادب کے اس سچے راہنما کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

رباعیات

(ابو نعیم نشتر جالندھری)

اے دل! اس کا کرم ہے دریا دریا دامن کر دے دراز صحرا صحرا
جب دوست ہے تیرا، تو جہاں تیرا ہے پھر کوچۂ غیر میں نہ مارا مارا

بے کیف خودی میں زندگی ہے ساقی! وہ لا تری آنکھوں میں ہے جو شے ساقی!
بیخود ہوتے ہی باخدا ہو جاؤں دی ایسی مے ہوش ربا۔ اے ساقی!

ساحل پہ رہیگا محفل آرا کب تک طوفاں کا دور سے نظارا کب تک
گوہر کی تلاش ہے تو منجدھار میں آ گرداب و نہنگ سے کنارا کب تک

اے دشت نورد! عشق میں وہی کامل ہے ہر غول جسے راہبر منزل ہے
وہ دیکھ غبار سا جو آتا ہے نظر خوش ہو تری لیلا کا یہی محمل ہے

جوہر نہ مقابلے میں کھلتے دیکھے اس رنج میں باکمال گھلتے دیکھے
کیسی ناقدرداں ہے دنیا نشتر کانٹوں کے ساتھ پھول تلتے دیکھے

قوتِ عمل!

(برکات خامہ سبحان الہند حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی دام فیضہ)

(۱)

فلک پر مہر کا - بادل کے پردے سے عیاں ہونا / دکھا دیتا ہے دنیا کو عمل کا کامراں ہونا
بھڑک اٹھتی ہے آتش چھیڑنے سے سنگ خارا کے / عمل کا حسن ہے اس رنگ میں آتش بجاں ہونا
نکل آتا ہے دانہ، چیر کر پہلوئے خاکی کو / نمو کی قوتیں، رودِ عمل کا ہے عیاں ہونا
بساطِ خار و چوبِ خشک میں ہے برق سامانی / یہ اُن کا شعلہ بننا اور شعلے کا دھواں ہونا
عمل کا ہاتھ ہے پانی کو جو بجلی بناتا ہے / اسی سے خاک کو آیا غبارِ کارواں ہونا
یہ بادل کیا ہے شکلِ اجتماعِ آب و ذرّہ ہے / یہ بارش کیا ہے؟ دریائے عمل کا ہے رواں ہونا
زمیں کا ذرّہ ذرہ سوئے گردوں اُٹھ کے کہتا ہے / عمل نے کر دیا آساں - زمیں کا آسماں ہونا
عمل کی شکل سچ پوچھو تو اصلِ زندگانی ہے / قضا کہتے ہیں جس کو، ہے اسی کا رائیگاں ہونا
زمیں سے تا بہ گردوں جو ہے وہ نخچیر ہے اس کا / عمل بھی تیر ہے جو عزم کو آئے کماں ہونا

عمل سکہ ہے وہ رائج ہے جو اقلیمِ ہستی میں!
چلا کرتا ہے یہ یکساں بلندی اور پستی میں

(۲)

عمل ہے جوشِ ایماں میں، عمل شوقِ عبادت میں / اسی کی مفلسی ہے معصیت، حکمِ شریعت میں
اسی کو کھو کے انساں، عاجز و ناچار ہوتا ہے / اسی کو پا کے پورا جوش آجاتا ہے ہمت میں
یہی دنیا کا سرمایہ، یہی عقبےٰ کا حاصل ہے / عمل کی رہبری دنیا سے لیجائیگی جنت میں
جمود اس کا ہے گویا خودکشی عزمِ انسانی / اسی کی ہوگی پرسش پہلے ہنگامِ قیامت میں

عمل رکھا ہے جس کا نام ہستی کی نشانی ہے
عمل کا ترک کرنا گویا، ترکِ زندگانی ہے

(۳)

ہوئے صدیقِ اکبر جب خلیفہ بعدِ پیغمبر — محلے کے جو بچے تھے لگے کہنے قریب آکر
ہماری بکریوں کا دودھ تو اب تم نہ دوہوگے — تمہیں فرصت ملیگی کب کہ آؤگے ہمارے گھر
یہ فرمایا کہ بچو! اب بھی میں حاضر ہوں خدمت کو — یکایک دوہنے میں ہوگئے مصروف یہ کہہ کر
ادھر جو کام تھا وہ آپ ہی انجام دیتے تھے — خلافت کا ادھر بارِ گراں رکھا ہوا سر پر
عبادت بھی، ریاضت بھی، خلافت بھی، عدالت بھی — غرض حسنِ عمل سے دین و دنیا تھے بہم یکسر
پھر اس کے بعد آیا دَور جب فاروقِ اعظم کا — زمانہ نے وہ دیکھا جو نہ دیکھا زندگانی بھر
صحابی جس قدر تھے دَور میں عہدِ نبوت کے — وہ سرتاپا عمل تھے پائے بندِ حکمِ پیغمبر!
وہی قاضی، وہی حاکم، وہی خادم، وہی آقا — وہی ادنیٰ سپاہی بھی، وہی جنرل وہی افسر
یہی مدِ عمل بنیاد تھی اسلام مسلم کی — یہی وہ شے تھی جس کی دھاک بیٹھی تھی زمانے پر

مگر اب مٹ رہا ہے دہر سے وہ نام مسلم کا
کٹا کر دست و پا کو بیٹھنا ہے کام مسلم کا

(۴)

عمل کے جوش کی تحریک ہے جو کچھ ہے قرآں میں — یہی بود مسلماں میں، یہی ہے ہست ایماں میں
یہی قولِ نبی بن کر حدیثوں میں بھی آیا ہے — اسی کی روشنی پھیلی ہے مذہب کے شبستاں میں
اوامر میں جہاں، جوشِ عمل کی وہ شہادت ہے — نواہی جس جگہ ہیں راز ہے یہ ان کے عنواں میں
کہ خود ترکِ خطا، حسنِ عمل کی ایک صورت ہے — بڑی یہ چیز بھی ہے، دامنِ دینِ مسلماں میں

جہاں میں سب سے بڑھ کر قوت عزمِ مسلماں ہے
جو ہو زورِ عمل کیفی۔ تو اصلی دین و ایماں ہے

مغنّیہ

(از محترمہ زبیدہ سلطانہ احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب اردو لاہور)

آغاز بہار تھا۔ اور جسم کی رگوں میں خون تک منجمد کر دینے والے موسم سرما کی ستم ظریفیوں کو لوگ فراموش کر رہے تھے۔ اب ہوا میں وہ ناقابل برداشت تلخی اور جگر خراش تیزی باقی نہ رہی تھی۔ باد بہاری کے میٹھے میٹھے نرم و نازک جھونکے مرجھا مرجھائی ہوئی سی خوابیدہ فضا میں ایک شگفتگی اور بیداری پیدا کر رہے تھے۔ چاروں طرف ایک زندگی سی پھیل رہی تھی ——— ایک روح افزا تازگی ——— شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ غنچے چٹک رہے تھے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا نظر آتا تھا ——— اُف! کائنات کے ہر ذرّے پر بہار کی دلفریبیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہر متنفس اپنے اندر جذبۂ م کی ایک نئی روح محسوس کرتا تھا۔

آمد بہار کی خوشی میں ایک دن کالج کی لڑکیوں نے ملکر ایک چھوٹی سی محفل طرب قایم کی۔ چاے کے بعد ہم سب کالج کے خوشنما پارک میں سرخ گلاب سے لدی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان سبز سبز گھاس پر جا بیٹھے۔ لڑکیاں باری باری گانے اور باجے ستار۔ وائلین وغیرہ بجانے لگیں۔ ہم سب کچھ بہت ہی زیادہ مسرور تھیں ——— آہ موسم بہار کی وہ شفق آلود شام وہ دلکش نغموں سے بھری ہوئی معطر فضا! اور پھر شفق کی سرخی میں نہائی ہوئی، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں عجب ہی کیفیت پیدا کر رہی تھیں ——— تازہ پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ہلکے ہلکے خوشنما رنگوں کی ساڑ میں لڑکیاں موسم بہار کی خوبصورت تتلیاں معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس پر پیاری یہ چھوٹی سی محفلِ سرود اور بھی لطف پیدا کر رہی تھی۔ آپ خیال فرماویں! ایسے پر مسرت موقع پر کسی پژمردہ سے چہرے کا نظر آجانا بھی کس قدر بے لطفی کا باعث ہو سکتا ہے۔

وہ دُبلے پتلے جسم کی میانہ قامت بڑھیا اچانک گلاب کے ایک گھنے پودے کے عقب سے نمودار ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھی۔ اسکے پتلے پتلے اور زرد ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا گویا امید کر رہی ہے کہ ہم لوگ نہایت خوشی سے اس کا خیر مقدم کریں گے ——— مگر اس مفلوک الحال بڑھیا کی شکل دیکھتے ہی سب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بھلا ایک بشاش پارٹی میں اس مضمحل سی بھکارن کا کیا کام؟ اف! اس کے آنے سے سارا لطف خاک میں مل گیا ——— گو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی حالت ظاہر کر رہی تھی۔ کہ زمانہ کی گردشوں نے بیچاری کو بری طرح پیس ڈالا ہے ——— مگر تاہم چشم بینا اس کے مرجھائے ہوئے شکن آلود چہرے سے اب بھی اس کے حسن رفتہ کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں جن کے گرداب بڑے بڑے

حلقے نمودار تھے۔ اپنی کھوئی ہوئی خوبصورتی کی بجھی ہوئی سی تصویر تھی۔ اسکی پیشانی کی کشادگی میں کچھ اب بھی ایک قسم کی دلکشی اور آنکھوں میں کچھ عجیب پُر اسرار چیز تھی جو دیکھنے والے کے دل میں بے اختیار یہ خیال پیدا کر دیتی تھی کہ کبھی اسکی قسمت کا ستارہ بھی آسمانِ امارت کی بلندیوں پر درخشاں ہو کر کئی تیرہ بختیوں پر چشمک زنی کیا کرتا ہوگا ــــــ ــــــ اس وقت اس کا جو لیا لباس میلا اور پھٹا ہوا تھا۔ گلے میں ملا ہی اور چادر کے نیچے بغل میں کوئی چیز دبائی ہوئی تھی۔ شاید تمام سردیوں میں ننگے پیر پھرنے کے باعث اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں پھٹے ہوئے تھے۔ اور پھر اس پھٹی ہوئی مردہ کھال میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ وہ ہمارے قریب پہنچکر رُک گئی۔ جتنی دیر میں میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ اتنی ہی دیر میں لڑکیوں کے چہروں سے اس نے بھی بھانپ لیا۔ کہ اس کا آنا انھیں ناگوار ہوا ہے ــــــ اس کا تبسم چہرہ رفتہ رفتہ ملول ہو گیا۔ آنکھوں سے وہ معصومانہ چمک غایب ہو گئی۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ گویا اپنی حماقت پر نادم ہو رہی ہے۔ پھر اس نے مایوسی سے ہماری طرف دیکھا۔ اور کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کی مجبوری عرضداشت ایک دلخراش آہ تھی اور بس ــــــ وہ بغیر کچھ کہے واپس مڑی۔ اور تیز مگر ڈگمگاتی ہوئی رفتار سے قدم اٹھاتی ہوئی بورڈنگ کے دروازے کی طرف چل دی۔

اس کے چلے جانے کے بعد ہمارے مسرور جمگھٹے پر ایک اداسی جیسی چھا گئی۔ اگرچہ فوراً ہی پھر ستار پر وہی دلکش نغمہ جو مغنیہ کے آنے سے بیشتر شروع تھا۔ چھیڑ دیا گیا۔ مگر اب اس میں وہ مسرت کی لہر نہ تھی۔ جو دل کو خوشی اور سرور سے بھر دے۔ مجھے تو اب ستار کی آواز میں کسی مصیبت زدہ کی درد بھری فریاد سنائی دے رہی تھی ــــــ الٰہی توبہ! میرا دل بُری طرح بیٹھا جا رہا تھا۔ اور پھر ستار کی آواز مجھے اور بھی بیقرار کر رہی تھی۔ میں نے سب لڑکیوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور مجھے سب کے چہرے اداس نظر آئے۔ جمیلہ اور بلقیس سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ بھی آزردہ سی معلوم ہوتی تھیں۔ جمیلہ گھور گھور کے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور شاید میرے قلبی اضطراب کا اندازہ کرنا چاہتی تھی ــــــ میں سوچ رہی تھی۔

"آہ! یہ آفت رسیدہ لوگ جو مال و زر سے محروم ہیں۔ کیا حیوان سمجھے جاتے ہیں؟ ان کے جذبات کی کوئی قدر نہیں کرتا؟ اگر یہ اہلِ غنا کی خوشیوں میں شریک ہونے کے قابل نہیں۔ تو کیا اتنی رعایت کے مستحق بھی نہیں کہ وہ دور سے ان کی بزمِ طرب کی ایک جھلک دیکھکر چند لمحوں کے واسطے اپنے غم کو فراموش کر سکیں؟ ــــــ آہ خدایا! ہم کیوں غریبوں سے اس طرح نفرت کرتے ہیں۔ گویا وہ ہمارے مرتبۂ انسانیت کے لئے ایک خوفناک لعنت ہے۔ یا ہمارے مایۂ زندگی کے لئے کوئی مہلک وبا؟

صرف دولت کی کمی انسان کو اس قدر حقیر اور قابلِ نفرت بنا دے؟ کیسی تعجب کی بات! یعنی انسانیت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ دولت اور صرف دولت! دولت کے بغیر انسان کی کوئی خوبی قابلِ قدر نہیں۔ ہمارے ملنے والوں میں جو شخص خود ہم سے زیادہ خوش پوش ہو ہم اسی کی طرف زیادہ ملتفت ہوتے ہیں! باطنی صفات سے مزین مگر مفلس سوسائٹی میں بھی دخل نہیں پا سکتا۔ اور ایک نا اہل مگر دولتمند شخص کے واسطے خود بخود تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور ہر طرف اس کا خیر مقدم

ہوتا ہے ——— آہ انسان! ——— انسان! خود غرض، نام و نمود پہ مرنے والا۔ ظاہری شان و شوکت کا متوالا انسان!! ———

"تو جمیلہ اسی بڑھیا کو پھر لئے چلی آرہی ہیں؟ ——— کسی لڑکی کے ان الفاظ نے میرے سلسلۂ خیالات کو منقطع کر دیا۔ میں نے دیکھا تو جمیلہ سچ مچ اسی بڑھیا کا ہاتھ پکڑے چلی آرہی تھیں ——— بی جمیلہ فطرتاً بڑی رقیق القلب واقع ہوئی ہیں۔ وہ بھی میری طرح اس ضعیف جوگن کے ساتھ اس طرز عمل کی متحمل نہ ہوسکیں۔ میں دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ انھوں نے عملی طریقہ اختیار کیا اور جا کر اسے واپس لے آئیں۔ اسے آتے دیکھکر میرے دل کو اس خیال سے قدرے تسلی ہوگئی۔ کہ اس بیچاری کی دلجوئی کا موقع تو ملیگا وہ سہمی ہوئی سی تھی۔ اور اس کی متجسس نگاہیں ایک ایک کے چہرہ کا جائزہ لے رہی تھیں، گویا معلوم کرنا چاہتی ہے۔ کہ اس کا دوبارہ آنا کسی کو ناگوار تو نہیں ہوا ——— بلقیس نے مسکرا کر کہا:-

"آئیے بڑی بی بیٹھ جائیے۔ آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو کر چلی گئیں" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوگئی۔ مگر وہ بدستور خاموشی سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بیٹھ جائیے نا" ——— میں نے نرمی سے کہا۔ جمیلہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے والے بنچ پر بٹھا دیا۔ اس نے جو کچھ چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ نکالکر اپنے پاس بنچ پر رکھ دیا۔ یہ "دلربا" کی قسم کا کوئی چھوٹا سا ساز تھا۔ لڑکیوں نے تعجب کے ساتھ پہلے ساز کیطرف اور پھر کچھ استعجاب آمیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ——— مغنیہ نے بھی ان کا مطلب سمجھکر ساز کی طرف دیکھا اور مسکرا دی ——— اس کی مسکراہٹ میں ابھی تک کچھ دلفریبی سی تھی۔

"بڑی بی! آپ کس طرح یہاں آئیں؟" ——— بلقیس نے دریافت کیا۔

"میں؟" ضعیفہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں گانے کی آواز سنکر ادھر چلی آئی۔ میں نے کہا ذرا میں بھی چلکر بھولوں کو کچھ سناؤں گی۔"

"تو آپ پھر واپس کیوں چلی گئیں؟" ——— میں نے پوچھا۔

"آپ سب ناراض جو ہوگئی تھیں۔"

"مگر آپ نے کیوں یہ کہا کہ آپ کچھ سنانے آئی ہیں؟" ——— کسی لڑکی نے کہا۔

ضعیفہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

"اچھا تو پھر کچھ سنائیے" ——— میں نے کہا۔ وہ فرمائش پر بیحد خوش ہوئی۔ فوراً اپنا ساز سنبھالا۔ اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں ساز کے کہنہ سال تاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

"کیا سناؤں؟ آپ کی پسند کے نئے نئے گیت تو مجھے نہیں آتے۔"

"کوئی اچھی سی چیز" جمیلہ نے کہا۔

"ہاں اپنا دل پسند راگ گائیے"۔ بلقیس نے کہا۔

میں خاموش بیٹھی ہوئی اس کے مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر مردہ جذبِ حیات کے آثار ڈھونڈ رہی تھی ——————

اس نے گانا شروع کیا۔

"اپنے موہا کی میں جوگن بنوں گی"

ساز تو خوب بجاتی تھی مگر آہ آواز! ——— اس کی آواز بھی بیچاری کی شکل و صورت کی طرح اپنی گذشتہ جوانی اور سوز گداز کی مٹی ہوئی سی یادگار تھی! معلوم ہوتا تھا کہ ماہر فن تو ہے مگر لوازمہ ہی ختم ہو چکا۔ تو کمال کیا دکھائے۔ ... ——— بیچاری کی آواز کانپتی تھی دم خم باقی نہ تھا۔ گاتی گیا۔ تھوڑی سی دیر میں ہی سانس پھول گیا۔ اور خاموش ہو گئی۔ جب سانس درست ہوا تو مسکرا کر بولی۔

"اب تو مجھے یہ گیت پسند ہے"

اور جب آپ ہماری عمر کی تھیں تو آپ کو کونسا گیت پسند تھا؟ ایک لڑکی نے ہنس کر پوچھا۔

ضعیفہ چند منٹ خاموشی سے سوچتی رہی۔ اس کے متبسم چہرے پر سنجیدگی آگئی۔ شاید یادِ عہدِ شباب نے اسے آزردہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ مگر وہ آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"بی بی! جب میں تمہاری عمر کی تھی ——————ہاں! بالکل تمہارے ہی جتنی۔ تو میرا سب سے زیادہ مرغوب گیت یہ تھا۔ لو تمہیں سناتی ہوں۔ اس نے گلا صاف کر کے پھر گانا شروع کیا۔ پورا گیت تو مجھے یاد نہیں مگر یہ مصرع جو بار بار آتا تھا یاد رہ گیا ہے

"بالماں نیناں تورے رسیلے"

جب اس نے گانا ختم کیا تو اس کے چہرہ پر افسردگی اور غم کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ ساز کو تھامے ہوئے بہت دیر تک کچھ سوچتی رہی ——————میرے دل میں ایک عجیب شوق پیدا ہوا۔ خبر نہیں کیوں مجھے بار بار یہ خیال آتا کہ اس کی داستان زندگی سنوں۔ میں نے جمیلہ سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ تو انھوں نے بھی میری تائید کی۔ اور ضعیفہ سے کہا:۔

"بڑی بی ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ کی سرگذشت سنیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے ہیں۔ —————— کیا آپ ہمارا یہ شوق پورا کر سکتی ہیں؟

یہ سنکر اس کی رنگت نئی زردی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ بہت ہی غمگین ہو گئی۔

میری معصوم بچیو! میری زندگی کے حالات کیا پوچھتی ہو ——————اس نے ایک دل سوز آہ بھر کر کہا۔

"اگر آپ کے لئے یہ رنج کا باعث ہوگا تو پھر نہ سنائیے ——— میں نے اس کے رنج سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔"

"اب تو میری گذشتہ زندگی میرے لئے ایک بھولا ہوا خواب بن گئی ہے۔ اگرچہ ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد میرے زخم تازہ کردے گی۔ مگر خیر میں بیان ضرور کرونگی ——— میں نے عرصہ سے ان باتوں کو کبھی بیان نہیں کیا۔ بلکہ بھول چکی ہوں۔ خیال کرتی ہوں کبھی خواب دیکھا تھا۔ لیکن آج خبر نہیں کیوں گذرے ہوئے زمانہ کا خیال مجھے رہ رہ کر ستا رہا ہے ——— آج تو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اس فراموش شدہ داستان کو ایک مرتبہ دُھرا لوں۔ پھر ماضی کی تلخ اور جگر سوز یاد کو تازہ کرکے اس بہلے ہوئے دل کو جو سرد پڑ چکا ہے انگارہ بنا لوں ——— بی بی! اچھے دنوں کی یاد سے جب دل تڑپنے لگتا ہے تو اس تڑپ میں بھی ہم فلک کے ستائے ہوئے کچھ عجیب لطف پاتے ہیں۔ ——— موٹے موٹے آنسو اس کے جھریوں والے گالوں پر گزرنے لگے۔

"ہاں تو سنیئے! ——— اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں اور میری دائم المرض ماں ایک چھوٹے سے شکستہ مکان میں رہتے تھے۔ صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک بالکل تنگ سا صحن تھا ——— مجھے یاد نہیں ہم کب سے اس حالت میں رہتے تھے۔ اور میں کب شفقت پدری سے محروم ہوئی۔ جب میری امی تندرست تھیں تو وہ ایک چھوٹے سے سکول میں پڑھایا کرتی تھیں۔ میں نے بھی وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی ——— مگر پھر میری امی بیمار رہنے لگیں۔ اور انہیں ملازمت سے جواب مل گیا۔ اب ہمارے گذارے کی کوئی صورت نہ رہی۔ میں کچھ سینا پرونا جانتی تھی۔ مگر بمبئی جیسے شہر میں ایسی مزدوری سے دو آدمیوں کے گذارے کی صورت پیدا کرنا بعید از قیاس بات ہے۔ اور پھر معمولی گھر کی سلائی کو بھلا کون پوچھتا۔ اس کے علاوہ میری امی بیمار تھیں۔ گھر کے سب کام کاج اور ان کی دیکھ بھال کے بعد میرے پاس اتنا وقت بھی نہ بچتا کہ سلائی کرسکوں۔ بہت سوچ بچار کے بعد امی نے ایک تدبیر سوچی ——— اور کرتیں بھی کیا۔ ہم فاقوں مر رہے تھے۔ ان کا علاج تو کجا۔ ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ وہ مجھے ایک سیٹھ حاتم جی کے پاس جو ایک تھیٹریکل کمپنی کے مالک تھے لے گئیں ——— اور مجھے تھیٹر میں ملازم کروادیا۔ میں نے سکول میں تھوڑا بہت گانا بھی سیکھا ہوا تھا اور گانے کا شوق بھی تھا۔ آواز بھی اچھی ہی تھی۔ سیٹھ نے امتحان کے طور پر مجھ سے تھوڑا سا گانا سنا۔ اور مجھے رکھ لیا۔ اس نے تیس روپیہ مہینہ دینا منظور کیا۔ ہمارے لئے یہی غنیمت تھا۔

پہلے پہلے میں صرف سہیلیوں کے جھمگٹے میں سٹیج پر آیا کرتی۔ یا ملازمہ وغیرہ کا چھوٹا موٹا پارٹ مل جاتا جس سے فارغ ہوکر میں فوراً ہی گھر آجاتی۔ یا دن کو ایک گھنٹہ کے واسطے ڈرامے کی تیاری کے لئے جانا پڑتا ——— اس وقت میری عمر

کوئی چودہ برس کی تھی۔

مجھے تھیٹر میں کام کرتے پورا ایک سال ہوگیا۔ اس عرصہ میں میں نے ناچ اور گانے میں کافی مہارت پیدا کرلی۔ مگر سٹیج پر رقص کرنے یا اکیلے گانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ بس سہیلیوں کے گروہ کے ساتھ آتی ان کے ساتھ ہی ملکر ناچتی اور کورس میں گانا گا کر چلی جاتی۔ اتنے عرصہ میں میں نے تھیٹر میں کسی سے رہ ورسم پیدا نہ کی۔ کیونکہ ان لوگوں کا اخلاق کچھ قابل اعتبار نہ تھا۔ ایکٹروں میں سے ایک لڑکا جمشید جو ہمیشہ ہیرو کا پارٹ لیا کرتا تھا۔ بہت خوش اخلاق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا ——— اس کے چہرے پر میں نے کبھی وہ مکروہ تبسم نہیں دیکھا جو دوسرے ایکٹروں کے چہروں پر ہوا کرتا تھا۔ اور جو میرے لئے باعث نفرت تھا۔ میرا ان سے بات کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ جب کسی کھیل کی تیاری میں مجھے ان سے ہمکلام ہونا پڑتا۔ تو مجھے سخت ناگوار گزرتا۔

——— تو کیا وہاں اور لڑکیاں نہ تھیں؟ ——— کسی لڑکی نے قطع کلام کرکے کہا۔

تھیں کیوں نہیں سہیلیاں۔ سب لڑکیاں ہی تھیں مگر وہ خود ہی مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اور میری سخت دشمن تھیں۔ جہاں مجھے دیکھ پاتیں تیوری چڑھا کر منہ پھیر لیتیں۔ خیر نہیں میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ کہ وہ مجھ سے اس قدر جلتی تھیں۔ میں بھی ان کی جلی کٹی باتوں اور تند نگاہوں سے بچنے کے لئے حتی الوسع ان سے الگ الگ رہتی تھی۔

ایک دن میں کچھ ضروری چیزیں خریدنے بازار گئی ——— میں نے کچھ مکھن۔ بسکٹ۔ انڈے۔ ایک بکس چائے۔ اور امی کے واسطے کچھ تازہ پھل خرید کر یہ سب چیزیں بید کی ٹوکری میں رکھیں۔ جب میں چلنے لگی تو سامنے سے ایک کمسن گل فروش آتا دکھائی دیا۔ اس کے پاس نرگس کے تازہ گلدستے تھے۔ مجھے نرگس کے پھول بے حد پسند ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے ایک بڑا سا گلدستہ خریدا ——— میرے ایک ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ اور دوسرے میں ٹوکری۔ اچانک جو میری نظر پڑی تو سامنے والی گھڑیوں کی دوکان پر جمشید کھڑا ہوا بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا ——— تھیٹر میں کئی لڑکیاں تھیں۔ مگر جمشید کسی کی طرف اس طرح ٹکٹکی باندھکر دیکھنا تو درکنار میں نے کبھی کسی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ زرینہ کے ساتھ بھی جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہیروئن کا پارٹ لیا کرتی تھی بہت ہی کم نظر آتا تھا۔ اور اپنے اوصاف و اطوار سے بھی بہت شریف النفس لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں حیران تھی۔ کہ کچھ عرصہ سے اس نے یہ کیا طریقہ اختیار کر رکھا ہے ——— جب بھی میں باہر نکلتی وہ رستہ میں چلتے ہوئے کسی دوکان پر یا کسی سیرگاہ میں ضرور ہی مجھے نظر آتا۔ اور جب میری نظر اس پر پڑتی۔ وہ غور سے میری طرف دیکھتا ہوتا۔ میں بے خبری میں اس طرح کی تاک جھانک سے محجوب بھی ہوتی اور مجھے غصہ بھی آتا۔ مگر جونہی میری نظر اس پر پڑتی وہ کہیں ادھر ادھر غائب ہو جاتا۔ یا کسی دوسری طرف متوجہ ہو جاتا۔ اس نے کبھی میرے ساتھ میل جول کی کوشش نہ کی ——— اور دفعہ بھی میرے متوجہ ہونے پر

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور جو کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں آگے بڑھ گئی۔ بازار سے نکلکر باہر سڑک کی نکڑ پر جا کھڑی ہوئی اور کسی بس کا انتظار کرنے لگی مجھے یہاں کھڑے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہونگے کہ موڑ پر سے یکلخت دو گھوڑوں والی ایک فٹن تیزی سے نکلی۔ اس کے ایک ہی دھکے سے میں کوئی گز ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر جا گری۔ اور گاڑی گزر گئی۔ میرے سر میں سخت چوٹ آئی۔ کچھ چوٹ کے صدمہ سے کچھ ڈر سے میں بیہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو ایک خاصی بھیڑ میرے گرد لگی ہوئی ہے۔ میں کسی باغ میں ایک بنچ پر پڑی تھی۔ اور کوئی میرے سرہانے کھڑا میرے زخم کو دھو رہا تھا۔ میں نے پھر کر جو دیکھا تو جمشید تھا۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے سہارا دیکر مجھے بٹھا دیا۔ اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے جو اکٹھا کر کے تکیے کی بجائے میرے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا رومال نکالکر میرے زخم پر باندھ دیا —— میں نے کوشش کی کہ اس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر الفاظ میرے ہونٹوں تک پہنچکر رک گئے۔ صرف میری شکر گذار نگاہوں نے میرے خیالات کی ترجمانی کی۔ اس نے غالباً میرا مطلب سمجھ لیا اور مسکرا کر کہا:۔

"کیوں کیا حال ہے اب آپ کا؟"

"جی اچھی ہوں" —— نوازش ہے آپ کی۔ آپ نے بڑی مہربانی کی۔ کہ ——"

"او ہو اس کا کوئی خیال نہ کریں —— میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے"۔

جو لوگ جمع تھے انھوں نے جمشید کی ہمدردی کی تعریف کرتے ہوئے اپنا اپنا راستہ لیا۔ اور وہ میرے پاس تنہا رہ گیا۔

—— وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں کچھ ڈری ہوئی تھی۔ اس نے کہا:۔

"چلیے میں آپ کو گھر تک پہنچا آؤں"۔

"جی نہیں —— مہربانی آپ کی۔ اب تو میں اچھی ہوں۔ خود ہی چلی جاؤنگی۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں"۔

"واہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو تنہا بھیجدوں۔ ابھی آپ کی طبیعت اچھی طرح بحال نہیں ہوئی۔ اور میرا خیال ہے آپ نے کافی دور جانا ہے"۔

"نہیں کچھ اتنا دور تو نہیں —— موٹر بس پر چلی جاؤنگی"۔

"لیکن میرے ساتھ جانے میں آپ کا کیا ہرج ہے"؟

اس نے کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ میں زیادہ رد و کد نہ کر سکی۔ اور خاموش ہو رہی۔

"ہاں سچ —— آپ کی چیزیں"! اس نے یکلخت کہا۔ اور دوسرے بنچ پر سے میری ٹوکری اٹھا لایا۔

"یہ تو کچھ بچ ہی گئی ہیں۔ مگر آپ کا گلدستہ اس کمبخت گاڑی کے نیچے کچلا گیا۔ کچھ ہرج نہیں۔ راستے میں سے اور لیلیں گے۔

—— اس نے اپنا کوٹ جو جا بجا بھیگا ہوا تھا اٹھا کر بازو پر ڈالتے ہوئے کہا:۔

"نہیں اور کیا کرنا ہے۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا چاہیئے۔ میری امی گھبراتی ہونگی"۔

"تو گلدستہ خریدنے میں کونسی بڑی دیر لگ جائیگی۔ راستہ میں تو دُکان ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

ہم باغ سے باہر نکلے تو جمشید نے کرایہ کی گاڑی لی۔ چند گز کے فاصلہ پر گاڑی ٹھہرا کر وہ ایک بڑی دکان کے اندر گیا۔ اندر گس اور گلاب کے بڑے بڑے خوبصورت گلدستوں سے بھری ہوئی ایک بڑی سی ٹوکری لے آیا ——— میں کپھ پریشان سی ہوگئی۔ وہ مجھ پر پہلے بہت بڑا احسان کر چکا تھا اور میں اور زیادہ زیر بار احسان نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس نے پھولوں کی ٹوکری میرے قریب رکھ کر دوسری طرف خود بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"یہ میں خود اپنی طرف سے آپ کی والدہ کی خدمت میں پیش کرونگا۔"

"آپ نے پہلے ہی میری وجہ سے کیا کم تکلیف اُٹھائی ہے کہ اب یہ ———"

"واہ یہ آپ کیا فرماتی ہیں ——— اور یہ ہے کونسی بڑی بات۔ آپ کی والدہ علیل ہیں۔ اور میں جو ان کی خدمت میں جا رہا ہوں تو کیا ان کے لئے پھول لیجانے کی بھی آپ مجھے اجازت نہیں دیتیں؟"

میں نے گاڑی والے کو مکان کا پتہ بتایا۔ کچھ دیر کے بعد جمشید نے مجھے مخاطب کر کے کہا:۔

"آج تو آپ تھیٹر نہ جا سکیں گی؟ ———"

"نہیں میں ابھی چل ——— جاؤنگی۔"

اس کے بعد ہم دیر تک خاموش رہے۔ میں یہ سوچکر دل ہی دل میں سخت نادم ہو رہی تھی کہ میرا گھر دیکھکر جمشید کیا کہیگا۔ ——— میں اسے کیوں ساتھ لے آئی کیوں نہ وہیں ٹال دیا ——— اتنے میں گاڑی شہر کے اس فرسودہ اور تاریک حصے میں داخل ہوئی۔ جہاں بیچارے فلاکت زدہ لوگ چار و ناچار زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کچی سڑک کی ناہموار سطح پر گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ ادھر ادھر گندی دکانیں اور گھاس پھونس کے چھپروں والے ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ مکان ——— مکان کیا جھونپڑے تھے۔ جوں جوں میرا گھر نزدیک آ رہا تھا میرے دل کی دھڑکن میں تیزی ہوتی جاتی تھی ——— میں بمبئی کی سب سے مشہور تھیٹریکل کمپنی کے چیف ایکٹر کو جس کی تمام شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی اپنا مہمان بنا کر لے جا رہی تھی۔ اور میرے گھر میں اسے بٹھانے کے واسطے بھی مناسب جگہ نہ تھی۔ اس کی خاطر مدارات کا کچھ انتظام نہ تھا۔ آہ! میرے اللہ! وہ کیا کہیگا؟ میں نے شرماتے ہوئے دل میں کہا۔

آپ نے دیکھا مسٹر جمشید؟ ——— میری رہائش شہر کے مفلس ترین طبقہ میں ہے۔ ہم لوگ نہایت ہی غریب ہیں۔ اس افلاس نے ہی مجھے یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ میری تنخواہ میری بیمار ماں کے علاج معالجہ اور معمولی اخراجات کے واسطے بھی بمشکل پوری ہوتی ہے۔ کوئی اچھی جائے رہائش کس طرح میسر آئے؟ ——— مجھے بیحد شرم آ رہی ہے۔ آپ میرا گھر دیکھکر کیا کہیں گے؟

"اس بات پر آپ کا شرمانا بالکل بیجا ہے ——— مس فیروزہ! میں جو اسوقت امیرانہ زندگی بسر کر رہا ہوں اسی

وقت خود بھی شہر کے اسی حصے میں ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں کس مپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اور ایک وقت کی روٹی کو بھی محتاج تھا۔ میں افلاس کی مجبوریوں اور دلآزاریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے ذاتی تجربہ ہے۔"

اتنے میں ہماری گاڑی اس تنگ و تاریک گلی کے سامنے پہنچی جس کے اندر میرا مکان تھا۔ میں نے کوچبان سے ٹھہرنے کے لئے کہا۔ جمشید نے گاڑی ٹھہرا دی۔ اور خود اتر کر دونوں ٹوکریاں اُٹھالیں ــــــــ اس کے ان تشفی آمیز الفاظ کے باوجود بھی میں اُس اپنے گھر لیجاتے ہوئے شرما رہی تھی۔ خیر ہم اندر داخل ہوئے۔ امی کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب جاکر پوچھا:-

"ہم اندر آجائیں امی؟ ــــــــ میرے ساتھ میرے ایک محسن بھی ہیں"

"یہ تو بہت بڑا خطاب دیا۔ یا آپ نے"ــــــــ جمشید نے مسکراکر کہا۔

"آجاؤ فیروزہ بہت دیر لگائی تم نے"ــــــــ تمہارے مہمان بھی تشریف لے آئیں" اندر سے آواز آئی۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے امی ہمیں دیکھکر اُٹھ بیٹھیں۔ میں نے جمشید کا مناسب الفاظ میں تعارف کروایا۔ اور اس حادثہ کا تمام حال سنانے کے بعد کہا:-

"امی! مسٹر جمشید نے بڑا ہی احسان کیا۔ یہ انہیں کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ میں بلا تردد آپ کے پاس پہنچ گئی۔ ورنہ خبر نہیں میرا کیا حال ہوتا"

"بیٹا! میں کن لفظوں سے تمہارا شکریہ ادا کروں ــــــــ خدا تمہیں شاد و بامراد رکھے" امی نے شکریہ کی نظروں سے جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی میں نے اپنے فرض سے بڑھکر کچھ نہیں کیا ــــــــ یہ تو آپ صاحبوں کا حسن اخلاق ہے کہ آپ میری ادنیٰ سی خدمت کو اس قدر اہمیت دے رہے ہیں"

"اس کے بعد میں اُٹھکر کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے لگی۔ کھانا تو میں پکا کر رکھ گئی تھی مگر جمشید کے خیال سے جلدی جلدی ایک دو چیزوں کا اضافہ کرلیا۔ دوسرے کمرے میں دسترخوان لگا کر میں امی کے پاس آئی۔ وہ مجھے دیکھکر کہنے لگیں:-

"بیٹی کیا کر رہی ہو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا بھائی کو بغیر کچھ کھلائے ہی بھیجو گی؟"

"مجھے شرم آتی ہے ــــــــ اس وقت میں ان کے قابل کوئی چیز مہیا نہ کرسکی۔ مگر خیر جو کچھ موجود ہے حاضر ہے ــــــــ چلئے امی آپ بھی۔ میں نے کھانا چن دیا ہے"

"مس فیروزہ! میرا خیال ہے یہ بھی باتیں تو آپ نے کہیں سے خاص طور پر سیکھی ہیں ــــــــ مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیں تو اس وقت اس سے بڑھکر آپ کی کیا مہربانی ہوسکتی ہے"

جمشید نے ہنسکر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے آگے بڑھکر امی کو اٹھایا۔ اور ہم تینوں ملکر کھانا کھانے بیٹھے ــــ

ــــ اتنے میں ڈائننگ ہال کے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ جمشید نے گھڑی دیکھکر کہا:۔

"اوہو! آٹھ بج گئے۔ اتنی جلدی؟ ــــ کھانا کھا کر ہمیں فوراً چلنا چاہئیے۔ آپ بھی میرے ہمراہ چلیں گی نا مس فیروزہ؟"

میں نے امی کی طرف دیکھا۔

"ہاں چلی جانا بعد میں اکیلی ہو جاؤ گی" ــــ امی نے میرا مطلب سمجھکر مسکراتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھکر تھیٹر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جمشید نے کہا:۔

"آپ کی والدہ کو تبدیل آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آپ انھیں کہیں پہاڑ پر لیجائیں تو وہ یقیناً تندرست ہو جائیں گی۔"

"واہ! جھونپڑیوں میں رہنے والے محلوں کی خواب ــــ مسٹر جمشید! میں اپنی حالت آپ کے سامنے پہلے ہی بیان کر چکی ہوں۔ آپ خیال کریں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں اتنا خرچ کہاں سے لاؤں؟ ــــ آہ میری غریب ماں! کاش میں اس کے لئے کچھ کر سکتی۔"

"مس فیروزہ! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے کسی طرح ان کی خدمت کرنے کی اجازت دیں؟ ــــ میں اپنے والدین کی خدمت کرنے سے محروم رہا۔ میں اپنی والدہ سمجھکر آپ کی والدہ کی خدمت کرونگا۔ میرے پاس خود اپنی ذات پر کافی صرف کر کے بہت کچھ بچ رہتا ہے۔" جمشید نے میرے مایوسانہ جواب سے متاثر ہو کر کہا۔

"نہیں نہیں ــــ مہربانی ہے آپ کی۔ بیشک ہم بے حد مفلس ہیں مگر ہماری خودداری ہمیں اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"تو کیا پھر میں یہ سمجھکر کہ میری التماس کو رد کر دیا گیا۔ مایوس ہو جاؤں؟"

میں خاموش تھی۔ اس نے جواب نہ پاکر کہا۔

"اچھا تو پھر میں آپ کو ایک اور ترکیب بتاتا ہوں۔ ممکن ہے کہ قسمت یاوری کرے۔ اور خدا آپ کو کامیابی دے ــــ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اگلے ہفتہ سیٹھ صاحب (ہمارے تھیٹر کے مالک) تھیٹر کے حقوق ایک عیسائی مسٹر جیمس کے ہاتھ فروخت کر دینگے؟"

"جی ہاں۔"

میں کل مسٹر جیمس سے ملا تھا۔ انھوں نے گھوڑ دوڑ کی ایک سکیم تیار کی ہے۔ جو تقریباً ایک ماہ تک ہوگی۔ میری صلاح

ملنے تو آپ بھی اس میں حصہ لیجیے۔"
"اچھا میں سوچونگی"
"صرف سوچیں ہی نہیں بلکہ اس میں شامل بھی ہوں۔"
اتنے میں ہم تھیٹر کے قریب پہنچ گئے۔ دوسرے ایکٹر اور ایکٹرسیں گاڑیوں سے اتر رہی تھیں۔ ان میں کوئی وہ بھی تھیں جو میرے ساتھ "سہیلیوں" کے گروہ میں سٹیج پر آیا کرتی تھیں۔ مجھے وہ کمپنی کے سب سے بڑے ایکٹر کے ساتھ آتے دیکھکر بیحد حیران ہوئیں۔ اور حیرت سے ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں۔

اب ہماری کمپنی کے مالک مسٹر جمیس تھے۔ اچھے بارعب اور شریف آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وضع قطع سے ظاہر تھا۔ کہ تجربہ کار اور جہاندیدہ ہیں۔
اس واقعہ کے بعد اب جمشید کا معمول ہوگیا کہ ہر روز شام کو اپنی موٹر پر مجھے لینے کے واسطے آجاتا اور ہم دونوں ملکر تھیٹر جاتے ــــــ ایک دن وہ خلاف معمول جلد ہی ہماری طرف آگیا۔ اور کچھ پریشان سا معلوم ہوتا تھا۔
"کیوں خیریت تو ہے؟ ــــــ آپ کچھ فکر مند سے نظر آتے ہیں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔
"بہت برا ہوا۔ ہمارا بنا بنایا پروگرام کا ستیاناس ہوگیا"
"کسطرح؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"آج دوپہر کو موٹر پر سے گر کر زرینہ کے پاؤں کو سخت موچ آگئی۔ اب وہ چل بھی نہیں سکتی۔ ہمارے نئے کھیل اور اس کے ساتھ زرینہ کے رقص کے اشتہار بڑے زور وشور کے ساتھ تمام شہر میں تقسیم ہوچکے ہیں۔ دو ماہ سے پبلک اس کھیل کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ اور ہمیں پورا یقین تھا کہ یہ کھیل بیحد مقبول ہوگا۔ مگر زرینہ نے سارا کام بگاڑ دیا۔ اب عین وقت پر اعلان کر دینا کہ تماشہ نہیں ہوگا کمپنی کے لئے کس قدر بدنامی کا باعث ہوگا"
اس کھیل میں بھی حسب معمول زرینہ ہیروئن بھی تھی۔ اور کھیل شروع ہونے سے پیشتر اس کا خاموش رقص بھی تھا۔
ــــــ جب میں زرینہ کو رقص کرتے دیکھتی اور پھر ہال تالیوں اور تحسین وآفرین کے نعروں سے گونج اٹھتا تو بے اختیار میرے دل میں شوق پیدا ہوتا کہ کاش میں بھی عوام میں اس طرح مقبول اور مشہور ہوں! اگرچہ میرے خیال میں یہ قطعی غیر ممکن تھا مگر تاہم دلی شوق کے زیر اثر میں تنہائی میں آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں رقص کی مشق کیا کرتی۔ گانے میں بھی میں نے اس عرصہ میں کافی ترقی کرلی تھی ــــــ جب میں گاتی تو اپنی آواز پر آپ ہی وجد کرنے لگتی۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ میں اگر زرینہ سے اچھا نہیں تو اس سے برا بھی نہیں گاتی اور اس نئے پروگرام کی تیاری میں تو میں ہمیشہ موجود ہی ہوا کرتی تھی۔

زرینہ کے نئے خاموش ناچ کی ایک ایک حرکت ہر وقت میرے دل و دماغ کی ہر رگ میں تڑپتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گانے کی لہریں میرے سینے کی گہرائیوں میں گونجتی رہتی تھی۔ جس طرح میں اسے ڈائرکٹر کے سامنے رقص کرتے دیکھکر آتی۔ گھر آکر اسی طرح آئینہ کے سامنے ناچتی۔ اس کے اور اپنے انداز رقص میں اس قدر مشابہت پاکر میرا دل باغ باغ ہو جاتا۔ علاوہ ازیں ڈرامہ میں بھی جو اس کا پارٹ تھا۔ وہ بھی چند مرتبہ سننے سے ہی مجھے خوب یاد ہو گیا تھا۔ خدا جانے کیوں مجھے ہر بات میں اس کی نقل کرنے کا شوق سا پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ڈائرکٹر جو ضروری ہدایات کرتا وہ خود زرینہ سے زیادہ میرے ذہن نشین ہو جاتیں ——— میں سوچ رہی تھی کہ اگر زرینہ کا پارٹ مجھے دیدیا جائے تو میں یقیناً اسے نہایت خوبی سے ادا کرونگی۔ مگر اپنے خیال کو ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہ بات میری حیثیت سے اس قدر بلند ہے کہ ایسی آرزو کروں۔ تو شاید دیوانی سمجھی جاؤنگی۔ کہاں میں ایک گمنام ہستی اور کہاں زرینہ! جس کا نام شہر کے ہر فرد کی زبان پر تھا۔

"آپ کس سوچ میں ہیں؟" جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی؟ ——— میں نے یک لخت چونک کر کہا۔

"خوب! آپ تو کوئی بڑا دقیق مسئلہ حل کر رہی تھیں ——— کیا سوچ رہی تھیں آپ؟"

"کچھ بھی نہیں" میں نے شرما کر کہا۔

"کوئی بات تو ضرور ہے۔ سچ سچ بتائیے"

میں نے کچھ تامل کے بعد جمشید کے سامنے اپنا خیال ظاہر کیا ——— اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

"کیا سچ مچ آپ کو یقین ہے۔ کہ آپ زرینہ کا پارٹ بخوبی سے ادا کر سکینگی؟"

"بے شک"

"تو پھر میں مسٹر حبیب سے اس کا ذکر کروں؟"

"جیسے آپ کی مرضی"

"تو چلئے ہم ابھی ان کے مکان پر چلتے ہیں۔ ہمیں ذرا بھی دیر نہ کرنی چاہیئے ——— راستہ میں ڈائرکٹر صاحب کو بھی ساتھ لیلیں گے"

جب ہم ڈائرکٹر کے مکان پر پہنچے تو مسٹر حبیب بھی وہیں موجود تھے۔ اور دونوں ہی فکرمند تھے۔ جمشید نے ان سے سارا معاملہ بیان کیا۔ اور کہا۔

"آپ مس فیروزہ کے رقص اور گانے وغیرہ کا امتحان کرلیں۔ اگر یہ تسلی بخش کام کر سکیں تو اس کھیل میں انھیں مس زرینہ کی جگہ دیدیں"

ڈائرکٹر نے کچھ مایوس جیسی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں تو شک نہیں کہ مس فیروزہ بیحد ذہین ہیں۔ مگر دوسرے شخص کا پارٹ خوبی سے یاد ہونا تو مشکل ہی ہے۔ ——— مگر خیر دیکھ لیتے ہیں"

ڈائرکٹر نے طبلہ اور جمشید نے دلربا بجانا شروع کیا۔ اور میں نے زرینہ کے پارٹ میں سے تین چار مختلف گیت سنائے۔ جب میں نے پہلا گیت ختم کرکے نظر اٹھائی تو مجھے جمشید کی آنکھوں میں مسرت کی چمک۔ ڈائرکٹر کے لبوں پر تحسین آمیز مسکراہٹ اور مسٹر جیمس کے سنجیدہ چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔

"خوب! بہت خوب! ——— ایسا گوہر بے بہا ہمارے پاس موجود ہو اور پھر ہم اس کی موجودگی سے بےخبر ہوں؟ کس قدر حیرت کا مقام! ——— ڈائرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے شرما کر گردن جھکالی۔ گانے کے بعد ناچ دیکھا گیا۔ اور ڈائرکٹر نے کہا:۔

"گانا مس زرینہ سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔ اور رقص بھی ان سے کچھ کم نہیں"

آہ! یہ میری زندگی کا ایک شاندار دن تھا ——— ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جب ڈائرکٹر نے مس زرینہ کی ناسازیٔ طبیعت اور ان کی بجائے میرے رقص کا اعلان کیا۔ تو ہال میں سناٹا چھا گیا ——— جیسے شائقین کے دل بجھ سے گئے۔ مگر مجھے اپنی کامیابی کا کامل یقین تھا۔ سازوں کی ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ پردہ آہستہ آہستہ اٹھنا شروع ہؤا ——— اُف! میرا دل کس تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے جیسے عالمِ خواب میں رقص شروع کیا۔ سینکڑوں آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ مگر ان سب سے زیادہ مجھے اس وقت ان دو آنکھوں کا احساس ہو رہا تھا۔ جو پردہ کے عقب سے جھانک رہی تھیں ——— پردہ گرنے پر شائقین کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ اور دوبارہ رقص کے لئے اصرار ہونے لگا۔ اس وقفہ میں جمشید نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے کہا:۔

"شکریہ! ——— مگر خدا کے لئے آپ نہ دیکھئے۔ ورنہ اس دفعہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا"

"واہ! یہ تو عجب ظالمانہ ناانصافی ہے کہ سب تو دیکھیں۔ مگر ہم پر بندش کر دی جائے"

پردہ اُٹھا ——— اور اسی طرح تین مرتبہ میں نے رقص کیا ——— غرض اس دن کھیل نہایت کامیاب رہا۔ اختتام پر ڈائرکٹر اور مسٹر جیمس نے میری بے حد تعریف کی۔ ایکٹروں میں سے کئی مبارکباد دینے آئے۔ مگر میری "سہیلیوں" کی نگاہوں سے ظاہر تھا کہ ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک رہی ہے۔

دو ہفتوں کے بعد جب زرینہ تندرست ہو کر آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی شہرت کا بازار سرد پڑ چکا ہے۔ اور اب اس کی بجائے میرے گیت گائے جاتے ہیں۔ مگر تاہم رقص میں اسے کمال حاصل تھا۔ ہر کھیل میں دو تین مرتبہ اس کا

قص اور بعض اوقات گانا بھی ہوتا۔ مگر اب ہیروئن کا پارٹ ہمیشہ مجھے ہی ملتا تھا ——— میں جمشید سے وائلن اور دوسرے ساز بجانا بھی سیکھا کرتی تھی ۔ اور بہت جلد جلد ترقی کر رہی تھی۔

جمشید کی رائے کے مطابق میں نے پچاس روپے گھوڑ دوڑ میں لگائے اور خلاف توقع ایکدم ڈیڑھ ہزار کی رقم جیت لی ——— میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی " اب میری امی ضرور اچھی ہو جائینگی۔ میں ان کو باہر تبدیل آب و ہوا کے واسطے بھیجونگی۔ آہ وہ یہ غیر متوقع خوشخبری سنکر کس قدر خوش ہونگی ——— "

میں گھر پہنچکر دیوانہ وار دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی۔ اور اپنے بیگ میں سے روپے اور نوٹ نکالکر ان کے سامنے بستر پر ایک چھوٹا سا ڈھیر لگا دیا ——— امی حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں۔ میں نے ابھی اس کے متعلق ان سے کچھ ذکر نہ کیا تھا۔

" بچی یہ روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے ؟ ——— کہیں جمشید سے قرض تو نہیں لے آئیں ؟ انھوں نے پوچھا۔

" نہیں امی ! میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اسے چومتے ہوئے کہا " یہ ہمارے اپنے ہیں ——— آپ کے لئے ہیں۔ اب آپ کہیں دوسری جگہ آب و ہوا تبدیل کرنے جائینگی۔ اور بہت جلد اچھی ہو کر واپس آئیں گی ——— آہا کتنی خوشی کی بات ہے نا امی ؟"

مگر لڑکی پہلے یہ تو بتا یہ تو نے لئے کہاں سے ؟ ——— امی نے ذرا درشتی سے کہا ۔ وہ خدا جانے کیا خیال کر رہی تھیں۔

" امی میں نے گھوڑ دوڑ میں پچاس روپے ——— "

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔

" اچھا تم نے گھوڑ دوڑ میں پچاس روپے لگائے۔ اور یہ جیت کر لائیں ؟ ——— نالائق لڑکی ! اب تو نے جوا کھیلنا بھی سیکھ لیا ؟"

" امی ——— "

" خاموش ! میں ایک لفظ سننا نہیں چاہتی "

" مگر امی آپ کو باہر بھیجنے کے واسطے روپے کی بیحد ضرورت تھی "

" مگر میں تو اس روپے میں سے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر صرف کرنا حرام سمجھتی ہوں "

" آخر کیوں ؟ ——— اگر یہ اتنی ہی معیوب بات ہو تو اتنے لوگ اس میں کیوں شریک ہوں "

" شاید ان لوگوں کو اس سے ایسا تلخ تجربہ نہ ہوا ہو جیسا کہ مجھے ہوا ——— یہی جوا ہماری مصیبتوں کا باعث ہوا۔ اسی نے ہمیں تباہ کیا۔ مجھے اس حالت تک پہنچانے والی اور یہ چیز تھی ؟ اب تمہیں بھی یہ شوق چرایا ؟ ——— زہر خورشید کا علاج زہر سے کرنا چاہتی ہو ——— نادان بچی ! جا اسی وقت جا ۔ اور جہاں سے یہ روپے لائی ہے دے آ "

" لیکن امی ! مجھے آپ کچھ وجہ بھی تو بتائیں "

"آہ اس کے جواب میں امی نے مجھے جو کچھ بتایا اور جس درد کے ساتھ انھوں نے بیان کیا اس کی یاد سے اب بھی میرا دل دہل جاتا ہے۔ وہ بیان کرتی جاتی تھیں اور آنسو ان کے مرجھائے ہوئے زرد رخساروں پر بہتے جاتے تھے ——— انھوں نے مجھے بتایا کہ پہلے ہم لوگ بیحد دولتمند تھے۔ تمہارے اباجان یہاں کے مشہور تاجر تھے۔ مگر انھیں جوئے کی لت تھی۔ میں انھیں لاکھ سمجھاتی تھی، مگر وہ باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی تمام جائداد تلف کر دی۔ بہت سا قرض لیا ہوا تھا۔ جب قرضخواہوں نے تنگ کیا تو دیوالے کی درخواست دیدی۔ اور ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ ندامت کے مارے کہیں ایسے روپوش ہوئے کہ پھر ان کا کہیں سراغ نہ ملا۔

"اس کے بعد تم خود جانتی ہو میں نے جو سختیاں اٹھائیں اور کن مصیبتوں سے تمہیں پرورش کیا ——— یہ سب آفتیں جو اسی جوئے کی بدولت ہم پر نازل ہوئیں کیا کم ہیں۔ کہ ہم پھر اس خوابیدہ فتنے کو جگا کر گلے ڈال لیں ——— بیٹی یہ عادت بہت بری ہوتی ہے۔ جاؤ جلدی یہ روپے واپس کر کے آؤ۔ جب تک یہ میرے گھر میں رہے مجھے چین نہ آئیگا۔"

میری آنکھیں پرنم تھیں۔ میں اٹھی امی کے آنسو پونچھ کر ان کے تپتے ہوئے رخسار پر بوسہ دیا اور روپے بیگ میں ڈال کر کمرے سے نکل آئی۔"

میں نے دفتر کے دروازہ پر دستک دی۔

"آجائیے" اندر سے مسٹر جیمس کی بھاری آواز آئی ——— وہ مجھے دیکھکر کچھ حیران سے ہوئے۔ شاید میرا چہرہ میرے دلی رنج و غم کا پتہ دے رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" ——— انھوں نے استعجاب آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی میں یہ روپے واپس کرنے آئی ہوں۔ میری والدہ انھیں رکھنا نہیں چاہتیں"

"مگر کیوں؟ ——— وہ بھی حیران ہو کر بولے۔

میں نے تمام قصہ بیان کر دیا۔ وہ کچھ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:-

"کیا سیٹھ رستم جی آپ کے والد تھے؟"

"جی ہاں" ——— مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ ——— میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میری مظلوم بچی! میں ہی تیرا گنہگار باپ ہوں۔ تم دونوں ماں بیٹیوں پر ظلم کرنے والا سفاک! انھوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ——— آہ مجھے بخشدو ——— مجھ ذلیل اور بدترین انسان کو اپنے قابل نفرین مجرم کو بخشدو ——— میری بچی! میری فرزندہ!"

"ابا! میرے ابا!" میں نے کچھ نیم بیہوشی کی سی کیفیت میں کہا۔

"چلو مجھے اپنی ماں کے پاس لے چلو ——— میں اس کے قدموں پر سر رکھکر آنسو بہاؤنگا اور معافی کی درخواست کرونگا۔"

ہم موٹر میں بیٹھکر گھر پہنچے۔ جمشید بھی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ حسب معمول مجھے لینے کے واسطے آیا تھا۔ اور اماں اسے سارا ماجرا سنا رہی تھیں۔ کہ ہم پہنچے۔ وہ اس عجیب حقیقت کے انکشاف سے کچھ عجب طرح متاثر ہو رہا تھا۔

دوسرے دن ہم ایک بہت بڑی اور خوبصورت کوٹھی میں چلے گئے۔ اسی ہفتہ کے اندر میری اور جمشید کی شادی ہوگئی۔ ——— محنتوں اور کاوشوں کا جہنم ایک دم فردوس حیات بن گیا۔ مجھے تو بعض اوقات عالم خواب کا گمان ہونے لگتا۔

اب میرا محبوب ترین مشغلہ موسیقی تھا۔ زرینہ کی جگہ تھیٹر میں اسے واپس دیدی گئی۔ میں ہر روز کھیل شروع ہونے سے پیشتر دلربا یا ستار کے ساتھ کچھ گایا کرتی۔ ——— آہ وہ سماں بھی کس قدر پیارا معلوم ہوتا تھا! ——— کھچا کھچ بھرے ہوئے وسیع ہال میں سکوت طاری ہوتا۔ صرف میری سحر آفریں آواز اس میں گونج رہی ہوتی۔ میرا گیت سامعین پر جادو بنکر چھا جاتا۔ اور وہ بتوں کی طرح خاموش اور ساکت بیٹھے رہتے ——— موسیقی کا سحر ٹوٹتے ہی ہال میں کھلبلی سی پڑجاتی۔ تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوتے۔ اور سٹیج پر پھولوں اور ہاروں کا انبار لگ جاتا ——— میں خود جیسے کسی حسین خواب سے بیدار ہو جاتی۔ اور اپنے فن کی اس قدر داد پاکر میرا غنچۂ دل مسکرا پڑتا ——— تم سنکر ہنسوگی تو نہیں؟ ——— آہ لوگ مجھے حسین مغنیہ کہا کرتے تھے۔

پانچسال کے عرصے تک میری زندگی کے لیل و نہار اسی طرح گزرتے رہے۔ میں دنیا کے ہر فکر و تردد سے آزاد تھی۔ اور تخیلات اور تصورات کی کسی رنگین دنیا میں بستی تھی ——— آہ اس قلیل سی مدت کے لذیذ لمحات میں نے نغمے قہقہے بناکر اُڑا ڈالے! ——— اور اس کے بعد؟ ——— آہ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ کس دل سے ——— کس زبان سے بیان کروں ——— آہ کیسے دُھراؤں۔ کہ تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے کس طرح جھنجھوڑکر مجھے ان شیریں خوابوں سے بیدار کر ڈالا؟ ان پُرکیف نغموں اور عطر بیز پھولوں سے بھرے ہوئے خلد سے نکال کر کس طرح مجھے اس پُرخار و پُرخطر صحرا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے تنہا چھوڑ دیا ——— میرا پرستار جمشید اور میرے شفیق والدین مجھے کون سے دشت پرمحن میں بچھڑ گئے؟ ——— آہ! اس کی تفصیل میرے دل کے شکستہ ٹکڑوں کو خون بناکر بہا ڈالے گی ——— میری معصوم بچیو! تمہارے ننھے ننھے پاکیزہ دلوں کو تڑپا دے گی ——— میری بچیو! سنا تم نے یہ ہے اس بڑھیا بیراگن کی داستان اور یہ ہے اس دنیا کی حقیقت جس پر ان دنیا داروں کو ——— ان دولت کے پرستاروں کو اس قدر ناز ہے ———

اس کے یہ آخری الفاظ میں نے کچھ غنودگی کی سی حالت میں سنے۔ اور جب میں عالم خیال سے چونکی تو صعیف مغنیہ جا چکی تھی۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی تھیں ــــــــ اور موسم بہار کی وہ زندگی اور مسرت سے بھری ہوئی گلگونہ شفق میں رنگی ہوئی دلفریب شام تاریکی کے ماتمی پردے میں روپوش ہو چکی تھی۔ بھیگی ہوئی سی فضا میں اندوہناک خاموشی تھی۔ ــــــــ اُف موت کا سا ٹھنڈا اور ناسکوت! ــــــــ سامنے درختوں کے پیچھے سنئے چاند کا پھیکا اور اداس چہرہ جھانک رہا تھا ــــــــ شاید اسے بھی بدنصیب جوگن کی داستان غم نے مکدر کر دیا ہو۔

شفق

(از حضرت جعفر علی خان جعفری سرحدی)

رباعی

سرخ ہیں تا دور وادی کوہسار
تیرا جوبن زینت صبح بہار
کیا کہوں کیا چیز ہے تو اے شفق
تجھ پہ قرباں غازۂ روئے نگار

دیگر

زمانہ دیکھتا رہتا ہے تجھ کو یوں ہی مدام
صبا کی دوش پہ شام و سحر ترا ہے مقام
کھنچی نہ آئینۂ قلب میں تری تصویر
عروس حجلۂ مغرب ردائے لیلیٰ شام

قطعہ

شمسیت میں جلوہ افگن ہے شفق جوہر ترا
دیکھتا رہتا ہے آئینہ شہ خاور ترا
جلوہ زار صبح رنگیں ہے تری مینا بدوش
کیف آور شام غربت کو خط ساغر ترا

میرا سفرِ افغانستان

(از ابوالکیف کیفی سحری)

۱۷ اگست ۱۹۳۴ء کی وہ مبارک اور خوشگوار صبح تھی جبکہ ہمارا قافلہ اسلامی ملک افغانستان کی سیر کو پشاور سے روانہ ہوا۔ یہ قافلہ چار آدمیوں جناب سیٹھ اللہ بخش جان، خان عبدالحمید خان، مسٹر جان محمد خان اور راقم الحروف پر مشتمل تھا۔ ہم صبح دس بجے اپنی برق رفتار موٹر میں سوار ہو کر دفتر ویزا آفیسر صاحب افغان گورنمنٹ مقیم پشاور سے روانہ ہو کر پونے گھنٹہ میں جمرود جا پہنچے۔ موٹر نے قدرے توقف کیا۔ اور روڈ ٹیکس فی کس ایک روپیہ ادا کر کے درۂ خیبر کی جانب روانہ ہو گئے۔

جمرود:۔ یہ پشاور سے مغرب کی طرف نو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی انگریزی چھاؤنی ہے۔ یہاں خیبر ریلوے کا شاندار اسٹیشن ہے۔ سامنے ایک ٹیلے پر کچی اینٹوں کا چھوٹا سا قلعہ ہے جس میں انگریزی فوج رہتی ہے۔ قلعہ کے مغربی جانب بیرکس ہیں۔ نیز قلعہ میں ایک سفید مکان دکھائی دیتا ہے۔ جو مشرقی جانب اندرونی دیوار قلعہ کے ساتھ ہے۔ یہ سردار ہری سنگھ نلوہ کی مڑھی ہے۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جرنیل تھا۔ یہ جرنیل افغانستان کو فتح کرنے کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر آفریدیوں نے اسے درہ خیبر کے دہانہ پر ہی ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اس قلعہ پر انگریزی یونین جیک لہراتا ہے۔ اس کے گرد و نواح میں ہسپتال۔ مدرسہ۔ قافلہ کی سرائے اور خاصہ داراں خیبر کی لائن ہے۔ جہاں ہر وقت قافلہ والوں کی کثرت سے رونق رہتی ہے۔ یہاں سے دو میل آگے درۂ خیبر کا دہانہ ہے۔ اور درہ تورخم تک جو ۲۷ میل دور ہے پھیلا ہوا ہے۔

درہ خیبر:۔ کے شمال کی طرف اقوام ملاگوری اور شنواری کی پہاڑیاں ہیں۔ جنوب کو قوم آفریدی کے پہاڑ اور درمیان ڈبل جرنیلی سڑک ہے۔ شمالی پہاڑوں میں سے خیبر ریلوے گذرتی ہے۔ جس پر ۳۴ ٹنل ہیں۔ جن میں سے بعض دو دو تین تین فرلانگ لمبے ہیں۔ یہ لائن ہندوستان میں انجینرنگ کا عظیم الشان کارنامہ ہے جس پر فی میل ایک کروڑ روپیہ خرچ آیا۔ تفصیل نہایت دلچسپ ہے۔ مگر مضمون طویل ہو جائیگا۔ لہٰذا فی الحال اسے یہیں چھوڑتا ہوں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوجی اور خاصہ داروں کی پکٹس ہیں اور دہانہ درہ میں جنوب کی جانب ایک کنواں ہے۔ جو اہل قافلہ کے واسطے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ کنواں صوبہ سرحد کے بطل الخیر آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب وزیر اعلیٰ شمال مغربی صوبہ سرحد کی اس زمانہ کی فیاضی کی یادگار ہے۔ جبکہ وہ خیبر ایجنسی میں پولیٹیکل آفیسر کے عہدہ پر مامور تھے۔ اس کے آگے ایک ٹیلہ پر بھگیاڑی پوسٹ ہے جس میں چوکیدار رہتے ہیں۔ اس کے آگے خیبر ریلوے کا شاندار پل ہے جس میں سے ریل جنوب سے شمال کی طرف گذر جاتی ہے۔ خزین پہاڑوں اور سرنگوں میں سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی یہاں پہنچتی ہے۔ اور یہاں سے شاہ گئی ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ شاہ گئی کا فوجی قلعہ نہایت خوبصورت ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے سامنے تیراہ کے پہاڑ



قلعہ جمرود



درہ خیبر



چاہ خیبر • یادگار ابردل نواب سر صاحبزادہ عبد القیوم خانصاحب نالقادر

Durga Art Press Anarkali Lahore.



تانی مسجد



سرحد هند و افغانستان



افغان پوست افس

نظر آتے ہیں۔ جو موسم سرما میں سر سے پاؤں تک برف سے سفید ہو جاتے ہیں۔ شاگئی کیمپ کے آگے علی مسجد ہے۔ یہاں ایک سڑک اوپر سے گذرتی ہے۔ اور دوسری نیچے سے۔ نچلی سڑک کے کنارے پرانے کیمپ کے نشانات ہیں۔ دو تین دکانیں ہیں ایک مسجد کا احاطہ ہے۔ اس کے اندر وسط میں ایک سفید گنبد ہے۔ اور اسی کو علی مسجد کہتے ہیں۔ جنوبی سلسلہ ہائے کوہ پر حفاظت راہ کے لئے مورچے بنے ہوئے ہیں جن میں خیبر کے خاصہ دار رہتے ہیں۔ خیبر کا گاؤں راہ ہی میں آباد ہے۔ آفریدی قوم کے قلعہ نما مکانات ہیں جن میں ایک دو برجِ حفاظت بھی ہوتے ہیں۔ ہر مکان ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جس میں ایک شخص کا خاندان یکجا رہتا ہے۔ تمام درہ ایک خشک خطۂ زمین ہے۔ پہاڑ بھی سنگلاخ ہیں۔ مگر آج اس قدر محفوظ و مامون ہے کہ ایک چھوٹا بچہ سونے کی تھیلی ہاتھ میں لیکر حفاظت سے گذر سکتا ہے۔ سڑکوں اور ریلوے روڈ نے ہر طرح سے محفوظ کر دیا ہے۔

یہاں سے آگے چلکر سڑک تو میدان لواڑگی کی جانب نکل جاتی ہے۔ جس میں لنڈی کوتل کیمپ اور قلعہ ہے۔ اور ریلوے ایک درہ کے اندر جاکر لنڈی کوتل ریلوے سٹیشن پر ٹھہر جاتی ہے۔ یہاں ایک پہاڑی ہے جو میدان لواڑگی اور ریلوے سٹیشن کے درمیان واقع ہے۔ ریل یہاں سے ۔ میل اور آگے سرحد افغانستان تک جاتی ہے۔ یہاں سے آگے پانچ میل کے فاصلہ پر آخری ریلوے سٹیشن ہے۔ جسے لنڈی خانہ کہتے ہیں۔

لنڈی کوتل میں ایک قلعہ ہے جس میں فوج رہتی ہے۔ ہسپتال ہے۔ ڈاکخانہ ہے۔ اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحب خیبر کا دفتر ہے۔ اور پولیٹیکل تحصیلدار اور اس کا سٹاف ہے۔

قلعہ سے مشرق اور جنوب کو کیمپ ہے۔ بریگیڈ بازار۔ ایم۔ ای۔ ایس کے دفاتر ہیں۔ اور جنوب کو قافلہ سرائے ہے۔ جس میں قافلہ اور مقامی لوگوں کی ضروریات کے واسطے دکانیں ہیں۔ ہماری برق رفتار موٹر جس کے قابل اور سمجھدار ڈرائیور محمد یوسف خان درانی تھے۔ بغیر کسی توقف کے پیچ در پیچ راستہ سے گذر کر تورخم جا پہنچی۔ یہ سرکار انگریزی کی سرحدی چوکی ہے۔ مقام اگرچہ مختصر ہے۔ مگر نہایت سرسبز اور دلفریب قدرتی منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں محترم خان شیر افضل خان صاحب نائب تحصیلدار۔ خان بشیر احمد خان اور دیگر عزیز دوست نہایت تپاک سے ملے۔ پاسپورٹ دکھایا۔ اور خدا حافظ کہکر موٹر نے حرکت کی۔ اور آگے بڑھکر سرحد ہند اور افغانستان پر جا پہنچے۔ جہاں دونوں چوکیدار موجود تھے۔ برطانیہ کے خاصہ دار نے روڈ بار اٹھا کر راستہ دیا۔ اور افغان چوکیدار نے تار سیم کو اٹھا کر افغانستان کی حد میں داخل کیا۔ اس وقت جو جذبات ہمارے دلوں میں موجزن تھے ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو اسلامی ملک کو دیکھنے کے آرزو مند ہوں۔

افغانستان :- حدود افغانستان میں داخل ہوتے ہی کچھ فاصلہ پر مغرب کی جانب تورخم پہاڑ کے دامن میں کچھ درخت نظر آئے جہاں ایک چھوٹا سا خیمہ لگا ہوا تھا۔ جو دراصل سرحد دار صاحب کا دفتر تھا۔ ساتھ ہی ایک پیطرول کی دکان تھی۔ برآمدے میں رنگ برنگ کاغذوں کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ نیز اعلیحضرت محمد نادر شاہ شہید

نور اللہ مرقدہٗ کی شبیہہ مبارک اور اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ اور ہز ایکسیلنسی سردار محمد ہاشم خان کی تصاویر آویزاں تھیں۔ اور اس طرح جشن استقلال افغانستان کی خوشی منائی جا رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی پہاڑی پر افغان گورنمنٹ کا پوسٹ آفس ہے۔ عمارت پختہ اور خوشنما ہے۔ جو اعلیحضرت غازی امان اللہ خان نے تعمیر کرائی تھی۔ سامنے کلرکوں کے رہنے کے لئے کوارٹر بنے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سبزہ زار ہے۔ ساتھ ہی ایک قدرتی چشمہ ہے جس کے چاروں طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔

سرحدار ایک خوشرو نوجوان تھے۔ جو مامور صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ یاد رہے کہ افغان گورنمنٹ کے ہر سول افسر کو مامور کہتے ہیں۔ یہ ایک خلیق، حلیم الطبع، خوش کلام اور مستعد نوجوان تھے۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ کرسیوں پر بٹھایا اور چونکہ گرمی تھی اس لئے ٹھنڈے پانی سے تواضع کی۔ جو قدرتی چشمہ کا لذیذ و شیریں پانی تھا۔ ہمارے پاسپورٹ درج رجسٹر کر کے رخصت کیا۔

درہ خیبر کی پہاڑیاں ہنوز سڑک کے دونوں طرف موجود تھیں جن میں قوم شنواری آباد ہے یہ راستہ دراصل قدرتی نالے نے پیدا کر رکھا ہے۔ اس میں سڑک بطرف ڈکہ جاتی ہے۔ ہم ڈکہ کی طرف بڑھے۔ اور راستہ میں موقع بہ موقع افغان فوج کی چوکیاں نظر آئیں۔ حدود افغانستان میں اگرچہ صاف اور پختہ سڑک نہیں۔ تاہم ایسی بری بھی نہیں کہ مسافروں کو تکلیف کا احتمال ہو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد سامنے ایک سفید عمارت نظر آئی جو بنگلہ نما تھی۔ اس پر افغانی علم لہرا رہا تھا۔ باہر چاروں طرف جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے دریائے کابل بہ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے طبیعت میں ایک مسرت پیدا کر رہے تھے۔ یہ عمارت افسران فوج کا قیامگاہ ہے۔ کوئی معزز مسافر یا سیاح بھی یہاں ایک کمرہ میں قیام کر سکتا ہے۔ مسافروں کے پاسپورٹ بھی یہاں ملاحظہ ہوتے ہیں۔ اس جگہ گمرک (افغان کسٹم ہوس) ہے جس میں تمام مسافر لاریاں اور موٹریں داخل ہو کر قابل ٹیکس مال کا ٹیکس ادا کرتی ہیں۔ ہم اپنی برق رفتار موٹر سے اترے۔ مامور صاحب نہایت گرمجوشی سے ملے۔ اور اپنے دفتر میں لے گئے۔

گراموفون پر ماسٹر سہگل کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ چائے سے ہماری تواضع کی گئی۔ اس کے بعد پاسپورٹ درج کرانے کے لئے سامنے والی خوشنما عمارت میں گئے۔ یہاں فوج کا پہرا لگا ہوا تھا۔ فوجی نوجوان افغانی خوبصورت وردیاں پہنے ہوئے نہایت مستعدی سے اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ یہیں ایک صاحب اندر دفتر میں لے گئے۔ جہاں برگیڈیر سردار محمد ایاز خان آف لعل پورہ اپنی شاہی وردی پہنے ہوئے ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ان کے سڈول بدن پر وردی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ چہرہ سے متانت و سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ آپ تپاک سے ملے اور مزاج پرسی کے بعد ہمارے پاسپورٹ پر دستخط کر کے ہمیں رخصت کیا۔

ڈکہ چھاؤنی ۔ مقام ڈکہ لب دریائے کابل واقع ہے۔ جس کے شمال میں اقوام کابل کی پہاڑیاں ہیں۔ اُن کے دامن میں خوانین مہمند کا مشہور گاؤں لعل پورہ ہے۔ اور مشرق میں اقوام شنواری اور شلمانی کی پہاڑیاں ہیں۔ مغرب اور جنوب میں اقوام شنواری کا ملک ہے۔ یہ وہی اقوام ہیں جنہوں نے اعلیحضرت غازی امان اللہ خان سے بغاوت کی۔ انھوں نے ہی جلال آباد کو ویران کیا۔ ڈکہ کو لوٹا اور ملک میں بربادی پھیلائی۔ مگر اعلیحضرت محمد نادر شاہ شہید اور ان کے لائق بھائیوں کے حسن وتدبر اور حسن انتظام سے اب وفادار ہیں۔ ڈکہ سے اب ایک نئی سڑک کابل تک زیر تعمیر ہے۔ جس پر پختہ پل بن چکے ہیں۔ اور سڑک پختہ کی جارہی ہے۔ ڈکہ میں خورد ونوش کا خاصہ انتظام ہے اور مسافروں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہاں لاری اور موٹر کا تیل بھی مل سکتا ہے۔ جس کا انتظام شرکت پطرول افغانیہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو ہندوستان سے ارزاں فروخت کرتی ہے۔

علاقہ ننگ ونہار ۔ یہاں سے آگے گردی نامی گاؤں ہے۔ جو خیبر کی پہاڑیوں سے آگے آباد ہے۔ اور اچھا بڑا گاؤں ہے۔ اس کی زمین اب دریائے کابل سے سیراب ہوتی ہے۔ اس سے آگے ہزارناؤ نامی گاؤں ہے۔ یہاں کے مشہور ڈاکو ضلع پشاور میں ڈاکہ زنی کیا کرتے تھے۔ مگر سر جارج روس کیپل صاحب بہادر نے ان کی بیخکنی کی تھی۔ یہ علاقہ ننگ نہار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور جلال آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھے تو باسول آیا۔ یہ ایک بڑا موضع ہے۔ اس کی زمین بھی دریائے کابل سے سیراب ہوتی ہے یہاں دریائے کابل ایک پہاڑی درہ سے نکل کر میدان میں آتا ہے۔ یہاں سے آگے بھٹی کوٹ کا خشک اور گرم میدان ہے۔ جس کے لب سڑک حضرت خواجہ موسیٰ رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت ہے۔ یہ خطہ سخت گرم ہے۔ اور ہر وقت گرم لو چلتی رہتی ہے۔ ہم جس وقت پشاور سے روانہ ہوئے تھے تو بیس سیر برف بھی راستہ کے لئے لیکر ساتھ رکھلی تھی۔ لہذا یہاں برف نے بڑا کام دیا۔ اور گرم پانی کو ٹھنڈا کر کے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ موسے رحمتہ اللہ علیہ سانپوں اور بچھوؤں کے بادشاہ تھے۔ اس لئے ہر جمعہ کی رات یہاں بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہا اور بچھو سلام کے لئے آتے ہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ کہاں تک سچ ہے۔ بہرحال ہماری برق رفتار موٹر شیر شاہی علاقہ میں پہنچی۔ یہاں لب سڑک ایک بلند مقام پر افغانی چوکی ہے۔ جو نئی بنائی گئی ہے۔ یہاں سے آگے بڑھے تو راستہ میں ایک گاؤں جانب شمال آیا۔ جس کے ایک گوشہ پر حضرت میاں علی کی زیارت ہے۔ غرضیکہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد عمدہ پل نظر آئے۔ سڑک کی حالت بھی نہایت اچھی تھی۔ قریب پہنچے تو شہر جلال آباد کی عظیم الشان مگر خام فصیل نظر آئی۔ ہماری برق رفتار موٹر سیدھی باغ شاہی میں جاکر ٹھہری۔ ہم اترے۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر فریضۂ ظہر ادا کیا۔ اور باغ کی سیر کی۔ ۱۹۲۸ء میں جب بدبخت ازلی بچہ سقہ نے تخت کابل پر قبضہ کیا۔ تو اس وقت تمام ملک میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا اٹھاکر

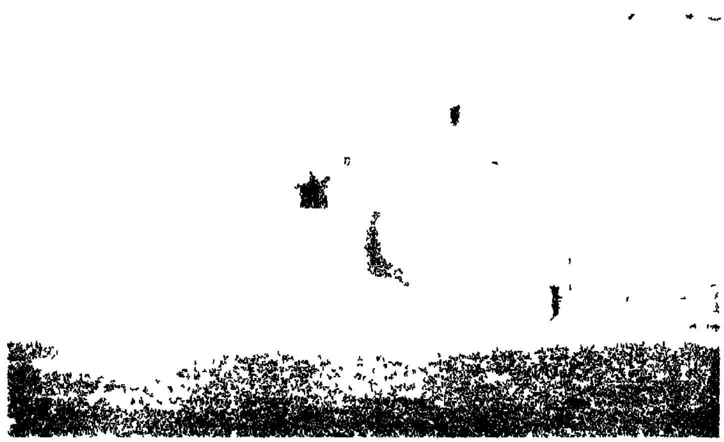
لے جا گا۔ غرضیکہ باغ کا اندرونی سامان تمام لوٹا چھوٹا پڑا تھا۔ بعض حصہ نذر آتش کر دیا گیا۔ باغی شاہی محل کے دروازے تک اُکھاڑ کرلے گئے۔ اور شہر تو بالکل جلا دیا گیا تھا۔ اب صرف ایک چھوٹا سا بازار ہے۔ اور باقی حصہ شہر کا آباد کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ امیر حبیب اللہ خان شہید کی قبر کے تعویذ کو بھی توڑ دیا گیا۔ جس کو دیکھکر دل بھر آیا۔ اور انقلاب کی مہیب تصویر آنکھوں کے سامنے کھچ گئی۔ دل نے کہا کہ جو لوگ انقلاب چاہتے ہیں وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس بدبخت انقلاب سے زندہ تو درکنار مردے بھی نہ چھٹکارا پا سکے۔ اور ان کی قبور تک کو بھی پامال کر دیا گیا۔ افسوس۔ بھائیو امن خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس لئے خدا کی دی ہوئی اس نعمت عظمیٰ کا ہر وقت شکریہ ادا کرو۔ اور ہمیشہ یہی ورد زبان رکھو۔ کہ ۔ ع

خدا محفوظ ۔ رکھے ہر بلا سے

شہر جلال آباد سے باہر مختصر سا بازار ہے۔ جہاں چائے وخورد و نوش کا سامان ملجاتا ہے۔ اور باغات اور سیر گاہیں ہیں۔ چاروں طرف سبزہ زار ہے۔ پانی ٹھنڈا ہوا معتدل ہے۔ نیز چونکہ یہ سمت مشرقی کا دارالخلافہ ہے۔ لہذا یہاں حاکم اعلےٰ گورنر جلال آباد رہتا ہے۔ افغانی فوج کی چھاؤنی ہے۔ لب سڑک سراج المحل ایک عمدہ عمارت اور خوبصورت باغ ہے۔ اس کے بالمقابل وہ بڑا باغ ہے جس کے اندر ایک سبز رنگ کا گنبد ہے۔ اور مسجد ہے۔ سامنے امیر حبیب اللہ خان شہید کی قبر ہے۔ جو اپنے کیمپ میں رات کے وقت فروری ۱۹۱۹ء میں پستول سے شہید کر دئے گئے تھے۔

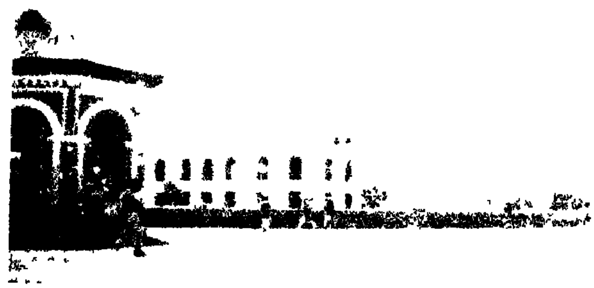
نہر سراج ۔ جلال آباد سے تھوڑا آگے چل کر فاصلہ پر سڑک کو دو شاخوں میں منقسم پایا۔ یہاں دریائے کابل میں دریائے چترال آکر ملتا ہے۔ اس کے قریب مقام سے نہر سراج امیر حبیب اللہ خان شہید نے ہزاروں روپے کے خرچ سے شروع کی تھی۔ اور اعلیحضرت امان اللہ خان کے عہد حکومت کے آخری ایام تک پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ آخر کار اعلیحضرت محمد نادر شاہ شہید نے اسے مکمل کیا۔ اور اب قریباً پچاس ہزار جریب زمین اس سے آبپاشی ہوتی ہے۔

چار باغ ۔ جلال آباد سے آگے تمام ملک سرسبز اور شاداب ہے۔ بڑے بڑے دیہات اور سرسبز باغات ہیں۔ اناج کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ چند میل کے فاصلہ پر چار باغ آیا۔ جو خوب آباد ہے۔ یہاں گاؤں سے باہر حضرت صاحب چار باغ جن کو نقیب صاحب بھی کہتے ہیں۔ مقیم ہیں۔ یہ نقیب صاحب حضرت شیخ عبد القادر گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں اور سجادہ نشین ہیں۔ تمام افغانستان میں ان کے کثرت سے مرید ہیں۔ افغان گورنمنٹ آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو سڑک سے جنوب کو نشیب میں چار چشمہ ہے۔ جہاں کا پانی بہت سرد اور خوش ذائقہ ہے۔ گاؤں اچھا خاصہ آباد ہے۔ چشموں کی طرف ایک راستہ جاتا ہے















جس پر دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔

سلطان پور اور فتح آباد - یہاں سے آگے بڑھے تو سلطان پور کا گاؤں آیا۔ اس طرف فارسی بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ پانی کا رنگ سرخ ہے۔ اس سے اور آگے بڑھے تو میدان چٹیل آگیا۔ آخر پھر سبزہ آیا۔ اور بڑے گاؤں میں جس کو فتح آباد کہتے ہیں جا پہنچے۔ یہاں بھی فارسی زبان ہے۔

ہماری برق رفتار موٹر نے اب وادی ننگلہ کا رخ کیا۔ راستہ میں ایک بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر پشتو اور فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا کہ یہ سڑک دریری مقام کو جاتی ہے۔ یہ علاقہ دانہ دار اور بے دانہ انار کے واسطے مشہور ہے۔ ایام گرما میں حاکم اعلیٰ جلال آباد اور جلال آباد کا برطانوی قونصل بھی یہاں آجاتے ہیں۔

ہم دائیں جانب آگے بڑھے تو بعض مقامات پر بدبخت ازلی بچہ سقہ کے زمانہ کے پلوں کو ٹوٹا ہوا پایا۔

چند میل آگے بڑھے تو ہوا یہاں خوشگوار معلوم ہوئی۔ طبیعت باغ باغ ہونے لگی۔ چار طرف سبزہ ہی سبزہ معلوم ہوا کہ یہ وادی ننگلہ ہے۔ یہاں کثرت سے باغات ہیں۔ ایک بڑا گاؤں ہے۔ یہاں کے انار بہت مشہور ہیں۔ ہماری برق رفتار موٹر نے کچھ فاصلہ پر آگے چل کر ایک خوبصورت عظیم الشان باغ میں توقف کیا۔ یہ باغ قدیمی ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک بڑی پختہ فصیل ہے۔ دو بڑے دروازے ہیں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ چار بڑے تالاب ہیں جن میں فوارے لگے ہوئے ہیں۔ باغ کے وسط میں ایک بڑی سڑک ہے۔ جس کے دونوں طرف سرو کے خوشنما درختوں کی قطاریں ہیں۔ ایک شاہی عمارت ہے جس میں بہترین رہائش کا سامان ہے۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ مسافر ہر وقت یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ اور عمدہ سے عمدہ کھانا تیار مل سکتا ہے۔ باغ ہر وقت قدرتی پھولوں سے سجا رہتا ہے۔ صفائی کا نہایت اعلےٰ انتظام ہے۔ نیز اس باغ میں ایک قسم کے پھول ہیں۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو اور مہک سے دماغ تر اور طبیعت خوش ہوتی ہے۔ تالاب بالکل لاہور کے شالامار کی طرح ہیں۔ نیز پلاٹ کے گرداگرد پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہتی ہیں۔ جن میں چشموں کا شفاف پانی آتا ہے۔ ہم یہاں اترے۔ ہاتھ منہ دھو کر فریضۂ عصر ادا کیا۔ طبیعت تو یہی چاہتی تھی کہ رات یہیں قیام کریں۔ مگر اختلاف الرائے سے مجبور ہو کر آگے روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دور جا کر موضع ہاشم خیل آیا۔ ایک پہاڑی نالہ کے کنارے پر چند دکانیں ہیں۔ سڑک کے دوسری جانب ایک پختہ چشمہ ہے۔ جس کا پانی نہایت سرد اور لذیذ ہے۔ کوہ سفید جو علاقہ ڈکہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور سرحدات تیراہ اور کرم ایجنسی کے واسطے دیوار کا کام دیتا ہے اور افغانستان اور ان ممالک میں سد سکندری بنا ہوا ہے۔ یہاں بہت قریب آجاتا ہے۔ اور یہاں سے صرف ۱۲ گھنٹے میں ایک شخص پیادہ پا کرم ایجنسی کے صدر مقام پارہ چنار کو جا سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اعلیحضرت محمد نادر شاہ شہید۔ ہز ایکسلنسی

سردار محمد ہاشم خان اور ہز ایکسیلنسی سردار شاہ ولی خان انقلاب افغانستان کے زمانہ میں جب فرانس سے پشاور تشریف لائے۔ اور ملک برکت علی سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ کے بنگلہ پر ٹھہرے تو مولانا ظفر علی خان بھی لاہور سے ان حضرات کے ساتھ آئے تھے۔ ان دنوں اعلیحضرت امان اللہ خان قندھار میں تھے۔ اور بدبخت ازلی بچہ سقہ کابل میں تھا۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ کے سوا باقی سرحد پنجاب وہندوستان کے عوام وخواص، خورد وکلاں پیر وجوان نیز ہر فرقہ کے لیڈروں نے شاہ موصوف کو مجبور کیا کہ آپ قندھار تشریف لے جائیں۔ تاکہ اعلیحضرت امان اللہ خان کو مدد مل سکے یہاں تک کہ پشاور میں شاہ موصوف کی آمد پر بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ اور قریباً ساٹھ ہزار کے مجمع میں مولانا ظفر علی خان نے شاہ موصوف کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہا کہ آپ کو ہر حالت میں قندھار ہی جانا ہوگا۔ مگر ان لیڈران ملک سے زیادہ شاہ موصوف اپنے گھر سے واقف تھے۔ وہ اپنے ملک کے راستوں سے آشنا تھے۔ نیز دشمن کو شکست فاش دینے کے داؤ پیچ میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ اس لئے اس وقت مصلحتِ وقت سے کام لیکر لوگوں کی ہاں میں ہاں ملادی۔ لیکن کیا وہ جو اپنے دل میں تھا۔ اور آخر غلام ہندوستانیوں کی غلامانہ رائے کے زہریلے اثر سے خداوند ذوالجلال والاکرام نے انہیں بچالیا۔ ورنہ ان عاقبت نا اندیش لوگوں کی باتوں میں آکر شاہ موصوف قندھار چلے جاتے تو آج افغانستان کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ بہر حال خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ شاہ شہید نے اپنے حسن وتدبر اور اپنے لائق اور جلیل القدر بھائیوں کی اتفاق رائے سے کرم ایجنسی میں سے ہوکر افغانستان میں علی خیل کے پاس قیام کیا۔ اور یہیں سے کمربستہ ہوکر چاروں طرف سے بدبخت ازلی بچہ سقہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور آخر کار اسے فی النار والسقر کر کے ملک میں بڑھتی ہوئی آگ کو بجھایا۔ اور اپنی قوم کو امن کا پیغام دیتے ہوئے فتنہ وفساد کی جڑ کاٹ ڈالی۔

یہاں کوہ سفید کی ایک بلند ترین چوٹی ہے۔ جو سکارام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک تو کدار چوٹی ہے۔ اور دائمی طور پر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ اسی نسبت سے اس کو کوہ سفید کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کی وادیوں میں جمکنی اور ارجاجی اقوام کا مسکن ہے اور اسی پہاڑ کے سلسلہ میں وادی کابل بھی واقع ہے۔ ہاشم خیل سے آگے گندلک کا گاؤں ہے۔ اور گندلک سے آگے چند میل پر ایک اور وادی ہے جس کے شمال مغرب کو بلند پہاڑ ہیں۔ اور ان کے دامن میں رود سرخ بہ رہا ہے۔ اس رود پر ایک بڑا پختہ پل بنا ہوا ہے۔ رود سرخ سے آگے ایک دوسری وادی میں داخل ہوئے۔ جس میں لب نالہ کو ہی ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ جس کو کلالہ یا کلالی کہتے ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھے تو کچھ میل مٹی کے تودوں سے ہوکر جگدلک کی وادی میں جا پہنچے۔ یہاں عقیق کی کان ہے۔ یہاں سے آگے بڑھے تو تودہ ہائے خاک میں چکردار راستہ کاٹ کر فرمان بیگ نامی گاؤں

کے پاس پہنچے۔ جس کے چند دکانیں اور مکانات لب سڑک واقع ہیں یہاں سے شمال کی طرف دامن کوہ میں ایک سرسبز وادی میں سروبی کا موضع ہے جس میں حاکم رہتا ہے۔ آگے کنڈہ سنگ اور برکاؤ کے مواضع آئے۔

برکاؤ سے آگے گذر کر تیزن کے مقام پر پہنچے۔ یہاں زبان فارسی کا خاتمہ ہوا۔ اور افغانوں کی آبادی شروع ہوئی۔ یہاں سے خاک جبار کے ٹیلے شروع ہوتے ہیں۔ جو بہت بلند اور وسیع قطعہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں ان میں پہاڑیاں بھی ہیں۔ اور یہ سلسلہ کابل خورد پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور اس کے درمیان خاک جبار کا موضع آجاتا ہے۔ یہ تو دہائے خاک مٹی ریت اور گول پتھروں کا مجموعہ ہے۔ افغانستان کے پہاڑ سونا۔ چاندی کوئلہ۔ پٹرول۔ تیل۔ مٹی۔ لعل عقیق۔ فیروزہ۔ جواہرات۔ اور دیگر قیمتی معدنیات سے بھرپور ہیں۔ مگر افسوس کہ اس وقت تک کوئی باقاعدہ محکمہ اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اگر افغان گورنمنٹ ممالک یورپ جرمنی یا امریکہ میں معدنیات کے کام کے واسطے نوجوان تیار کرلے تو ملک کی تمام مشکلات ایک چٹکی بجاتے میں دور ہوسکتی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمام افغانستان میں صرف معدودے چند ہستیاں ہیں جن کے دم قدم سے افغانستان ترقی کر رہا ہے۔ اور ہماری دلی دعا ہے کہ خدا وندعالم انہیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ تاکہ ملک میں امن رہے اور رعایا خوشحال ہو۔ ورنہ ان کے سوا باقی تمام افسر پوری توجہ اور دلچسپی سے اپنا فرض ادا نہیں کرتے۔

خاک جبار سے گذر کر کابل خورد کی وادی میں داخل ہوئے۔ اس کے چاروں طرف بلند پہاڑیاں ہیں۔ اور کوہ سفید قریب تر واقع ہے۔ کوہ سفید سے پانی کا نالہ آتا ہے۔ اور ایک میدان میں جمع ہوتا ہے۔ جس کے سامنے ایک درہ میں اعلیحضرت امان اللہ خان نے ایک بلند بند لگوایا تھا۔

بند میں دو سوراخوں سے بڑی مقدار میں پانی نکلکر ایک نالہ بن جاتا ہے۔ جو وادی کابل کی طرف جاتا ہے۔ اور اس سے کئی گاؤں سیراب ہوتے ہیں۔

بت خاک اور کنڈہ خیل اور دہ سبز کے علاقے۔ یہاں کثرت سے وہ خربوزے پیدا ہوتے ہیں جنکو فارسی میں گرما اور سردہ کہتے ہیں۔ اور بہت سستے بکتے ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھے تو ایک ٹیلہ آیا۔ جہاں سے کابل کا شہر تین چار میل دور ہے۔ اس میں سے صاف اور پختہ سڑک گذرتی ہے۔ یہاں ایک چوکی ہے۔ جہاں موٹر ڈرائیوروں کے پاسپورٹ لے لئے جاتے ہیں۔ اب چونکہ اندھیرا ہو چکا تھا نیز سردی بھی اچھی خاصی تھی۔ اسلئے ہم نے یہاں توقف کیا اور اپنے بستر کھولکر دراز ہوگئے۔

آج ماہ اگست کی ۲۷ تاریخ ہے۔ دن جمعہ کا ہے۔ آج جشن استقلال افغانستان کا پہلا روز ہے سامنے چاروں طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ ہم جلدی جلدی اٹھے ہاتھ منہ دھوکر چائے پی۔ اور اپنی برق رفتار موٹر پر سوار ہوکر شہر کابل کا رخ کیا۔ راستہ میں اگرچہ چوکی پر پاسپورٹ لے لئے جاتے ہیں

مگر ہمیں شاہی مہمان ہونے کی وجہ سے نہ روکا گیا۔ اور ہم چند منٹوں میں چمن حضوری کے قریب جا پہنچے۔ جہاں سڑک کے دونوں طرف فوجی کیمپ لگا ہوا تھا۔ پہرہ دار نہایت مستعدی سے کھڑے ہوئے تھے۔ سڑک پر کچھ کچھ فاصلہ پر بڑے بڑے خوشنما دروازے بنے ہوئے تھے۔ جن پر افغانی علم لہرا رہا تھا۔ یہ چمن حضوری ایک سرسبز وسیع میدان ہے۔ جو امیر حبیب اللہ خان شہید کی یادگار ہے۔ اس کے چاروں طرف سڑک بنی ہوئی ہے اور شمالی گوشہ پر ایک عظیم الشان دومنزلہ عمارت ہے۔ جس کو فوائد عامہ کا دفتر کہتے ہیں۔ یہاں پشاور کی سڑک ختم ہو جاتی ہے۔

ہماری برق رفتار موٹر اب اس سڑک پر آئی جو بالا حصار کی طرف سے آکر شمال کو نکل جاتی ہے۔ یہ بہت وسیع اور خوبصورت پختہ سڑک ہے۔ پشاور کی سڑک کے بالکل متصل چوک میں ایک عالیشان سفید مینار نو تعمیر کھڑا ہے۔ جسے منارہ نجات کہتے ہیں۔ اور یہ اس واقع کی یادگار ہے جبکہ اعلیحضرت غازی محمد نادرشاہ شہید نور اللہ مرقدہٗ نے بدبخت ازلی بچہ سقہ اور اس کے حواریوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر افغانستان کی برباد شدہ حکومت کو بحال کیا۔ ہم منارۂ نجات سے گذر کر اب اس کشادہ سڑک پر پہنچے جو قریباً ۸۰ فٹ چوڑی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کی قطاریں ہیں۔ مغرب کی طرف ایک یوروپین سٹائل کی سرخ دو منزلہ عمارت ہے۔ جس کے نیچے بڑی بڑی دکانیں اور اوپر بالاخانے ہیں۔ اور اسی عمارت کو صنعتی نمائش کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ تمام عمارت کی جملہ دکانیں اور بالاخانے روسی۔ جرمنی۔ جاپانی۔ ترکستانی۔ افغانی اور ہندوستانی و امریکائی سامان سے بغرض نمائش آراستہ تھیں۔ اس سے آگے بجانب مغرب ایک بڑے اور وسیع احاطہ میں عیدگاہ ہے۔ اور آگے دریائے کابل کے پل کے متصل ایک نہایت خوبصورت دروازہ بنا ہوا جس پر افغانی علم لہرا رہا تھا دروازہ سبز رنگ کی مصنوعی گھاس سے آراستہ تھا جس کے اندر بجلی کے رنگدار قمقمے رات کے وقت نہایت خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ یہ دروازہ بالکل دروازہ ارک شاہی کے بالمقابل ہے۔ نیز اس کے قریب ہی سڑک کے درمیان منارۂ استقلال ہے۔ جو سابق شہریار افغانستان نے جنگ آزادی کے بعد تعمیر کرایا تھا۔ اس کے اوپر شاہ شہید اعلیحضرت غازی محمد نادرشاہ خلد آشیانی کا مجسمہ تھا۔ جسے بدبخت ازلی بچہ سقہ نے اپنے زمانہ جاہلیت میں توڑ دیا۔ اب اس کے گرداگرد چار توپیں تھیں۔ اور بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

کمرک۔ دریائے کابل سے گذر کر چار طرف راستہ جاتا ہے۔ یہیں سڑک کے دائیں جانب ایک خوبصورت گھنٹہ گھر ہے۔ یہاں سے ایک سڑک ارک شاہی کو جاتی ہے۔ جو ارک کے سامنے سے گذر کر اس بڑے دروازہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس کو دروازہ نقارخانہ کہتے ہیں۔ اس کے بائیں جانب کابل ہوٹل

بازار شاہی۔ وزراء کے دفاتر اور محلات کو راستہ جاتا ہے۔ دوسری طرف بازار میں سے ہو کر پل خشتی اور لب دریا کو راستہ نکلتا ہے۔ دوسری سڑک طیارہ گاہ کو جاتی ہے۔ تیسری سڑک کابل شہر سے باہر دہ افغانان اور شیر پور چھاؤنی کو اور چوتھی دریا کے کنارے شہر کو اور پل خشتی کی طرف نکل جاتی ہے۔ اس سڑک کے دائیں طرف میدان میں گمرک کی نئی شاندار عمارت ہے جس میں ہندوستان اور دوسرے ممالک سے آمدہ لاریاں اور موٹریں سیدھی داخل ہوتی ہیں۔ اور وہاں سے کابل آتے جاتے وقت کسٹم کا حساب کیا جاتا ہے۔ ہماری برق رفتار موٹر نے یہاں قدرے توقف کیا۔ خوبرو و خوش پوش نوجوان کسٹم آفیسر نہایت تپاک سے ملے۔ اور بعد میں ہم ان سے رخصت ہو کر سیدھے کابل ہوٹل کے پاس جا پہنچے۔

کابل ہوٹل۔ اس ہوٹل کی دو منزلہ عمارت نہایت عظیم الشان و قابل دید ہے۔ فرنیچر اور دیگر سامان نہایت عمدہ۔ نیز انتظام انگریزی طرز پر ہے۔ ہوٹل کا منیجر ایک فرانسیسی نوجوان ہے۔ جو انگریزی زبان کے علاوہ فارسی اور پشتو قدرے سمجھ سکتا ہے۔ یہ ہوٹل گورنمنٹ کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔ انتظام نہایت احسن اور بہرے۔ خانسامے۔ خدمتگار چست و چالاک تھے۔ جو سفید کوٹ سے ہر وقت ملبوس رہتے تھے۔ ایام جشن میں کثرت مہمانان کی وجہ سے دوسری عمارت جو صاحبقران امیر عبدالرحمن خان جنت مکان کے مقبرہ کے باہر بر لب سڑک واقع ہے خالی کرائی گئی تھی۔ یہ خوشنما عمارت خوبصورتی اور محل وقوع کے باعث اگر کابل ہوٹل سے زیادہ نہیں تو کسی لحاظ سے کم بھی نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہمارا اسباب بھی کثرت مہمانان کی وجہ سے دوسری عمارت میں اتارا گیا تھا۔ وزیر معارف کے آدمی نیز ہوٹل کے منتظمین نہایت خوش خلق اور نہایت شریف انسان تھے۔ خصوصاً میرے محترم دوست جناب محمد میاں صاحب متعلم ایف۔ اے کلاس حبیبیہ کالج نے ہماری صحیح راہنمائی فرمائی۔ جن میں قیمتی قالینوں کا فرش کیا ہوا تھا۔ نیز دیگر ضروریات کا سامان بھی نہایت ستھرا اور صاف و نفیس لگا دئے گئے۔ ہم نے جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر کپڑے بدلے اور چمن حضوری کی طرف روانہ ہو گئے۔

جشن استقلال دولت خداداد افغانستان

۱۷ اگست ۱۹۳۴ء

آج جمعہ کا مبارک دن ہے۔ آج جشن استقلال افغانستان بعہد سلطنت اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ غازی بادشاہ افغانستان چمن حضوری میں منایا جاتا ہے۔ اس لئے صبح سویرے ہی افواج و عساکر افغانیہ کا دستہ رنگا رنگ وردیوں میں ملبوس چمن حضوری میں جمع ہونی شروع ہوئیں۔

تماشہ بین حضرات باشندگان شہر کابل۔ مہمانان و نمائندگان۔ دولت افغانستان و نوواردان و سیاحان ہند وغیرہ بھی کثرت سے جمع ہونے لگے۔ قریباً دس بارہ ہزار فوج و توپ خانہ و رسالہ پیادہ و سوار و سامان حرب و موٹر لاری ہائے انتقال سامان و بحیثی سڑک وغیرہ بھی بغرض نمائش و سلامی فراہم ہوئے۔ ٹھیک آٹھ بجے صبح اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ غازی کا جلوس بمع وزراء و سفراء دول و نمائندگان ملک ارک شاہی سے نکلا۔

سبحان اللہ! نوجوان شہنشاہ اسلام بالکل سفید لباس میں ملبوس۔ آگے اسلامی پرچم لہرا رہا ہے۔ وزراء، امراء، سفراء نوجوان شہریار کو احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ گویا مہتاب ستاروں میں جلوہ گر ہے۔ سامنے قدرتی پہاڑوں کے دلفریب مناظر۔ سڑکیں مصفا۔ ہر کہ ومہ اپنی اپنی بساط کے مطابق نئے کپڑے پہنے ہوئے دیدار شاہ کے لئے بیتاب ہے۔ کان اسلامی بینڈ کی سریلی اور پرجوش آوازیں سن رہے ہیں۔ اعلیحضرت نے یادگار فتح تل پر جشن آزادی کی یاد میں تقریر فرمائی۔ اور وہاں سے جلوس شاہی روانہ ہو کر گھنٹہ گھر کے سامنے پل چوبی پر سے گذر کر اس دروازہ میں سے گذرا جو لب دریا و یادگار جشن میں بنایا گیا تھا۔ اور خوبصورت و خوشخط کتبہ نیز بجلی کے نفیس قمقموں سے آراستہ تھا۔ جامع مسجد کے سامنے سے عمارت دفتر وزارت فوائد عامہ کی طرف مڑ گیا۔ جو عمارت عظمےٰ چمن حضوری کے شمال کو روبہ چمن و جنوب واقع ہے۔ اور جس کی دوسری منزل پر وزراء، امراء سلطنت اور سفرائے دول اور مہمانوں کے واسطے انتظام نشست کیا گیا تھا۔ اعلیحضرت کی آمد کی خبر سلامی کے بینڈ سے مشتہر ہوئی۔ سب سے پہلے شیخ السفراء سفیر روسیہ نے دول خارجہ کی طرف سے ایڈریس پڑھا اور اعلیحضرت نے جوابی تقریر فرمائی۔ پھر سردار عبدالاحد خان صدر مجلس شوریٰ ملیہ نے ایڈریس پڑھا۔ اور اعلیحضرت نے جوابی تقریر فرمائی۔ اس کے بعد اعلیحضرت نے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر افواج کی سلامی لی۔ نوجوان شہنشاہ اسلام محمد ظاہر شاہ اور وزراء نے اعلیحضرت محمد نادر شاہ کے روضۂ اطہر کی طرف منہ کر کے سلامی دی۔ پھر وزیر حربیہ ہز ایکسیلینسی سردار شاہ محمود خان غازی سفید گھوڑے پر سوار ہو کر سامنے آئے اور سلامی ادا کی۔ اور پیادہ افواج بغرض سلامی سامنے سے گذرنے لگی۔ تمام فوج کے افراد نوجوان اور خوشرو تھے۔ وردیاں بالکل نئی اور خوبصورت تھیں۔ سروں پر جرمنی فوج کی طرح لوہے کے خود پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ہیوی بوٹ تھے۔ ہر ایک شخص نہایت چستی اور مستعدی سے اپنا فرض ادا کرتا تھا۔ ہر فوج کا اپنا اپنا جدا علم تھا۔ جو ہوا میں لہراتا ہوا نہایت شاندار معلوم ہوتا تھا۔ پیادہ عساکر کے بعد رسالہ کے سوار سلامی ادا کرتے ہوئے گذرے۔ تمام افسر اور سپاہی بارعب اور



دروازه عمارت …



دفتر دوائر عامه حکومتی - کابل

Durga Art Press Anarkali Lahore



[illegible]



فوجی لاریاں اعلیحضرت کی سلامی اتار رہی ہیں

مضبوط تھے۔ ان کے بعد توپخانہ گذرا جن میں قلعہ شکن انٹی ٹینک توپیں بھی تھیں۔ بعدہ مشین گنیں گذریں جنگی ٹینک گذرے۔ آرمرڈ کاریں اور نقل وحرکت سامان والی لاریاں گذریں۔ ہوائی جہازوں نے پرواز کی۔ تین درمیانہ اور ایک بڑا ہوائی جہاز تھا۔ جہاز چلانے والے بھی افغان نوجوان تھے۔ سڑک ساز موٹریں بھی سلامی میں شامل تھیں۔ ان کے بعد آگ بجھانے والے انجن بھی لائے گئے۔ اور سلامی اتار کر گذر گئے۔ ٹھیک ۲ بجے جلوس سلامی ادا کر کے فارغ ہوا۔ اور افواج وپیادہ سوار و توپ سب چمن کے ساتھ ساتھ کچی سڑک پر سے گذر کر جنوب کا رخ کرتے اور پشاور کی سڑک پر سے گذر کر مینارہ نجات کے پاس شمال کی طرف پختہ سڑک پر چھاونی شیرپور کو رخصت ہوتے جاتے تھے۔

آخر میں اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ غازی اور وزراء وسفراء وسب ٹمین سے واپس ہو کر اپنے اپنے مقام کی طرف رخصت ہوئے۔

چمن حضوری میں ہر ایک میلہ لگا رہا۔ اور عمارت فوائد عامہ کی پشت کو بطرف شمال پہلوانوں کی زور آزمائی کا اکھاڑہ تھا۔ بہت سے لوگ کشتی کے تماشہ میں ٹکٹ خرید کر شامل ہوئے۔

میدان چمن میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا جو ایک افغانی روپے (انگریزی چار آنہ) پر ملتا تھا۔ اور وہی آخر روز تک کام آتا رہا۔ شام کو تمام چمن کے گرد عمارت امور فوائد عامہ۔ منارہ نجات۔ منارہ استقلال۔ دروازہ جشن پل چوبی۔ تمام سڑکوں کے چاروں طرف بجلی کے ہزار ہا بلب روشن تھے۔ ایسا نظر آتا گویا آسمان زمین پر اتر آیا ہے۔ اور بجلی کے قمقمے آسمان کے ستارے بن گئے ہیں۔

(باقی آئندہ)

"ریحانہ سے"

(جناب خان صابر خلیلی امرتسری)

ریحانہ آؤ گی کب تک (۱) رستہ دکھلاؤ گی کب تک
وعدوں کی حد بھی ہے کوئی　　بہلاتی جاؤ گی کب تک
ساون بھی روتا ہے مجھ پر　　دریا رلواؤ گی کب تک
یہ بھیگے دن۔ یہ بھیگی راتیں　　آخر ترساؤ گی کب تک
خط بھیجا تھا "آئیں گے ہم"　　آؤ بھی آؤ گی کب تک
آؤ بھی آؤ گی کب تک
آؤ ریحانہ! آجاؤ

(۲)

چاہت کی بازی ہے پیاری　　میں نے من کی مایا ہاری
تو موہن جوبن کا مندر　　میں سندر کا پریم پجاری
کیوپڈ نے وہ ناوک مارا　　ہردے میں گھاؤ ہے کاری
اب تو میں غم میں کھویا ہوں　　تیری بھی آئے گی باری
پریم کا پھندا وہ پھندا ہے　　جس کے قیدی ہیں نر ناری
جس کے قیدی ہیں نر ناری
آؤ ریحانہ آجاؤ

(۳)

تیری فرقت میں روتا ہوں　　غم سے دیوانہ ہوتا ہوں
دن بھر بیتابی ہے مجھکو　　راتوں کو بھی کب سوتا ہوں
دیکھوں کیا پھل لائے کھیتی　　اشکوں کے دانے بوتا ہوں
بھرتا ہوں آہیں پر آہیں　　روپ جوانی کا کھوتا ہوں
بلکل تو بھی میری ہو جا　　میں ہر دم تیرا ہوتا ہوں
میں ہر دم تیرا ہوتا ہوں
[illegible]

(۴)

بگلوں کی یہ ریت رہی ہو　　دل کو غم سے پریت رہی ہے
دنیا کے پیچھے کیا لگنا　　دنیا کس کی میت رہی ہے
یاد آتی ہے رہ رہ کر تو　　یونہی دل کو جیت رہی ہے
دل کو کیوں ویراں کرتی ہو　　اسمیں تیری بیت رہی ہے
آخر جھوٹے وعدے کب تک　　دیکھ! جوانی بیت رہی ہے
دیکھ جوانی بیت رہی ہے
آؤ ریحانہ! آجاؤ

(۵)

میں بیراگی تو بیراگن　　دونوں کا پن ہے پگلا پن
پگلا پن بھی وہ پگلا پن　　دنیا بھر ہے جس کی دشمن
آ مل کر دونوں کرلیں سر　　غم کا ان بھی ہے کوئی رن
بستی کے باسی ہیں حاسد　　آ کر لیں صحرا میں مسکن
پریم نگر میں گم ہو جائیں　　آبادی سے بہتر ہے بن
آبادی سے بہتر ہے بن
آؤ ریحانہ! آجاؤ

(۶)

پریم نہیں گر من کے اندر　　من ہے بے مورت کا مندر
دھرتی ہم کو راس نہ آئی　　آ ڈھونڈیں اب اور کوئی گھر
اڑ کر پریم کے طیارے میں　　ہم پہنچیں آکاش کے اوپر
چاند کے ہالے میں بس جائیں　　نور میں ہوں نورانی پیکر
اور ملکر وہ راگ الاپیں　　تارے ناچیں جسکی لے پر
تارے ناچیں جس کی لے پر
آؤ ریحانہ آجاؤ

پیغام حیات

(از مولانا محمد عبد السلام صاحب تمیم سرحدی مد ظلہ العالی ...)

جہانِ مردہ دل کیواسطے پیغام جاں بنجا
خزاں دیدہ گلستاں میں بہارِ جاوداں بنجا

مٹادے دیکھ ہر حرفِ غلط کو صفحۂ دل سے
جہاں میں خدا مست اسلام کی اِک داستاں بنجا

ہزاروں بت ہوں دیرِ دل میں لیکن تو مسلماں ہے
بتوں کو توڑ کر توحید کا پھر پاسباں بنجا

بدل کر نفس امارہ کو نفسِ مطمئنہ سے
جہاں پر ابرِ نیساں کیطرح گوہر فشاں بنجا

غلامی نفس و شیطاں کی تباہیِ دو عالم ہے
خدا کے ذکر میں ہردم رہے جو وہ زباں بنجا

خدارا کاہلی کو چھوڑ کر اب صدق و ایماں سے
اگر رہنا ہے دنیا میں تو جانِ عز و شاں بنجا

غلامی میں رسول اللہ کی رہکر قیامت تک
زمانے کیلئے اِک آفتابِ ضو فشاں بنجا

اگر دونوں جہاں میں آبرو کی ہے طلب تجھکو
سلیمہ اب اُنکے دروازے کا سنگ آستاں بنجا۔

لچھمی

از جناب سید کاظم دہلوی ایڈیٹر رسالہ کہکشاں دہلی

دیوالی کا تیسرا دیا تھا۔ تمام شہر چراغاں کیا گیا۔ رئیسوں کی عظیم الشان حویلیوں امیروں کی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتوں کا تو کہنا ہی کیا۔ غریب سے غریب گھر بھی بڑی سج دھج زیب و زینت سے سجایا گیا تھا۔ روشنی کا یہ عالم تھا۔ کہ ذرہ ذرہ چراغ حسن چپہ چپہ بقعۂ نور تھا۔ گھر گھر خوشیوں کے سامان مسرت کے اسباب مہیا تھے۔ چھوٹوں سے لیکر بڑوں تک جسے دیکھو باغ باغ نظر آتا تھا۔

بازار کی رونق دکانوں کی آرائش و زیبائش غضب روشنی سونے پر سہاگہ تھی۔ بازار میں لوگوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں پرا جمائے کھڑی تھیں۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ایسی بھیڑ بھاڑ تا کہ اگر تھالی پھینکو تو زمین پہ نہ گرے۔ ادھر سودا خریدنے والوں کی چیخ و پکار، تماشائیوں کا شور و غل ادھر موٹر ٹیکسی والوں کی ہٹو بچو۔ کان پڑی آواز نہ آتی تھی۔

شہر کے مشہور سیٹھ کرشن نے اپنی فلک بوس کوٹھی میں سارے شہر سے زیادہ روشنی کی۔ تمام کوٹھی پڑی جگمگا رہی تھی۔ عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہر شخص حیرت زدہ اور قائل تھا۔ کہ کرشن سیٹھ نے سارے شہر سے بڑھ چڑھ کر روشنی کی ہے۔ شائد لچھمی اسی کے گھر اتر آئے۔

کوٹھی کے اندر ایک کمرہ بڑے کروفر سے سجایا گیا تھا۔ اور اس میں ساری کوٹھی سے زیادہ روشنی تھی۔ نوجوان، خوبصورت کرشن قیمتی لباس زیب تن کئے اسی کمرہ میں بیٹھا۔ اپنے دوستوں سے خوش گپیاں کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے۔ تو کرشن کے ایک گہرے دوست نے ازراہ مذاق کہا۔

کرشن آج تم نے سارے شہر سے زیادہ روشنی کی ہے۔ اور دیوی دیوتاؤں کا جی خوش کیا ہے۔ آج "لچھمی" تمہارے ہی ہاں آئیگی۔ کرشن نے مسکرا کر بات ٹالدی۔

تھوڑی دیر کے بعد کرشن کے احباب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اور وہ پوجا پاٹ کی تیاری کرنے لگا۔

شہر میں کرشن کے کئی بلز کپڑے کے چل رہے تھے۔ ہنڈی پرچے کا کام بھی جاری تھا۔ اس کی کوٹھی میں جہاں بیسیوں آدمی نوکر تھے۔ وہاں ایک ساٹھ پینسٹھ کے پرشہ بوڑھے شخص کمار بھی ملازم تھے۔ کرشن کی نظروں میں کمار کی بڑی عزت تھی۔ وہ اس پر پورا پورا اعتماد رکھتا اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ کمار بھی بڑی ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتا اور کرشن پر بچپن ہی سے جان چھڑکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کمار کرشن کے مرحوم والد کے وقت سے اس کی کوٹھی میں ملازم تھا۔ زمانہ کے نرم گرم کاروبار کے نشیب و فراز سے واقف تھا۔ اور ہر حیثیت سے گرگ باراں دیدہ تھا۔

آج کمار اور اس کی پری جمال مہ جبیں لڑکی رادھا نے بھی اپنا مکان خوب بنایا سنوارا تھا۔ کمار اگرچہ چند روز سے علیل تھا۔ مگر دیوالی کے پاک تہوار اور اپنی بیٹی کا دل رکھنے کے لئے سنبھل بیٹھا اور آنے جانیوالوں سے ہنس بول رہا تھا۔

جب آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹا تو کمار نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اپنی بیٹی رادھا کو پاس بلا کر کہا۔ بیٹی رادھا! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہمارے کرشن سیٹھ کس قدر نیک دل اور نیک اوصاف ہیں جس طرح ان کے والد میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ کرشن میرے ساتھ کرتے ہیں۔ میں بڑے سیٹھ کے زمانہ سے ہولی دیوالی کے موقعہ پر مٹھائی لیکر کوٹھی جاتا رہا ہوں۔ آج تیس برس ہونے آئے میں نے کسی تہوار پر ناغہ نہیں کی۔ آج پہلا اتفاق ہے کہ میں علالت کی وجہ سے وہاں نہیں جاسکتا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم میری طرف سے مٹھائی لیکر کرشن سیٹھ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ وہاں میری مجبوری کا اظہار کر دینا۔ رادھا نے باپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ دونوں باپ بیٹی نے طرح طرح کی مٹھائی قرینے سے تھال میں چنی۔ اور رادھا تھال لیکر روانہ ہوئی۔

رادھا سیلانی جیوڑوں کے جم غفیر سے بچتی بچاتی کوٹھی پہنچی۔ اور شرماتی لجیاتی کرشن کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کرشن اطمینان سے بیٹھا تصویریں دیکھ رہا تھا۔ کسی آنے والے کی آہٹ سے چونکا۔ جونہی اس کی نظر رادھا کی موہنی موہنی صورت اور چاند سے چہرہ پر پڑی بس جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ دست و پا لرزنے لگے۔ مگر آنکھیں رادھا کے حسن دل افروز کی بلائیں لے رہی تھیں۔ بھولی بھالی رادھا سادگی سے تھال لئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے کیا خبر کہ اس کے حسن جہاں تاب نے کیا گل کھلا دئے ہیں۔ جب اسی طرح دو منٹ گذر گئے تو رادھا نے نظریں اٹھائیں اور کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے دو بے پناہ تیر کرشن کے قلب و جگر میں پیوست کرکے اس کے رہے سہے اوسان بھی اڑا دئے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کرشن کو اپنا گرویدہ دیکھکر سہم سی گئی۔ چاہتی تھی کہ باپ کی طرف سے معذرت کر دے مگر زبان نہ اٹھی۔

آخر ہچکچا کر کہہ اٹھی۔ پتا.... جی.... آ....ج یہ کہتے کہتے رک گئی۔ اور گھبرا کر گردن جھکالی کرشن کو جو رادھا کے حسن کی دلآویزیوں میں پہلے ہی گم ہو چکا تھا۔ رادھا کے یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ایسے پیارے لگے وہ دیوانہ ہو گیا۔ اور جوش محبت میں رادھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا کانپ اٹھی۔ سٹ پٹا کر ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ کرشن بولا۔ رادھا میری ملکہ میری سلطانہ۔ میری لچھمی۔ میری دیوی۔ مجھے اپنی پوجا کر لینے دے۔ اپنے مقدس قدموں کی دیا سے مجھے آسمان پر پہنچا دے۔

یہ الفاظ کرشن کے محبت بھرے دل کی گہرائیوں سے جذبات کی تصویر بنکر نکلے۔ اور رادھا کے معصوم دل میں جالگے۔ رادھا کچھ کھوسی گئی عجب سماں تھا۔ رادھا کا ایک ہاتھ کرشن کے ہاتھ میں تھا اور نگاہوں سے نگاہیں ملی ہوئی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ محبت کی دیوی اور دیوتا ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جذب کر رہے ہیں۔

اور اگر کچھ دیر یہی عالم رہا تو ایک دوسرے کی ذات میں ملکر نیاز و ناز حسن و عشق کے جھگڑے کو مٹا دینگے۔

رادھا اس رنگین خواب سے بیدار ہوئی۔ ہاتھ چھڑا کر دروازہ کی طرف چلی۔ کرشن بت بنا دیکھتا رہا۔ رادھا جا سکتی تو دروازہ سے باہر چلی جاتی۔ مگر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ چلتے چلتے مڑ کر بھولپن سے کرشن کو دیکھا کرشن جو اب تک خواب کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ دلکش خواب کی خاطر خواہ تعبیر پاکر بے تابانہ اٹھا۔ اور دروازہ کے قریب رادھا کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ رادھا نیچی نظریں کئے کھڑی رہی۔ کرشن نے دیوانہ وار رادھا کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ رادھا نے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے اپنا سر کرشن کے سینے پر رکھدیا۔

حسن کے دو دلنواز مجسمے۔ دو رنگین جوانیاں آپس میں ملکر محبت کے ساز پر روحانی نغمے چھیڑ رہی تھیں۔ رادھا کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے۔ جن میں حسن و الفت، راز و نیاز، کیفیات و تاثرات کے ہزار ہا افسانے مضمر تھے۔

یہ وہ وقت تھا جسے تسکین دل، حاصل زندگی۔ نوش حیات کہتے ہیں۔

رفتہ رفتہ کمار کو کرشن اور رادھا کی محبت کا حال معلوم ہو گیا۔ اب کمار کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ناراض ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ کرشن دولتمند بھی تھا۔ اور نیک اور شریف بھی پابند عبادت بھی تھا اور ملنسار بھی۔ غرض پانچوں انگلیاں پانچوں چراغ تھا۔ فی الحقیقت رادھا جیسی حسن کی تصویر کے لئے کرشن جیسے محبت کے دیوتا کی ضرورت تھی۔ کمار نے بخوشی تمام رادھا اور کرشن کو ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا۔

اب یہ دونوں محبت کے سمندر میں ڈوب گئے۔ دن رات پریم کے روح نواز گیت گانے کے سوا انھیں کوئی کام نہ تھا۔ بسنت کا وقت تھا۔ تمام عالم میں نور کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا۔ رادھا اور کرشن کوٹھی کے باغیچہ میں ٹہل رہے تھے۔

کرشن (فضا کی دلفریبی سے متاثر ہوکر) رادھا! یہ تجلی ریز فضا تمہارے حسن کا رنگ۔ اف کیا اتنی دلکش ہوئی ہے۔

رادھا (شرماکر) اور اس فضا کے منیا ر نغمے تمہارے پریم کے روح پرور گیت گا رہے ہیں۔

کرشن۔ رادھا واقعی تم لچھمی ہو۔ اور میں نے تمہیں دیوالی کے پوتر تہوار پر سب سے زیادہ روشنی کرکے حاصل کیا ہے میری لچھمی، میری دیوی۔

یہ کہکر کرشن نے رادھا کو آغوش میں لے لیا۔

حج اکبر

(از- اطہر امرتسری)

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں بنوں میں پھرے ہیں مارے
میں ان کا عاشق بنوں گا جنکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا۔

"میں آپ کی غریب نوازی کا بخلوص قلب شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب مجھے بیت اللہ حج کی غرض سے جانا ہے"

ابراہیم نے یہ الفاظ کہنے کے بعد رخصت چاہنے والی نگاہوں سے بڑھیا کی کرمفرمائیوں پر اظہار ممنونیت کیا۔ ابراہیم ایک صاحب عزم عارف تھا۔ وہ عشق الہٰی کے نشے میں دنیا اور دنیا کی راحتیں بھول چکا تھا اسکے دل میں صرف ایک آرزو رکھی تھی۔ جس کو وہ عبادت و ریاضت کی امداد سے پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس کی راتیں شمع عبودیت سے منور اور دن خورشید نیاز سے روشن رہتے۔

وہ محض خدا کی خوشنودی اور حقیقت و عرفان کی تلاش کے لئے تخت شاہی پر لات مار کر فقیر ہو چکا تھا۔ خدا نے سچی محبت کے عوض میں اس کو قناعت و استغنا کی دولت اس درجہ عطا کر دی تھی کہ اب اس کو اپنی پھٹی کملی کے سائے میں ہزاروں بادشاہیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے عمر میں ورجنوں حج کئے تھے۔ ہر سال حج کے لئے جاتا اور احترام کعبہ کے پیش نظر پیادہ سفر کرتا۔ رستہ میں محنت مزدوری کے ذریعہ ضروریات زندگی مہیا کر لیتا تھا۔ گویا اس کو حج سے انس ہی نہیں تھا۔ بلکہ عشق تھا۔ اور عشق بھی وہ جو عاشق کو تمام خطرناک نتائج سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ابراہیم اس برس بھی حج کا ارادہ باندھ کر گھر سے نکلا تھا۔ حسن اتفاق سے اس کا گذر ملک یمن میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہوا۔ اسکی ایک عمر خوردہ عورت سے ملاقات ہو گئی۔ اس عورت کی نظروں میں عرفان کی روشنی تھی۔ اسلئے دل کے پردوں میں چھپے ہوئے انوار کا مطالعہ بآسانی کر لیتی تھی۔ اس نے ابراہیم کو دیکھتے ہی اسکی نیک سیرتی اور فنا فی الٰہی کا اندازہ لگا لیا۔ اور اس سعادتمند اجنبی کو محبت آمیز باتوں سے کچھ اسطرح متاثر کر لیا کہ اسکے سامنے شفقت مادری کا نقشہ پھر گیا۔ ابراہیم کی زندگی [illegible] سادہ تقویٰ تھا۔ کہ خدا کے بغیر کسی اور کی محبت دل میں جذب ہو کر روح کی گہرائیوں تک پہنچ گئی۔ ابراہیم اسکے گھر چلا آیا۔ بڑھیا نووارد [illegible] سے والہانہ پیار کرتی اور زندگی کی وہ تمام آسائشیں انسانی دولت و طاقت سے پوری ہو سکتی ہیں۔ ابراہیم کیلئے ہر وقت [illegible] رہتیں لیکن زیارت کعبہ کی حسرت اسکی روح کو بیتاب کئے ہوئے تھی۔ ہر صبح جب آفتاب کی پہلی تجلی رب کعبہ کی قدرت

کے چھپے ہوئے کرشموں کو منظر عام پر لاتی۔ تو وہ بڑھیا کی خدمت میں نہایت عجز کے ساتھ عرض کرتا کہ "میں آپ کی غریب نوازی کا ممنون ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے یوم حج قریب آرہا ہے"۔ بڑھیا نوجوان مہمان کے اس ایمان افزا سوال کا بے پرواہی کی ہنسی کے بغیر کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ بڑھیا کی یہ بے پرواہی ابراہیم کے لئے انتہائی ملال کا موجب تھی۔ وہ گوشہ تنہائی میں بیٹھکر جب بڑھیا کے استغنا پر غور کرتا۔ تو طرح طرح کے یاس آمیز خیالات اسکا دماغی شیرازہ پریشان کرتے ــ بڑھیا نیک طینت خاتون تو ہے۔ لیکن اس کا رویہ قابل ملامت ہے۔ مہمان نوازی کی قیمت اگر ثواب حج سے محرومی ہے۔ تو بڑھیا تمام انسانی اوصاف کی ملکہ ہوتے ہوئے بھی شیطان کی نیابت کر رہی ہے ــ "آہ مجھے اس سال زیارت کعبہ سے محروم رہنا پڑیگا"

اس قسم کے خیالات میں ابراہیم رات دن ڈوبا رہتا۔ رہائش و خوراک کی مسرتوں کے باوجود اس کا چہرہ روز بروز اتر رہا تھا۔ بڑھیا بھی اس راز سے ناواقف نہیں تھی کہ مہمان کے دل میں زیارت کعبہ کی حسرت آگ لگا چکی ہے۔ جس کے شعلے افسردگی بنکر اس کے چہرہ پر چھائے ہوئے ہیں لیکن وہ نہایت متانت سے ابراہیم کی استدعائے رخصت طلبی کو ٹال دیتی۔ ابراہیم حیران تھا کہ آخر مجھے محروم حج دیکھنے سے بڑھیا کو کونسا فایدہ ہوگا۔ یہ معمہ اسکے ناخن عقل کی کشائش سے کسی طرح بھی سلجھ نہ سکا۔

(۲)

ذوالحج کا ہلال عید کی مسرتوں کو مٹاتا ہوا افق پر جلوہ گر ہوگیا۔ ہر طرف مبارکباد کا ہنگامہ برپا تھا۔ روحانی مسرت شگفتگی ان لوگوں کے چہروں پر کھیل رہی تھی لیکن ابراہیم کیلئے ہلال عید بھی غرۂ محرم تھا۔ اس نے ہلال کو دیکھتے ہی سرد آہ کھینچی۔ اور دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اب اسکے لئے مبارکباد ہنگامہ نالۂ ماتم میں روپوش ہو چکا تھا۔ لوگوں کے مسرت آمیز چہروں پر اسے فغان جان کنی کا گمان ہوتا تھا۔ بڑھیا نے اسکی زبون حالی کا اندازہ لگاتے ہوئے اسکو ہاتھ سے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کیا۔ اسکی حیرت اور بھی بڑھ گئی جب مہمان کو حس و حرکت سے معذور پاکر اسکو یقین ہوگیا کہ اس کی زندگی پر بھی زیارت کعبہ کی حسرت مسموم اثر ڈال چکی ہے۔ اب اس کا جانبر ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اسکو ہاتھ پاؤں پڑ گئے۔ مہمان کی حالت لمحہ بہ لمحہ خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ آخر چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ ہاتھ پاؤں سہلانے کے بعد اس نے آنکھیں کھولدیں۔ اور از خود رفتگی کے عالم میں کہنے لگا "کعبہ کتنی دور ہے؟"۔

یہ جملہ آئینہ تھا اس کی آرزوؤں کا ــــ اس بات کا ہر لفظ ابراہیم کے خیالات و محسوسات کا ترجمان تھا۔

تمہیں مطمئن رہنا چاہیئے۔ خدا کی قسم تم حج سے محروم نہیں رہ سکتے۔ بڑھیا نے ابراہیم کے کان میں کہا۔

ابراہیم نے آنکھیں کھولدیں۔ لیکن یہ تسلی آمیز الفاظ یقینی طور پر اسکے لئے سرمایۂ تسکین نہیں ہو سکتے تھے۔ بڑھیا پر اسے اعتماد بھی تھا۔ کیونکہ اس نے ابراہیم کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس وعدہ کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔

دن گذرتے گئے اور ابراہیم کا اضطراب بڑھتا گیا۔ یوم حج آگیا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں اس برس حج کے ثواب سے محروم ہی رہونگا۔

۹ ذوالحج کا آفتاب زائرین کعبہ کو تکمیل ثواب کی خوشخبری دیتا ہوا نمودار ہوا۔ صبح کی پہلی تجلی جبین افق پر مسکرا رہی تھی۔ ابراہیم اپنی محرومی قسمت پر ایک گوشہ میں اشک حسرت بہا رہا تھا کہ بڑھیا نے آواز دی۔

"ابراہیم اٹھو۔ حج کر آئیں"

ابراہیم نے اس آواز کو بڑھیا کی ستم ظریفی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا "قابلِ احترام عورت میرے زخموں پر کیوں نمک چھڑک رہی ہو؟"

"نہیں نہیں" تمہیں بدگمانی نہ کرنی چاہیے۔ اٹھو دیر ہو رہی ہے" بڑھیا نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا سینکڑوں کوس کی مسافت چند منٹ میں طے ہو سکتی ہے!" ابراہیم نے حیرت آمیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں ـــ کیا خدا ہمارے ساتھ نہیں ؟" بڑھیا نے اپنے سفید بال ماتھے پر سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

ابراہیم حیرت آمیز نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے اداس چہرہ سے خونِ تمنا چھلک رہا تھا۔ وہ بڑھیا کے الفاظ کی صداقت کا اندازہ لگانے کی بجائے اس کی دماغی حالت پر غور کر رہا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ بڑھیا کا دماغ بتقاضائے عمر چل چکا ہے۔ یہ اسکی باتیں نہیں بلکہ دماغ کی افسوسناک کیفیتوں کا مظاہرہ ہے۔ کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال گھومنے لگ جاتا کہ ستم ظریف بڑھیا میرے عشقِ کعبہ کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔

بڑھیا بھی چہرہ کے تغیرات سے اسکی بدگمانیوں کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اور اسکو یقین ہو چکا تھا کہ نوجوان مہمان زہد و مراتب کے تمام مراحل طے کر لینے کے باوجود قدرت کی حیرت انگیز طاقتوں کی کارفرمائی سے ناواقف ہے۔ اس نے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"ابراہیم اٹھو۔ اگر حج کرنا ہے۔ تو .... ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے"

ابراہیم حیرت و امید کی متحدہ یورش سے مغلوب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مجبوراً بڑھیا کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اور چپکے چپکے اس کے پیچھے ہو لیا ـــ دونوں آپس میں باتیں کرتے چلتے تھے۔ ابراہیم زبان سے تو بڑھیا کی باتوں کا جواب دے رہا تھا لیکن اس کا دماغی شیرازہ خیالاتِ پریشان سے بکھر چکا تھا ـــ "یا الٰہی آخر اس ستم ظریفانہ مزاج سے بڑھیا کا مقصد کیا ہے؟" ـــ "کیا چند منٹوں میں سینکڑوں کوس کی مسافت طے ہو سکتی ہے؟" ـــ "اللہ یہ معمہ میری عقل سے تو حل ہو نہیں سکتا"

ابراہیم اس قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک اس کی نظروں میں تحیر اور خیالات میں استعجاب پیدا ہو گیا۔ اب وہ بیت اللہ کے سامنے تھا۔ وہ اس منظر کو خوابِ مراد کا درخشاں ٹکڑہ خیال کرنے لگا ـــ بڑھیا بھی اسکی نظروں میں چھپی ہوئی حیرت دیکھ رہی تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا:

"ابراہیم یہ وقت اس منظر پر عقل کی روشنی میں غور کرنے کا نہیں۔ مراسمِ حج ادا کر لو۔ وقت جا رہا ہے۔"

ابراہیم نے فرائضِ حج تو ادا کر لئے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کعبۂ خلیل کا مطوف سمجھنے کی بجائے حرمِ خیال کا تصور کر رہا تھا۔ مراسمِ حج ادا کرنے کے بعد دونوں واپس آئے۔ حسبِ سابق چند قدم ہی چلنے پائے تھے کہ گاؤں آ گیا۔

(۳)

ابراہیم کے سامنے کھانا لایا گیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد حیرت و استعجاب کے نشہ میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اس کو اپنے آپ کی بھی سدھ بدھ نہ رہی۔ وہ دیر تک سوچتا رہا کہ بڑھیا سے اس حیرت انگیز کارنامہ کا سببِ تخلیق دریافت کس طرح کیا جائے۔

لیکن حیرت نے اس کی طاقتِ نطق سلب کر رکھی تھی۔ آخر بڑھیا نے ہی اسکی مہر خاموشی توڑنے کی غرض سے کہا۔

"ابراہیم آج تم خلاف معمول حیرت زدہ کیوں ہو؟"

"میری حیرت کے اسباب پوشیدہ تو ہیں نہیں" ابراہیم نے جواب دیا۔

"ظاہر بھی نہیں" بڑھیا نے سوال کیا۔

"اگر ان پر کوئی پردہ ہے تو وہ آپ ہی نے ڈال رکھا ہے" ابراہیم نے جواب دیا۔

"میری طرز عمل تو ظاہر ہے"

"لیکن مجھے نظر نہیں آسکتی"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو"

"آج کے واقعہ کی وجوہ تخلیق۔"

بڑھیا نے یہ لفظ سنتے ہی خموشی اختیار کرلی۔ لیکن ابراہیم حیرت زدہ نگاہوں سے اپنے سوال کا تفصیلی جواب مانگ رہا تھا۔ بڑھیا نے مہمان کی روحانی سعادت کے پیش نظر ایک سرد آہ کھینچکر کہا۔

"ابراہیم تم نے مجھ سے ایک ایسی بات پوچھی جو برسوں سے میرے دل کے بغیر کسی کو معلوم نہیں۔ یہ وہ راز ہے جس کو میں راز سے آگے بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن تم ایک خدا رسیدہ درویش ہو۔ اسلئے میں سارا واقعہ تمہارے سامنے حقیقی صورت میں پیش کئے دیتی ہوں۔

سنو! اور دل کے کانوں سے۔ آج سے بارہ برس پہلے میں نے اور میرے شوہر نے سفر کعبہ کی تیاری کر رکھی تھی۔ مصارف حج کیلئے روپے دونوں نے علیحدہ علیحدہ جمع کر رکھے تھے۔ ہم نے صبح عازم کعبہ ہونا تھا۔ اسلئے حج کی خوشی میں رات کو سالن نہ تیار کیا۔ میرا شوہر سالن کے بغیر روٹی کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کیا۔ کہ پڑوس میں سے سالن مانگ لاؤں۔ میں ایک گھر میں داخل ہوئی جہاں ہر طرف افلاس کی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ چار دیواری کا منظر سراپا بھیانک ماحول میں غرق تھا۔ چولھے پر ایک دیگچی چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کے قریب ایک نوجوان عورت اپنے بلکتے ہوئے بچے کو کہہ رہی تھی۔ کہ ذرا صبر کرو۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن بچوں کا رونا اور بھی بڑھ رہا تھا۔ گویا وہ اپنی ماں کے وعدہ کو فریب تسلی سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس عورت کو کہا کہ ہمسایہ پر ہمسائے کے جو تمدنی حقوق ہیں ان کے پیش نظر میں تم سے تھوڑا سا سالن مانگتی ہوں۔

یہ بات سنتے ہی عورت کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور ہر چند صبر کیا۔ لیکن چند گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر چہرہ پر آگئے۔ عورت نے کیفیت الم چھپانے کی غرض سے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا۔ کہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا مطالبہ پورا نہیں کرسکتی۔ میں نے کہا کیوں؟ عورت نے جواب دیا کہ میں دلائل کے ساتھ تو آپ کے سوال کو رد نہیں کرسکتی لیکن ---- یہ کہتے ہی عنان صبر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس کا غم آلود چہرہ بزبان حال کہہ رہا تھا۔ کہ

"مفلسی سب سے بڑا گناہ ہے"

"وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی باتیں ہچکیوں سے ٹکرا، ہو ہو کر چیخ کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ میں اس کی زبون حالی سے سمجھ گئی۔ کہ بیچاری وضعداری کے پاس سے اپنی بھوکوں مارنے والی مصیبت پر صبر و استقلال کا پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔ لیکن دل کی کیفیتیں الفاظ و زبان کے بغیر بھی ظاہر ہو سکتی ہیں۔ ان کو چھپائے رکھنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ میں نے چپکے سے چولھے پر دھری ہوئی پتیلی کا سرپوش اٹھا کر جو دیکھا تو اس میں پانی کے بغیر اور کچھ نہ تھا۔ گویا یہ کام اس نے فاقہ کش بچوں کو فریب تسلی دینے کی غرض سے کر رکھا تھا۔

اس واقعہ کا مجھ پر بعید اثر ہوا۔ اور میں نے خیال کر لیا کہ جب تک اجناس اور سکوں کی غلط تقسیم رواج پذیر ہے قدرت اپنے فیاضانہ فرائض پوری طرح ادا نہیں کر سکتی۔ اس غلط اور غیر مفید تقسیم کا یہ عملی نتیجہ ہے۔ کہ حقوق اللہ و حقوق العباد کا خون کرنے والے امراء تو روز عید اور شب برات کی رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لیکن خدا کے قوانین کی پابندی کرنے والے بھوکوں مر رہے ہیں۔

میں عورت کو روتے ہوئے چھوڑ کر گھر واپس آ گئی۔ اور سارا واقعہ اپنے شوہر کے گوش گذار کیا۔ اور اس کو کہا کہ میں حج کو نہیں جاؤنگی۔ حج کے لئے جو روپے جمع کر رکھے ہیں وہ مجھے دیدو۔ تا کہ میں ان فاقہ کش لوگوں کی امداد کر سکوں۔ جو قدرت کے رحم سے تو محروم ہیں لیکن کسی کے سامنے دست سوال پھیلا کر انسانیت اور خودی نفس کو رسوا کرنا نہیں چاہتے۔ یہ کام یقیناً بلحاظ ثواب حج پر فوقیت رکھتا ہے۔ میری باتوں سے میرے شوہر کا جی بھر آیا۔ اور اس نے اپنے حصے کے روپے بھی مجھے دیکر کہا جاؤ۔ ان کو دے آؤ۔

میں نے تمام روپے اسی عورت کے سامنے رکھ دیئے۔ لیکن اس نے میری فیاضی کا حقارت آمیز استغنا سے جواب دیا۔ اور روپوں پر نفرت آلود نگاہ ڈالتے ہوئے کہا

تم مجھے شرمندۂ احسان بنانا چاہتی ہو۔ میں نے کہا نہیں۔ یہ احسان نہیں۔ البتہ ایک انسانی فرض ادا کر رہی ہوں۔

اس نے کہا تم تو اپنا فرض ادا کر رہی ہو۔ لیکن یہ کیا میری انسانیت کی توہین نہیں کہ خدا کو چھوڑ کر انسان کی امداد کو اپنی ضروریات کا کفیل سمجھ لوں۔

میں نے جواب دیا کہ آخر مجھے بھی دولت خدا ہی نے دی ہے۔ اور اسی نے یہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ میں اتنا کہنے کے بعد اپنے گھر چلی آئی۔ اس دن سے آج تک جب حج کا وقت آتا ہے۔ تو غیب سے میرے کانوں میں آواز آتی ہے۔ "چلو حج کر لو" آگے جو کچھ ہوتا ہے اس سے تم بھی میری طرح واقف ہو۔

ابراہیم نے بڑھیا کی کہانی سننے کے بعد یہ سمجھ لیا۔ کہ صرف زہد و عبادت اور روزہ و حج سے رحمت الٰہی کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ خدا کی خوشنودی اسی میں ہے۔ کہ خدا کے بندوں کی حاجتیں پوری کی جائیں۔ چنانچہ بقول رومؒ ؎

دل گذرگاہ جلیل اکبر ست × کعبہ بنگاہ خلیل آذر است
دل بدست آور کہ حج اکبر ست × از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

ہندوستان کی متحدہ زبان

(نوشتہ جناب میر آفتی کاظمی مدظلہٗ مدیر قائد امروہہ)

انسان کے جذبات و احساسات اور خیالات و ضروریات کے اظہار کا ذریعہ واحد زبان ہے۔ بنی نوع انسان میں جہاں تک زبان کا اتحاد و اشتراک ہوگا اسی حد تک خیالات میں یکجہتی، تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت میں یکرنگی نظر آئیگی۔ جس ملک میں عام طور پر ایک زبان بولی جائیگی اس میں بسنے والی تمام قومیں اشتراک زبان کی بدولت ایک دوسرے کے خیالات اور اعمال حسیات سے مستفید ہو کر نہ صرف اپنی ضروریات کی تکمیل اور قومی و ملکی ترقی میں آسانی سے کامیاب ہو سکیں گی۔ بلکہ ان کو انسان کے اتحاد نوعیت اور وصف انسانیت کا حقیقی لطف آجائیگا۔

گرچہ یہ امر محال نہیں تو مشکل اور نہایت مشکل ضرور ہے کہ انسان کے دور اولیں کی طرح تمام دنیا کی زبان ایک ہو جائے۔ لیکن جن ممالک و اقوام میں رنگ و نسل اور طریق معاشرت کا کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے یا جن ممالک کی آبادی مختلف زبانیں استعمال کرنے والی اقوام پر مشتمل ہے۔ ان میں نہ صرف اتحاد زبان آسانی سے ممکن ہے بلکہ ان کی فلاح و بہبود اور ترقی و آزادی کا انحصار بڑی حد تک وحدتِ لسانی پر منحصر ہے۔

دور کیوں جائیے۔ اپنے وطن عزیز ہندوستان کو لے لیجئے۔ جس قدر مختلف قومیں ہندوستان میں آباد ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ دنیا کے کسی خطہ میں اس قدر مختلف اقوام کا اجتماع نہ ہوگا۔ انگریزوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہندوستان میں رہنے والی قوموں کی زبانوں پر غور کیجئے تو الفاظ اور لب و لہجہ میں بہت کچھ اتحاد و اشتراک پایا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ مترادف ہم معنی اور متحد المخرج ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے رنگ، ہماری جسمانی ساخت، ہمارے طرز زندگی اور شکل و شباہت میں بہت زیادہ یکرنگی اور وحدت اطوار نظر آتی ہے۔ اس لئے ہم میں زبان کا اتحاد و اشتراک بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ نیز سب سے زیادہ اہم اور خاص پہلو جو میرے لئے جاذب توجہ ہے وہ ہماری ملکی ضروریات۔ ہمارے قومی حالات ہیں۔ ہم اس کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ اور روز بروز ہماری اس مجبوری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کہ ہندوستان میں زندگی بسر کرنے والی قوموں اور مادر وطن کی آغوش رحمت میں تربیت پانے والی نسلوں کی ملکی زبان ایک متحد و مشترک زبان ہو۔

یہ احساس مجھے ہی نہیں۔ یہ خیال صرف میرا ہی ذاتی خیال نہیں۔ بلکہ اس اہم ضرورت کو ہندوستان کی بہی خواہ جماعتوں اور ان کے روشن خیال لیڈروں نے تسلیم کیا ہے اور وقتاً فوقتاً اس ضرورت پر اظہار رائے کرتے ہوئے عملی قدم اٹھانے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔ اب سے تقریباً پندرہ بیس سال پیشتر ہندوستان کی مشترکہ زبان کا مسئلہ ایک

اہم ملکی مسئلہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جرائد و رسائل اس بحث سے بھرے پڑے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ اکثر روشن خیال اور وسیع النظر اہل ہنود، بالخصوص لکھنؤ کے مشہور اہل قلم پنڈت چکبست آنجہانی منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور وغیرہ نے اسی موضوع پر زبردست مضامین لکھے تھے۔ یہاں تک کہ لالہ لاجپت رائے جیسے فرقہ پرست لیڈر نے بھی سفر امریکہ سے واپسی کے بعد ہندوستانی زبان کے عنوان سے کچھ مضامین شائع کئے تھے۔ اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کے مسلّم لیڈر گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں ہندوستان کے لئے مشترکہ زبان کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان میں ایسی صلاحیت کے وجود کو تسلیم کیا تھا۔ (گو تعصب اور حالات کی تبدیلی کے باعث آج گاندھی جی یا دوسرے تنگ خیال ہندو لیڈر ہندی کی حمایت میں ہوں۔ مگر ان کے تلون اور کج ادائی سے ایک روشن حقیقت پر پردہ نہیں پڑ سکتا)

بہر حال ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت سے کسی کو بھی اختلاف و انکار نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہندوستان کی کونسی زبان کو متحدہ و مشترکہ تسلیم کیا جائے۔ اور فی الحقیقت کس زبان میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

مشترکہ زبان کی تعریف :-

اس سے پہلے کہ مشترکہ زبان کی تعریف کی جائے۔ اشتراک کے معنی و مفہوم پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے تجارتی نقطۂ نظر سے قومی و ملکی ترقی کے لئے اشتراک ایک ایسی نعمت ہے جس کی بدولت آج تمام ترقی یافتہ اقوام و ممالک شاندار و کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کمپنیوں کے سرمایہ میں تمام ممبروں کا بقدر وسعت و حیثیت حصہ ہوا کرتا ہے۔ گویا تمام حصہ داروں کے مشترکہ سرمایہ کا نام ہی کمپنی ہے۔ کسی کمپنی میں تمام سرمایہ کسی ایک حصہ دار کا نہیں ہوتا۔ البتہ چھوٹے بڑے اور کم و بیش حصوں کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف الاقوام اور مختلف اللسان ملک میں ایک مشترکہ زبان قائم و رائج کرنے کے لئے تمام زبانوں کے سرمایۂ الفاظ کا اشتراک لازمی ہے۔ مشترکہ زبان وہی کہلائی جا سکتی ہے جس میں تمام زبانوں کے الفاظ بقدر حیثیت و وسعت شامل ہوں۔ اگر کسی ایک قوم اور ایک خطۂ ملک کی زبان کو عام ملکی زبان بنانے کی کوشش کی جائیگی تو اس میں پہلی خرابی یہ ہوگی کہ اس پر اشتراک کی تعریف صادق نہیں آئیگی۔ دوسرے یہ امر خلاف قانون، نادرست اور غیر منصفانہ ہوگا۔ اور ان وجوہ سے اس کا نتیجہ ناکامی اور یقینی ناکامی ہوگا۔

چونکہ ہندوستان جنت نشان مختلف قوموں، ہفت اقلیم کے باشندوں کا گہوارہ ہے۔ اس پرفضا گلستان میں رنگ برنگ کے پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس باغ میں ہر قسم کے میوہ دار درخت اپنے اپنے ثمرات پیش کر رہے ہیں۔ اسی سبزہ زار اور چمنستان میں بھانت بھانت کے پکھیرو اپنی اپنی بولیاں بولتے اور نغمہ سنجی

کرتے ہیں۔ اس لئے سب کے مبادلۂ خیال اور ارتباط و موانست کے ذریعہ خاص (انٹرنیشنل لنگویج لمیٹڈ کمپنی آف انڈیا) یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان میں سب زبانوں کا حصہ ہونا چاہیئے۔

اردو کی نوعیت:۔

ظاہر ہے کہ ایسی زبان جس میں مذکورہ بالا اصول کے مطابق تمام ہندوستانی زبانیں ہی نہیں بلکہ تقریباً دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ کا اشتراک ہو وہ موجودہ اردو زبان ہے۔ اور یہی ہو سکتی ہے۔ (خواہ اس کا نام کچھ رکھ دیا جائے) موجودہ فضا کے لحاظ سے اگر اس موقع پر مسئلہ تناسب کو ملحوظ رکھا جائے۔ تو مجھے امید ہے کہ اسے فرقہ پرستی اور تنگ نظری پر محمول نہ کیا جائیگا۔ بلکہ بادنیٰ تامل اس مسئلہ کا صحیح حل دریافت کیا جا سکے گا۔

دیکھیئے ہندوستان میں جس قدر زبانیں بولی جاتی ہیں یا استعمال کی جا چکی ہیں۔ اگرچہ میں ان زبانوں کو نہیں جانتا اور سب کے نام بھی فی الحال نہیں بتا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو میں سنسکرت، ہندی، گجراتی، بنگالی، مرہٹی، سندھی، عربی، فارسی، ترکی، اڑیا، تلنگی، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ وغیرہ سب ہی زبانوں کے الفاظ نسبتاً موجود ہیں۔ سب سے زیادہ فارسی اور ہندی الفاظ ہیں۔ جو آرین زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ایرانی قوم اور زبان آرین قوم و زبان ہی کی ایک شاخ ہے۔ اور ہندوستان میں آرین اقوام ہی کا عنصر غالب ہے۔ اس تناسب سے اردو زبان میں زیادہ تعداد ہندوستان ہی کی مختلف زبانوں ہندی، گجراتی، مرہٹی، سندھی، پنجابی وغیرہم کے الفاظ کی ہے۔ اور کم تعداد عربی، ترکی، افغانی الفاظ کی خالص انگریزی داں طبقہ کی تحقیق اور طلبہ اردو کو نظر انداز کر کے مختصر چالیس سال پہلے کے اردو داں حضرات سر سید، محسن الملک، مولوی ذکاءاللہ، وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی وغیرہم۔ اور زمانہ قریب کے ممتاز حضرات مولانا شرر، سید جالب۔ مولانا سلیم اور سرشار کو دیکھیئے۔ دور موجودہ انشا پردازوں میں حضرت ریاض مرحوم۔ مولانا عبدالحق سیکرٹری ترقی اردو اورنگ آباد دکن خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم، خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی۔ حضرت احسن مارہروی وغیرہم کی اردو ملاحظہ فرمایئے۔ کیسی سلیس و نفیس اور پیاری اردو ہے۔

اردو کی عالمگیری اور اسکی ایک مزید خصوصیت

اردو کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے، کہ ہندوستان کے باہر دیگر ممالک میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کو شاذ و نادر ہی کوئی شخص جانتا ہو گا۔ لیکن اردو کے جاننے۔ بولنے اور سمجھنے والے ہمارے ہمسایہ ممالک افغانستان و ایران کے علاوہ، مصر، عراق، عرب، افریقہ۔ امریکہ میسوپوٹامیہ۔ بلکہ امریکہ۔ چین۔ جاپان۔ فرانس۔ انگلستان۔ آئرلینڈ وغیرہ میں بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اردو اخبارات و رسائل کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں جس کی بہت بڑی اور خاص وجہ یہ ہے کہ اردو میں ہر ایک زبان کے الفاظ شامل ہونے کی وجہ سے ہر ملک کے باشندے اس کو بآسانی اور جلد از جلد سیکھ لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسری زبانیں خصوصاً

ہندی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کافی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مشکل اور تکلف سے بولی جاتی ہیں۔ تمام مشرقی زبانوں میں چینی کے بعد اردو سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اس سے اردو کی عالمگیری اور مقبولیت عامہ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات اب کوئی راز اور معمہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ اردو نے اپنی نفاست، لطافت اور تہذیب کے باعث تمام متمدن ممالک اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں کو موہ لیا ہے۔ اور ہندوستان میں مختلف ممالک کے باشندوں کا اختلاط قدرتی طور پر اسکی ترویج و ترقی کا سبب بن رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کی بدقسمتی سے بعض دیگر افسوسناک سیاسی اختلافات کے ساتھ ہی زبان کے مسئلہ میں بھی تنگ نظر اور فرقہ پرست متعصب ہندو ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے مسلمہ لیڈر گاندھی جی بھی ہندی کی ترویج و حمایت کا بے سُرا راگ الاپ رہے ہیں۔ اور ان کو اتنا بھی لحاظ و خیال نہیں کہ ۱۹۲۵ء میں اسی زبان سے انھوں نے کیا کہا تھا۔

باوجودیکہ اردو تمام زبانوں کے لطیف و شیریں اور چیدہ و منتخب الفاظ کا دلپذیر مجموعہ ہے۔ اور باوجودیکہ اردو سنسکرت کی بیٹی، بھاشا کی ماں جائی اور مادرِ ہند کی آغوش میں تربیت پانے والی ایک حسین دیوی ہے۔ مگر اس سے، عربی، فارسی وغیرہ اسلامی زبانوں کے چند الفاظ کا اختلاط ان تنگ دل مخالفوں کے لئے اتنا گراں بار ہے کہ اس کی لطافت و نزاکت اور شیرینی و عالمگیری کے باوجود اس کو چھوڑ دینے اور برادری سے خارج کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوئی سنسکرت اور بھاشا کے ثقیل سے ثقیل اور بھدے سے بھدے الفاظ ٹھونس رہا ہے۔ اور کوئی علی الاعلان اس کا رسم الخط بدلنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔

اردو رسم الخط = حالانکہ اردو رسم الخط اتنا عجیب و غریب اور خوبصورت و معجز نما ہے کہ کسی دوسری زبانوں کا رسم الخط اس کی تمام خوبیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک منصفانہ پہلو تو یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط نہ تو ہندوؤں کی قدیم زبان سنسکرت کا رسم الخط ہے۔ اور نہ مسلمانوں کی اصلی زبان عربی کا بلکہ دنیا کی ان دونوں قدیم زبانوں کے بین بین فارسی رسم الخط کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ جس سے کسی قوم کو شکایت کا موقع نہیں۔ بلکہ غور کیا جائے تو اس میں ہندوؤں کی فتح ہے اسلئے کہ فارسی آرین زبان ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کے علاوہ اس کا طرز تحریر اسقدر مختصر اور جامع ہے کہ جہانتک اختصار و جامعیت کا توسط قائم رکھا جا سکتا ہے اور زود نویسی و مختصر نگاری میں اپنی نظیر آپ ہو کر رہ گئی ہے۔

زبان اردو نے ہندوستان میں صرف شانِ قومیت ہی پیدا نہیں کی۔ بلکہ نہایت، وسیع اور علمی زبان ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کو مہذب و شائستہ بنا دیا۔ یہ تمام خوبیاں اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہیں جب تک اس کا رسم الخط بعینہ قائم رہے۔ ورنہ رسم الخط کی تبدیلی سے نہ صرف اس کی خوبیاں مٹ جائینگی۔ بلکہ اس کا وجود ہی فنا ہو جائیگا۔

ہاں جو کچھ خامیاں اور نقائص اردو زبان کی تکمیل و تحسین میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی اصلاح ہر محب وطن ہندو مسلمان کا فرض ہے۔ مگر آہ کس قدر ظلم کتنی تہذیب دشمنی اور ہیں اپنی ملکی پیداوار و مصنوعات سے کتنی عداوت

ہے کہ اردو کو مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سرکاری کاغذوں، دفتروں، ریلوے ٹکٹوں، کانگریس پنڈال کی دیواروں، دروازوں پر انگریزی، گجراتی، ہندی وغیرہ تحریریں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ انھیں زبانوں میں لیڈروں کی تقریریں سنائی دیتی ہیں۔ مگر اردو آہ محبان وطن کے خونِ جگر سے پلی ہوئی اردو کسی تحریر و تقریر میں جلوہ نما نظر نہیں آتی۔ کیا یہ امر قابلِ صد حسرت و افسوس و اہل ہند کی فرقہ وارانہ غلامانہ ذہنیت کی دلیل نہیں؟

اردو کی مخالفت شدید ترین حماقت اور زبردست سیاسی غلطی ہے

تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی، عام اشتراک اور قومیت متحدہ کے قیام کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تشکیل اور ملک کو ایک نیشن بنانے کے لئے اردو جیسی عالمگیر اور مشترکہ زبان کو اپنی دفتری و ملکی زبان قرار دینا۔ قومی و سیاسی آل انڈیا مجالس میں اردو کا استعمال کرنا تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دینا ضروری اور اشد ضروری ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مانوس، قریب تر اور متحد الخیال اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہمارے خیالات و جذبات کا اظہار اردو جیسی ہمہ گیر زبان میں ہو۔ اردو کا عام رواج ہونا اور ہندوستان کی دفتری و کاروباری زبان بننا نہ صرف ہماری تہذیب اور علمی ترقی کا زینہ ہے۔ بلکہ جیسا ابھی ہیں نے بیان کیا ہے سیاسی اعتبار سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اندریں حالات اردو کی مخالفت ایک شدید ترین حماقت اور زبردست سیاسی غلطی ہوگی۔

اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے

اس موقع پر میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان کہکر اس کی مخالفت کی جائیگی تو برادران وطن کی سخت غلطی اور اپنے علم دوست ہندو بزرگوں کی انتہائی قدر ناشناسی ہوگی۔ اردو کی لطافت و شیرینی اور اس کے جہانگیر فوائد کو پیش نظر رکھکر بہت سے عاشقان ادب ہندو بزرگوں نے مسلمانوں کے دوش بدوش اردو کی زبردست خدمات دی ہیں۔ اور اب بھی انجام دے رہے ہیں۔ متقدمین کے علاوہ کیا مولانا شرر اور آزاد کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مسٹر چکبست کا نام جلی حرفوں میں نمایاں نہیں؟ کیا ڈاکٹر نذیر احمد، مولوی بشیر الدین، راشد الخیری، سید سجاد حیدر، خواجہ حسن نظامی کے پہلو بہ پہلو مسٹر پریم چند، مہاشے سدرشن، پیارے لال شاکر نظر نہیں آتے۔ کیا مولوی عبد الحق بی۔ اے، مولانا حسرت موہانی، خواجہ عبد الرؤف عشرت، حضرت احسن مارہروی وغیرہم کے ساتھ پنڈت دیا ناتھ نگم، تلوک چند محروم، مہاراج بہادر برق، پنڈت کیفی اور بہت سے ہندو ادیب شاعر مصنف مؤلف اس میدان میں گامزن نہیں؟ تو کیا اردو کے مخالف تنگ نظر حضرات اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر ان ہندو بزرگوں کی اردو خدمات پر پانی پھیر دینا اور اپنی قوم کے کثیر التعداد اردو دان افراد کو ایک ممتاز علمی زبان کی ترقیوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ روشن خیال ہندو نوجوان اس تنگ دلی اور کوتاہ نظری کو کبھی پسند نہ کرینگے۔

بہرحال یہ غلط خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ کہ اردو صرف مسلمانان ہند کی زبان ہے۔ اور ہندوؤں کا اس میں کچھ حصہ نہیں۔ مجھے تو انتہائی حیرت ہے کہ ہندو اور تمام معاملات میں تو اپنے حقوق کا ایک ذرہ چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں لیکن اپنی ملکی زبان اردو کو سراسر مسلمانوں کے حوالہ کر دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن مسلمان اردو کو تمام ہندوستان کی مایۂ ناز علمی زبان سمجھتے اور ہندوؤں کو اس میں برابر کا شریک مانتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو اپنی بات کی پچ اور اپنی زبان کی ترویج منظور نہ ہوتی تو وہ عربی زبان کے عام رواج کی کوشش کرتے۔ کیونکہ عربی ان کی مقدس مذہبی و قرآنی زبان ہے۔ اور تمام اسلامی ممالک عربیہ اور شام مصر کے علاوہ ایران۔ ترکستان۔ افغانستان بلکہ یورپی ممالک میں بھی خاص طور پر قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ نیز ہندوستان کے مسلمانوں کی کافی تعداد عربی کی ماہر ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ تمام مسلمانان عالم کے ساتھ ایک مضبوط رابطہ اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ ہندوستان کو اپنا ایک مستقل وطن سمجھا۔ اور جذبۂ رواداری کے ماتحت اپنی زبردست سلطنت ہند کے وقت میں بھی جبکہ ترویج عربی کا بہترین موقع تھا۔ نیا نہیں کیا۔ اور آج بھی اسلامی ریاستیں اپنی اپنی حدود میں عربی یا فارسی زبان کے رواج کی کوششوں سے تعصب و تنگدلی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر رہی ہیں۔ بلکہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہی کی ترقی پیش نظر ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست حیدر آباد دکن اس کی بہترین مثال ہے۔

ہندوستانیوں کی تمام تعلیم صرف ایک مشترکہ زبان اردو میں ہونی چاہئے

ہماری تعلیمی پستی اور عدم ترقی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک و قوم کے نونہال جب تعلیمی راہ میں قدم رکھتے ہیں۔ تو ان پر مختلف زبانوں کے حاصل کرنے کا ناقابل برداشت بار پڑ جاتا ہے۔ اردو۔ ہندی۔ فارسی انگریزی چار زبانیں تو ہمارے صوبہائے متحدہ و پنجاب اور غالباً صوبہ سرحد میں بھی عموماً ہر ایک طالب علم سیکھتا ہی ہے۔ صوبہ سندھ و گجرات اور بنگال میں وہاں کی زبانیں بھی شامل ہونگی۔ عربی و سنسکرت بھی بہت سے طلباء لے لیتے ہیں۔ اب خیال کیجیے کہ ایک ننھے سے نازک دماغ پر کس قدر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ ان مختلف زبانوں کے حصول سے طلبہ کی کوئی نمایاں ذہنی و اخلاقی تربیت و ترقی نہیں ہوتی۔ بلکہ قوت عملی اور نظام ذہنی منتشر و منقسم ہو کر دماغ کمزور اور فکر سلیم ناقص و خراب ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر زبان کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ استاد اور ٹیچر مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مفلس ہندوستان بہت زیادہ زیربار اور ہندوستانیوں کی تعلیم نہایت گراں و دشوار ہوتی جاتی ہے۔ اگر بہ تقلید عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن تمام علوم و فنون کی تعلیم صرف ایک مشترکہ زبان اردو میں ہو۔ تو ہمارے ملک و قوم کے نونہال بڑی آسانی کے ساتھ کم قیمت اور تھوڑے وقت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ان اہم مسائل کا فیصلہ جبھی ہو سکتا ہے۔ جب تمام با احساس ہندوستانی متفق ہو کر اردو کو

اپنی مشترکہ ملکی زبان قرار دے لیں۔

مسلمانان ہند سے خطاب ۔ میرا مطمح نظر متذکرہ بالا خیالات وجذبات کے اظہار سے واضح ہو چکا ہے اور میری دلی تمنا یہی ہے جو پیش کی گئی۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ متعصب برادران وطن اردو کی مخالفت پر بُری طرح اڑے ہوئے ہیں۔ اور ہندی کی ترقی میں شب و روز کوشاں ہیں۔ ایسی حالت میں چاروناچار صرف مسلمانان ہند کی طرف خطاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آپ لوگ اس وقت اردو کی حمایت کے لئے محض ایک کمزور آواز بلند کرتے ہیں۔ جب ہندی کی حمایت و ترقی کا کوئی شاندار اور حیرت انگیز کارنامہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ حالانکہ چپکے ہی چپکے اور اندر ہی اندر برادران وطن ہندی کی کامیاب تبلیغ و اشاعت میں سرگرم ہیں چند روز ہوئے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کی زیر صدارت ہندی کانفرنس کا اجلاس ہوا اور حسب اطلاع اخبارات کانفرنس کو ایک لاکھ روپیہ بھی مل گیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے اردو کانفرنس منعقد کی۔ لیکن اس کا نتیجہ صفر اور وہ جوش حمایت ختم؛ بقول معزز ہمعصر (ایمان) معلوم نہیں مسلمانوں کے خیال میں اردو کی خدمت کے کیا معنی ہیں؟ اردو کا کام صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ لوگ اردو بولیں۔ اور لکھ پڑھ سکیں۔ یہ کام قرار دادوں، کانفرنسوں (اور مضمون لکھنے) سے انجام نہیں پا سکتا۔ ہندوستان کی ۹۰ فیصدی آبادی کا تعلق دیہات سے ہے۔ کیا کبھی کسی نے اردو کو دیہات میں رائج کرنے کی فکر کی۔ یہ شہروں کی کانفرنسیں اور مشاعرے تو کسی مرض کی بھی دوا نہیں ہندی، اردو کی قسمت کا فیصلہ دیہات میں ہوگا۔ اگر ۹۰ فیصدی آبادی اردو کے بولنے سمجھنے لکھنے اور پڑھنے سے عاری ہو تو یہ کبھی ممکن نہ ہوگا۔ کہ حکومت کی دفتری اور تعلیمی زبان اردو رہے۔

اس لئے مسلمانوں کا فرض اور پہلا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں سے اردو کے متعلق بحث و مباحثہ کو ترک کر کے ہمہ تن اردو کی ترویج و ترقی میں سرگرم عمل ہو جائیں (یو پی) بہار۔ بنگال - پنجاب اور صوبہ سرحد کے شہری علاقوں کے علاوہ دیہات میں اردو مدرسے انجمنیں اور سبھائیں قائم کر دیں اور ان کا معقول و قابل اطمینان انتظام فوراً عمل میں آئے۔ مسلمانوں کو اس منظم و متحد کوشش سے یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ وہ دوسری ملکی پیداوار اور مصنوعات کی حمایت و قدردانی کے ساتھ اپنی اہم اور شاندار ملکی پیداوار "زبان اردو" کو زندہ و برقرار رکھکر اپنے وطن کی لاج رکھ لیں گے۔ مجھے بہادر اور غیور صوبہ سرحد اور معزز ادارہ "سفیر سخن" سے قوی امید ہے کہ وہ ترقی اردو کے لئے شاندار قدم اٹھائیگا۔

غزل

(از جناب ابو نعیم نشتر جالندھری)

محراب تیغ ناز جو قبلہ نما نہ ہو — تیری قسم نماز محبت ادا نہ ہو

آج اپنے عیش باغ میں عشرت نوا نہ ہو — کل یہ طرب کدہ کہیں ماتم سرا نہ ہو

کیا لطف زیست گلشن پُر کیف و رنگ میں — ہم داستاں جو بلبل خونیں نوا نہ ہو

اُڑتا پھرے جو برق بلا کی تلاش میں — ایسا مجھے نصیب کوئی آشیا نہ ہو

تیرا خدا تو ہی دل موج آشنا تو ہے — لنگر نہیں نہ ہو جو نہیں ناخدا نہ ہو

جس کا ہو لفظ لفظ مئے زندگی کا جام — اس بزم ناو نوش میں ایسا فسانہ ہو

دیوانہ تیرا کس سے حدیث جنوں کہے — دنیا میں جب کوئی دل مرا آشنا نہ ہو

اے شاہ حسن! تیرا گدا ملک عشق میں — یوں پھر رہا ہے جیسے کسی کا خدا نہ ہو

اے دل! تمام تیری ہیں افسوں طرازیاں — تو بیوفا نہ ہو تو کوئی بیوفا نہ ہو

افتادگان رہ کو نہ ترچھی نظر سے دیکھ — دامن نشین شاہ کوئی خاک پا نہ ہو

حسرت نصیب دل کی یہ حسرت ازل سے ہے — میرا سر نیاز نہ تیرا آستانہ ہو

منزل کی دھن میں آپ ہو گم کاروان زیست — بانگ درائے موت اگر رہنما نہ ہو

پاکیزہ دل گداز [illegible] آفریں تو ہے
نشتر! جو تیرا شعر نہیں دل ربا نہ ہو

آئینۂ جذبات

(از جناب مولانا اظہر امرتسری)

پہلے تو تھا یہ عذر کہ پردہ اُٹھا نہیں
اب دیکھتا ہوں کچھ پسِ پردہ ہے یا نہیں

دیتے ہو اس غریب کو بے حاصلی کا طعن
کھا کر جگر پہ چوٹ جو رو بھی سکا نہیں

مایوسیِ دوام کی مجبوریاں نہ پوچھ!
کہنا ہی پڑ گیا کہ ہمارا خدا نہیں

زاہد نے رات پی کے کہی کیا پتے کی بات
رندوں میں اہلِ صومعہ جیسی ریا نہیں

اے حسن محض بے ادبی کا ہے ڈر مجھے
ورنہ کوئی حجاب بھی ہے جو اُٹھا نہیں؟

جس دن حجابِ راز اُٹھا روئے عشق سے
جلوے نے سر جھکا کے کہا اب حیا نہیں

پھر گفتگوئے راز ہے نیچی نگاہ سے
شاید وہ جانتے ہیں میں رسوا ہوا نہیں

مایوسیوں سے ہو کے جدا کر تو لی دعا
اب دیکھنا ہے یہ کہ خدا ہے بھی یا نہیں!

کیوں اے ادائے حسن تغافل ہے اسقدر؟
کیا واقعی میں ظلم کے قابل رہا نہیں؟

آتے ہیں سامنے مگر اس بے رخی کے ساتھ
جس طرح کوئی ان سے مرا مدعا نہیں

فطرت نے کس قدر مجھے مجبور کر دیا
جیتا ہوں اور جینے کے قابل رہا نہیں

تصویرِ دردِ دل تو ہے ظالم ہمارا اشک
مانا کہ اس میں نالۂ غم کی صدا نہیں

تیرے غرور سے تو میں عاجز نہیں، مگر
مجبور ہوں کہ اور کوئی آسرا نہیں

اظہرؔ اگرچہ کفر ہے۔ لیکن درست ہے
ہندوستاں میں اہلِ ہنر کا خدا نہیں

(خاص)

مملکتِ دل کی سیاحت

(جناب محمد موسیٰ خان کلیم افغانی بی۔اے۔ سرحدی)

دنیا کے دھندوں سے دور۔۔۔۔۔۔۔ علائق ماحول سے آزاد ایک مبارک مگر خوفناک۔۔۔۔۔۔۔ روشنی بخش مگر تیرہ و تار شب کو میں اپنے مکان میں ایک چارپائی پر تکیہ لگائے تنہا بیٹھا تھا۔ سامنے کے دالان میں ایک مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی دھیمی دھیمی روشنی شعلے کے گرد گز بھر تک فضا کو روشن کرنے کے بعد تاریکی کے پردوں میں جذب ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گویا سرِشام ہی سے وہ چراغ سحری بنا ہوا تھا۔ آسمان ابرِ سیاہ کا گہوارہ بن رہا تھا۔ بادل کیا تھے؟ لمبی سیاہ چادریں جو ساکنانِ ارض و سما کے درمیان حائل کی جا رہی تھیں۔ فضا میں وہ سکوت تھا کہ ہوا کی سرسراہٹ تک بند تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زندگی کی رفتار کچھ دیر کے لئے رک تھم گئی ہے۔ دور! بہت دور فضائے آسمانی میں ایک روشن نکتہ نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ چادرِ سیاہ میں سوراخ ہو گیا ہے اور اس میں سے کسی آسمانی ہستی کی آنکھ اس خوابیدہ بستی کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ یا اس تاریکی کو ہمہ گیر ہوتے دیکھ کر چاند کی شہزادی گھبرائی۔ اور فضائے آسمانی کی سیر چھوڑ کر اپنے محل کا رخ کیا۔ اسی عجلت میں اس کا موتیوں کا ہار ٹوٹ کر بکھر گیا۔ باقی موتی تو چن لئے گئے لیکن یہ ہاتھ نہ آیا۔ نہیں! نہیں وہ ایک ستارہ تھا۔ جو ساتھیوں کو چھوڑ کر تاریکی کے اس سمندر میں کود پڑا۔ ایک لازوال ہستی کا مظہر! ایک دائرہ نور کا نورانی نکتہ —— وہی مجھے اس تاریک اور خاموش فضا میں زندگی کا حامل نظر آیا۔ اسی کی جھلملاہٹ مجھے ایک صدا۔ ایک نغمہ معلوم ہوئی۔ جو میری روح کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں اسے برابر بڑی محویت کے ساتھ تکتا اور وہ مجھے قریب تر معلوم ہوتا جا رہا تھا۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا۔ گویا زمین و آسمان کے درمیان کسی بلندی کی طرف پرواز کئے جاتا ہوں۔ اس نظارہ میں میری آنکھیں تھک گئیں۔ اور میں نے ایک دقیقہ کے لئے انھیں بند کر لیا۔

آنکھ کا کھلنا تھا کہ میں ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے ایک نئی زمین تھی۔ ایک نیا آسمان! تاریکی نور سے خاموشی مسرور کن نغموں سے بدل چکی تھی۔ فضا میں موسم بہار کا لطف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی روشنی خیرہ کن نہ تھی۔ گھبرایا۔ سہما سہما ہوا میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور دل میں کہا "الٰہی یہ کیا ماجرا۔ میں کہاں سے کہاں آ نکلا؟" یکایک میں نے پاؤں کی آہٹ سنی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک درویش۔ برہنہ سر۔ میانہ قد۔ ایرانی قبا پہنے۔ بزرگ آتے دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر جلال و جبروت کے آثار تھے۔ جسے دیکھ کر میری پریشانی میں اور اضافہ ہونے لگا۔ لیکن جبر کر کے میں آگے بڑھا۔ السلام علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا حضرت یہ کونسی جگہ ہے؟ بزرگ نے تبسم کرتے ہوئے کہا "ویرانۂ دل"۔۔۔۔۔۔۔ میں حیران کہ ویرانۂ دل کے کیا معنی؟ اکثر شعراء کے کلام میں یہ الفاظ تو نظر آئے۔ لیکن ان کی حقیقت تخیل سے زیادہ کچھ نہ سمجھی۔ اور پھر ان پر یہ سماں کا کتنا "ویرانۂ دل"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو آبادی ہے۔

[illegible]

[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]

Durga Art Press Anarkali Lahore



[illegible]



[illegible]



[illegible]

اسے ویرانہ کیوں کہا جائے۔ نہ جانے میرے خیالات اس بزرگ کو کیسے معلوم ہوتے۔ کہ وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔ "عزیز! شعراء سچے ہیں، جو جگہ ترک کر دی جائے۔ جہاں کی آبادی القلیل کا المعدوم کا حکم رکھتی ہو جہاں کے رہنے والوں کو وحشی تصور کیا جائے۔ کیا وہ جگہ ویرانہ کہلائے گی؟ کیا دنیا کے ویرانوں میں کوئی نہیں بستا؟ اور نہ سہی طیور و وحوش تو رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک آبادی ہے۔ جس کے بسنے والوں کو اہل دنیا حیوانوں سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ شعراء سچے ہیں۔ وہ کلمناس علےٰ قدر عقولہم کے مقولہ کی ماہیت اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن دل تو محض گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو انسانی جسم میں اپنے مقررہ فرائض پر مامور ہے اس سے یہ وسعت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نے جرأت سے کہا۔ اس پر بزرگ نے آہ سرد کھینچی اور سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ ایک لمحہ کے بعد سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ "دل کے معاملے عقل کے پیش نہ کرو۔ اس دنیا میں عقل کور ہے۔ سمجھنا تو درکنار اسے تلاش پر رستہ بھی نہیں ملتا۔ دل کی وسعت! ع

جادۂ ملک بقا ہے خطِ پیمانۂ دل!

ہاں اس کے متعلق کسی اہل دل سے پوچھو۔ البتہ تمہیں اس دنیا کی اگر سیر منظور ہے۔ تو چلو۔ میں ہی کرا دوں لیکن ایک شرط پر.......تم وہاں کوئی سوال نہ کرو گے؟" میں نے بزرگ کی شرط قبول کر لی۔ اور ہم چل دیئے۔

تھوڑی دور چلکر ہم ایک قلعہ کے سامنے پہنچے۔ دروازے کے باہر ہمیں چند آدمی نظر آئے۔ جن کے چہرے پر افسردگی و ملال کے آثار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندر داخل ہونے کو آئے تھے لیکن رد کر دیئے گئے۔ اس مایوسی میں ان کی رفتار کا یہ عالم تھا۔ کہ جس طرف کو چلتے قدم برعکس جانب پڑتے لیکن ایک بات پر ضرور تعجب ہوا کہ اس نامرادی و ناشادی میں بھی وہ زربفت و کمخواب کا ملبوس زیب تن کئے تھے۔ اور اکثر شکل و شباہت میں اچھے اور قوی الجسم تھے۔ میں بزرگ کے متعلق سوال کرتا۔ لیکن وہ شرط درمیان حائل تھی۔ آخر وہ میری پریشانی دیکھکر خود بول اُٹھا۔ "عزیز یہ وہ امراء ہیں۔ جن کی تمنا تھی کہ دنیائے دل کو آباد کریں۔ لیکن اس سے زندگی کی سہولتیں اور راحتیں نہ چھوٹ سکتی تھیں۔ انھوں نے لباس فاخرہ میں اس ملک کے شہنشاہ کے دربار میں آنا چاہا۔ لیکن یہاں کا اعزاز مختلف ہے۔ اس لئے ٹھکرا دیئے گئے۔" میرا راہبر خاموش ہو گیا۔ اور ہم آگے بڑھے۔ میرے دل میں اس ملک کے شہنشاہ اور اس کے دربار کے مختلف خیال چکر کاٹنے لگے۔ شہنشاہ۔ دربار۔ ویرانہ کچھ متضاد الفاظ تھے۔ اور میری حیرانی میں اضافہ کے اسباب! دروازہ پر پہنچے تو دربان نے میرے راہبر کو جھک سلام کیا جس پر مجھے خیال آیا کہ میرا راہبر ضرور کوئی معزز ہستی ہے۔ اندر داخل ہوئے۔ تو سامنے ایک نخلستان دکھائی دیا۔ جس کے ایک شفاف چشمے کے کنارے ایک دراز قد۔ سیاہ فام۔ ضعیف الجسم انسان ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ میرے راہبر نے اسی طرف کا رُخ کیا۔ ٹہلنے والے نے ہمیں اپنی طرف آتا دیکھا تو استقبال کو آگے بڑھا۔ جب ہم قریب

پہنچے تو مصافحہ ہوا۔ اور دونوں بزرگوں کے چہرے پر مسرت کے آثار یوں نمایاں ہوئے۔ جیسے اس کے قالب کی برقی رو سے بیک وقت متاثر ہوئے ہوں۔ میزبان کی یہ کیفیت تھی۔ کہ نہ سر پہ عمامہ تھا۔ اور نہ پاؤں میں جوتا۔ بلکہ بدن پر صرف ایک لمبی قبا ڈال رکھی تھی۔ جو شتری معلوم ہوتی۔ اس کی آواز میں ایک خاص گداز تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا کہ ہر لفظ دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ وہ ایک بار اس کی زبان پر آفتاب عالمتاب کا جملہ آیا۔ میں اس کے معنی سمجھنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ میرے راہبر نے کہا "مراد عشق ہے"۔ میں خاموش ہی رہا۔ میزبان نے وہاں آنے اور جانے کا مقصد پوچھا۔ تو میں نے کہا۔ "برائے سیر"۔ اس پر میزبان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ اور کہا۔ "لیجئے! ہم بھی آپ کو ایک مقام دکھلائے دیتے ہیں"۔ یہ کہکر اس نے اپنے سینے کی بائیں جانب سے قبا ہٹا دی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک سوراخ تھا۔ جس کے آگے ایک وسیع میدان۔ میدان میں کسی شفاف چیز کی ایک بڑی تختی تھی۔ جس پر لکھا تھا "محمد" میں یہ نظارہ دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ اس میدان کی فضا میں ارتعاش ہوا۔ لفظ "محمد" کا رنگ آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ پہلے سرخ۔ پھر زرد۔ پھر سفید۔ بالآخر وہ لفظ اس قدر چمک اٹھا کہ ساری فضا نورانی ہو گئی۔ لفظ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اسی جگہ بجلی کی ایسی چمک ہوئی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ کسی مافوق الادراک ہستی کا جلوہ تھا۔.......... کسی حسین کامل کا پرتو۔ میں تصویرِ حیرت بنکر رہ گیا۔ اور آنکھیں کھلیں تو اس بزرگ کی قبا اپنی اصلی جگہ پر تھی۔ میں آہستہ آہستہ جھکا اور بزرگ میزبان کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ میری حیرانی دیکھ کر اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہنے لگا۔ "یہ اسی ایک لفظ کے مختلف جلوے تھے۔ جسے عشاق اسم اعظم سے بڑھکر سمجھتے ہیں۔ جس کا ورد بیمار قلوب کا علاج ہے۔ اور جو مافوق الادراک ہستی کے نظارے کا واحد ذریعہ ہے"۔ میں کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔ لیکن میزبان نے میرے راہبر سے کہا "ہاں! اس کو اور آگے لیجائیے"۔ چنانچہ ہم رخصت ہوئے۔ تھوڑی دور چلے۔ تو آدمیوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ ان کی مجنونانہ حالت۔ بوسیدہ لباس اور پراگندہ صورتیں کچھ بھی دلکش نہ تھے۔ کہ ہمیں روکتے۔ تاہم میرے راہبر نے ایک نفرت انگیز لہجہ میں کہا "یہ ان مدعیان تصوف کا گروہ ہے جو دنیوی آقاؤں کی ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ جنہیں شکم پروری کا شوق بھی تھا۔ اور اہل دل بننے کا بھی۔ جن کا مسلک دو عملی تھا۔ غربا کے سامنے بارگاہ عشق کے مجاور تھے۔ اور امراء کی مجالس رقص و سرود میں حظ نفس اٹھاتے۔ یہاں پر ان کو ایک مجنونانہ حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ خسر" الدنیا و الاخرۃ کے مصداق یہی ہیں"۔ اس وقت تک وہ گروہ ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں اس کی طرف دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کی متوحش آنکھوں کا اضطراب، چہروں کی پژمردہ رنگت، خشک لب۔ آشفتہ بال اور بیہودہ حرکات اتنے مکروہ تھے کہ میں نے منہ پھیر لیا۔

آگے چلکر ہم ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ جس کی وسعت ہماری حد نگاہ تھی۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید ویرانہ

سا شروع ہوگا۔ آبادی ختم ہو چکی۔ میرے راہبر نے مجھے دیکھا اور مسکرا دیا۔ پھر انگلی کے اشارے سے دور کچھ دکھانا چاہا۔ لیکن میں نہ دیکھ سکا۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک انسان کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ یوں تو وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ چہرے پر تسکین کے آثار تھے۔ اور اس کے جذبات سے یہ معلوم ہوتا کہ اس پر امید غالب ہو چکی ہے اور اب وہ مسرت سے اٹھا جاتا۔ اسکی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں۔ اور کچھ وقفہ کے بعد قدرے بڑبڑا لیتا۔ ایک بار اس نے یوں ہاتھ کھولے۔ جیسے کسی سے گلے ملنا چاہتا ہے۔ اسکی زبان پر دو بار آ بیٹے کا لفظ بھی آیا۔ غرض ہم اس عجیب الخلقت انسان کے قریب تر ہوئے۔ میرے راہبر نے سلام علیکم کہا لیکن وہ خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ میرے راہبر سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہوا۔ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اس سے بے اختیارانہ ایک صدا نکلی۔ جس سے تمام فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ زمین سے مٹی کے ذرے اڑ اڑ کر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے۔ دور درختوں میں طیور نے اپنے نغموں کے ساز چھیڑ دئے۔ غزال وحشت سے دوڑنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہر چیز بیتاب ہو گئی ہے۔ اور کسی نظارہ جمال کی مشتاق! فضائے آسمانی کے رنگ بدلنے لگے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نورانی نکتہ نمودار ہوا۔ جو بڑھتے بڑھتے کئی گز وسیع ہو گیا۔ اس پر ایک بجلی کی سی چمک ہوئی۔ میری آنکھیں خیرہ ہو کر بند ہو گئیں۔ جب دوبارہ کھلیں تو وہیں اس نکتہ کے مقام پر ایک پری تمثال عورت موجود تھی۔ میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کے روشن جبین پر لفظ "لیلےٰ" نورانی حروف میں رقم تھا۔ معاً میں نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ تو اس نحیف انسان کو سر بسجود پایا۔ طیور خاموش تھے۔ غزال ساکن! فضائے کائنات ایسی ساکت تھی جیسے طوفان کے بعد سکون۔ میرے راہبر کا چہرہ جوش مسرت سے چمک رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں اسی نظارہ پر گڑی ہوئی۔ اتنے میں تصویر کے رنگ مدھم پڑنے لگے۔ اور وہ آہستہ آہستہ زائل ہو گئی۔ میرے راہبر نے نحیف انسان کو سجدے سے اٹھایا۔ اور گلے لگا لیا۔ آخر وہ کہنے لگا۔ "انہی تجلیات کے ہم شیدائی ہیں۔ اور انہی کو روز دیکھتے ہیں۔ ہماری زندگی کا مدار انہی پر ہے۔ ہم قالب سے آزاد روح میں بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ فرسودہ جسم جس نے ہمارے لئے ایک عرصہ تکالیف برداشت کی ہیں۔ ہمیں پیارا لگتا ہے۔ اور جب تک ہم اس تصویر کے رنگوں میں نہ کھو جائیں اسے اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہر ایک انسان فطرتاً تو ان تجلیات کا شیدائی بنایا گیا ہے۔ لیکن اکثر کو جبلی کمزوریاں اس بلندی تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ اور بجائے ان تصاویر کے رنگوں میں کھو جانے کے اپنے ماحول کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تمہارا راہبر اکثر کہتا ہے ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود ✽ از آنچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

میرے راہبر نے اجازت چاہی اور ہم رخصت ہوئے۔

کچھ دور گئے تھے کہ ہمیں ایک مہیب اور سنسان جنگل دکھائی دیا۔ میرے راہبر نے لوٹ کر کہا۔

"یہ جنگلی درندوں کی آماجگاہ ہے۔ اس میں سے گزرنا دشوار و خطرناک ہے۔ لیکن جب بھی تمہیں گھبراہٹ ہو۔ تم میرے پاؤں میں دیکھنا۔" جوں جوں ہم اس ہولناک خطے کے قریب ہوتے گئے مختلف درندوں کی دہشت انگیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جب ہم ایک سرے سے داخل ہونے لگے تو دو شیر ہماری طرف لپکے۔ میں خوف سے لرزہ براندام ہوگیا۔ اور فوراً اپنے راہبر کے پاؤں میں دیکھا۔ میرا دیکھنا ہی تھا۔ کہ ماحول کا نقشہ بدل گیا۔ میں نے خودکو ایک شہر کے بازار میں گھومتے ہوئے پایا۔ شہر میں لوگوں کی آمد و رفت عام تھی۔ میں نے کئی ایک کو غور سے دیکھا لیکن میرا آشنا سا کوئی نہ نکلا۔ اپنی خیالات میں منہمک تھا کہ یکا یک میرا راہبر رکا اور میری توجہ بھی بدل گئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دو شیر جن کے سر انسانوں کے تھے میرے راہبر کے پاؤں پر جھک رہے تھے بزرگ نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر وہ اٹھکر چلدیئے۔ ان کے جانے پر بزرگ نے مجھے غور سے دیکھا۔ اور کہنے لگا "یہ وہ عشاق ہیں۔ جنہوں نے اپنا گنجینۂ حسن حاصل کرنے کو بیگناہ لوگوں کا خون بہایا۔ اس مملکت میں ان کا یہی درجہ ہے"

ہم دونوں آگے بڑھے۔ جب جنگل کا ایک حصہ عبور کر لیا۔ تو ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ میرے راہبر نے کہا "آنکھیں بند کر لو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ ایک لمحہ کے بعد پھر کہا۔ کھول دو۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ تو خودکو دریا کے پار پایا۔ جب اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ہم نے اس کا رخ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے۔ تو اس نے دروازہ پر دستک دی۔ جواب ندارد۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک سرو قد۔ پری چہرہ گلفام نازنین نکل آئی۔ میرے راہبر کو دیکھتے ہی مسرت کی لہریں اس کے روئے نگارین پر دوڑنے لگیں۔ عورت برہنہ سر۔ برہنہ پا تھی۔ گلے میں ایک کرتہ تھا جس کے بازو شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ ستر پوشی کو ایک تہمند باندھ رکھا تھا۔ انجذاب حسن کی یہ کیفیت تھی کہ پہلی ہی نظر میں مجھے دنیا و مافیہا بھول گئے۔ وہ شرمائی ہوئی آگے بڑھی میرے راہبر نے سلام علیکم کہا اس نے جواب کے بعد بزرگ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور میری طرف دیکھا۔

مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ گرا ہی چاہتا تھا کہ بزرگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ نازنین میرے راہبر سے مخاطب ہوئی۔ آج یہ آپ کے ہمراہ کیسے آئے ہیں۔ "انہیں بھی ویرانہ دل دیکھنے کی تمنا تھی۔ چنانچہ قدرت سے میں ان کا راہبر مقرر ہوا۔ باقی ملک کی سیر ہو چکی۔ آپ کا دیدار آخری ہے۔" بزرگ نے تبسم آلود لبوں سے کہا اور سر جھکا دیا۔ حسینہ نے ہمیں بٹھایا اور اندر جا کر چھاچھ کا ایک کاسہ بھر لائی۔ بزرگ کے پیش کیا۔ انھوں نے تھوڑا سا پیا اور لبتایا مجھے دیدیا۔ اس چھاچھ کے پینے نے جو لذت و سرور بخشا اس کا اندازہ صرف پینے سے ہی ہو سکتا ہے۔ قلم کو اس کے بیان کی مجال نہیں۔ غرض اس کے ملنے سے مجھ پر کچھ ایسا کیف

بیخودی طاری ہوا جیسے شاید اہلِ وجدان نے حالتِ وجد میں محسوس کیا ہوگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے حواسِ خمسہ کے علاوہ مجھ میں کوئی اور حس پیدا ہوگئی ہے۔ اور ابھی میں عالمِ بالا کے رموز سے واقف ہوا چاہتا ہوں۔ حسینہ کی نگاہیں ہم سے پلٹ کر آسمان کی طرف اُٹھیں۔ اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ یکایک میرے کانوں میں بانسری کی آواز پڑی۔ سریلی آواز۔ رنگین نغمہ۔ خداوندی صوت۔ کچھ ایسی لے تھی کہ جس سے میرے کان ناآشنا تھے جیسے شاید عالمِ بالا والے بھی برسوں میں ایک بار سنتے ہیں۔ ہولناک جنگل پر سکوت طاری ہوا۔ درندوں کی مانگنا صدائیں خاموش ہوگئیں۔ طائر خاموش! ہوا خاموش! تمام کائنات پر ایک حالتِ وجد طاری تھی۔ صاف مطلعِ آسمانی پر ایک ابر کا ٹکڑا نمودار ہوا۔ ابر کا ٹکڑا۔ سفید! روشن! بانسری کا نغمہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ حالتِ وجد بڑھنے لگی۔ گویا کائنات اسی ایک بانسری کے نغمے میں کھوئی جاتی تھی۔ یکایک فضائے آسمانی میں ایک ہاتھ نکلا۔ پُراسرار ہاتھ بادل کی طرف بڑھا۔ اور اسے چادر کی طرح ایک سرے سے پکڑ کر ہٹا دیا۔ سفید چادر کا ہٹنا تھا۔ کہ پیچھے سے ایک خوش رو۔ بلند و بالا نوجوان بانسری بجاتا ہوا ظاہر ہوا۔ بانسری میں وہ خود اتنا محو تھا۔ کہ لذتِ صوت سے اس کا سر جھوم رہا تھا۔ میں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو حسینہ کو اسی محویت میں پایا۔ میرا راہبر سر جھکائے پاس کھڑا تھا۔ جب میں نے دوبارہ اس عجیب منظر کی طرف دیکھا۔ تو وہی پُراسرار ہاتھ ردائے ابر کو برابر کر چکا تھا۔ آہستہ آہستہ بانسری کی صدا دور ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ہم سننے سے رہ گئے۔ حسینہ نے ایک جمائی لی اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔ "یہی نغمہ، یہی صوتِ خداوندی! یہی بانسری کی آواز ہماری روح کی غذا ہے۔ اس شکل کو دیکھ کر اور اس آواز کو سن کر میں ابھی تک زندہ ہوں۔ اور تا ابد زندہ رہوں گی۔" یہ سنتے ہی میرے راہبر نے وجدانی صورت میں سر ہلایا۔ اور کہا ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

میں اپنے خواب بیداری سے چونک اٹھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو نہ وہ صورتیں تھیں۔ اور نہ وہ دالان تھا۔ دالان کا چراغ ہوا کے کسی جھونکے سے گل ہو چکا تھا۔ اور وہ تنہا ستارہ ابرِ سیاہ میں غائب! البتہ یہ مصرع وردِ زبان تھا ؎

جادۂ ملکِ بقا بے خطِ پیمانۂ دل!

قرآن اور قیام امن

(جناب مولانا غلام مرشد صاحب مدظلہٗ۔ لاہور)

تمام اولاد آدم علیہ السلام ابتداً میں ایک ہی قوم تھی۔ ان میں نہ تو کسی قسم کا باہمی اختلاف تھا۔ نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے جن اختلافات نے پیدا ہو کر تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انکے انسداد کا اللہ تعالےٰ نے وحی نبوت کا عالمگیر سلسلہ جاری فرما کر انتظام کر دیا۔ اور اس نے جس طرح ہوا، پانی، حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا ہے۔ نہ زبان و وطن کا۔ اسی طرح یہ روحانی ہدایت بھی ہر قسم کے تعینات و امتیازات سے پاک ہے۔

اسی روحانی ہدایت و قانون سعادت و ضابطۂ اخوت و آئین محبت کی تمام پیغامبر اور مذہبی پیشوا اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی زبانوں میں لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں اور انہوں نے سارا زور اسی پر صرف کیا ہے کہ لوگوں کے پیدا کئے ہوئے جغرافیائی اور نسلی امتیازات اور حیثیت و زبان کے تعینات کے مضر اثرات سے صرف وہی روحانی تعلیم بچا سکتی ہے۔ اور یہی عالمگیر بخشش نسل انسانی کو زبانوں، قبیلوں، وطنوں اور دوسری طرح طرح کی گروہ بندیوں کے پرستار ہونے سے روک سکتی ہے۔ اور اس قدر اختلافات رکھنے پر بھی انکو ایک دوسرے سے جوڑ سکتی ہے۔ ان مقدس مذہبی پیشواؤں کی غیر حاضری میں انکے اکثر پیرو [illegible] تدریجاً اس تعلیم کو چھوڑ دیا جو ہزار ہا خود ساختہ اختلافات رکھنے پر بھی ان کو ایک دوسرے سے جوڑی ہوئی تھی۔ اور ایک ہی معبود کے [illegible] ہوئی تھی۔ اور مذہب، خدا، دین، پیغامبروں کے نام پر متعدد گروہ بندیاں پیدا کر لیں اور نہ صرف نجات و فلاح [illegible] پر رکھنے کی بجائے اپنی خود ساختہ اعمال و رسوم پر رکھی۔ بلکہ ہر گروہ نے دوسرے کے خلاف نفرت و تعصب [illegible] شروع کر دی۔ اور نسلی، جغرافیائی، لسانی اختلافات کی طرح مذہبی اختلافات کو سرتا سر بغض و عداوت۔ نفرت و توحش اور قتل و خونریزی کی راہ بنا دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب تعلیم الٰہی کو آخری بار مکمل و محفوظ صورت میں نسل انسانی کے سامنے قرآن کریم کی شکل میں پیش کیا اس وقت خود ساختہ مذاہب کا اختلاف انسانی قتل و خونریزی کا سب سے بڑا سبب تھا۔ کسی ایک گروہ کے اقتدار میں دوسرے تمام گروہوں کی موجودگی ناقابل برداشت تھی۔ اور مذہب۔ خدا۔ پیغمبر کے نام پر ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

نسل انسانی کی اس مذموم روش کی تعبیر قرآن پاک نے "فتنہ" و "فساد" سے کی ہے۔ اسی فتنہ و فساد کو مٹانے کے لئے ایک طرف اس نے تمام مذہبی پیشواؤں کی تعظیم کرنے کا حکم دیا۔ دوسری طرف تمام مذہبی گروہوں کی عبادتگاہوں کا احترام ذہن نشین کرایا۔ اور نہ صرف اعتقاد و عمل کی آزادی کا درس دیا۔ بلکہ اگر کسی امن پسند گروہ کو محض اختلاف رسوم و اعمال کی بنا پر دوسرا گروہ صفحۂ ہستی سے نابود کر دینا چاہتا ہو اور اس ظلم و فساد اور قتل و غارتگری کا ازالہ اور کسی طرح ممکن نہ ہو۔ تو یہ محکم کتاب اس کے انسداد کے لئے جنگ کا حکم دیتی ہے۔ اور ان فتنہ پرداز انسانوں کے مقابلہ پیٹھ دکھلانے کی سختی سے مخالفت کرتی ہے۔

نصیحت آموز افسانہ

پاداش عمل

(از محترمہ مسز عبدالقادر۔ لاہور)

کئی روز سے میں یہ خواب بلاناغہ دیکھ رہی تھی۔ ہر چند خیالات اس طرف سے ہٹانا چاہتی۔ مگر دل نہ مانتا۔ وہ اپنی ہٹ پر تلا ہوا تھا کہ مشیت کو ضرور کچھ نہ کچھ منظور ہے۔ [illegible] تشدد [illegible] اپنے بستر میں بیٹھی اسی ادھیڑ بن میں تھی میرا دل بہت [illegible] جو میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہ خواب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نرالا تھا۔ طبیعت یہ کہ کسی کے سامنے بیان بھی نہ کر سکتی تھی مبادا کوئی دیوانہ سمجھے۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچی کہ مجھے روہتاس ضرور جانا چاہیئے۔

(۲)

قلعہ روہتاس جہلم سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر ایک خطرناک برساتی نالہ کے پار واقع ہے جس کا پاٹ کئی میل چوڑا ہے یہ نالہ جس کو گھان کہتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں قہر خدا کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اونٹ گھوڑا انسان جو بھی اس کی زد میں آجائے بہالے جاتا ہے۔ قلعہ روہتاس کو بڑے بڑے دیو ہیکل پہاڑ اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ بستی ہے۔ دوپہر کے وقت ہمارا مختصر قافلہ گھان کے کنارے پہنچ گیا۔ یہ قافلہ صرف چار آدمیوں پر مشتمل تھا جن میں ایک تو میں خود تھی۔ دوسری میری والدہ محترمہ۔ تیسری میری منہ بولی بہن رضیہ اور چوتھا میرا ملازم غازی تھا چونکہ گھوڑے بکثرت کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ اس لئے فوراً ہی سواری کا انتظام ہوگیا۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ تک ہم لوگوں نے گھان کو عبور کرلیا۔ اور چکر دار پہاڑی راستہ طے کرتے ہوئے خواص خانی دروازہ سے قلعہ روہتاس میں داخل ہوئے۔ قلعہ کے شاندار دروازے مستحکم فصیل۔ پائدار دمدمے۔ اور عجیب و غریب عمارات دیکھکر بانی قلعہ کی عظمت کا دبدبہ دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ قلعہ جو کئی مربع میل زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ خوبصورت عمارتیں اب کھنڈرات کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ لیکن باہر سے دیکھنے پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی معمار اس [illegible] کو مکمل کر کے گئے ہیں۔

قلعہ کے نصف حصہ میں ایک پر رونق قصبہ آباد ہے۔ اور نصف حصہ بالکل غیر آباد اور سنسان پڑا ہے۔ جہاں دن دہاڑے گذرتے بھی خوف آتا ہے۔ بہت سے مافوق الفطرت افسانے اس قلعہ سے منسوب ہیں۔ جب ہم لوگ منزل مقصود پر پہنچے۔ دن ڈھل چکا تھا۔ سوہل دروازہ پر ڈاک بنگلے میں رہائش کا بندوبست کیا گیا۔

سوہل دروازہ خوبصورتی اور پائداری کے لحاظ سے روہتاس کی سب عمارات میں ممتاز ہے۔ مگر بالکل غیر آباد حصے میں واقع ہے۔ اس کی اوپر والی منزل سے اب ڈاک بنگلے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک بوڑھے باادب چوکیدار نے بڑے

نپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا گھوڑوں کی سواری سے کافی تھکاوٹ ہو چکی تھی۔ سیر کا موقع نہ ملا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی میں اور رضیہ چائے سے فارغ ہو کر سیر کے واسطے تیار ہو گئیں۔ والدہ محترمہ اس وقت تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ ہم دونوں جلد ہی سیر کے واسطے نکل جائیں۔ تاکہ والدہ محترمہ ساتھ نہ جاسکیں۔ کیونکہ ایک تو بڑے بوڑھوں کا ساتھ ہی نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں چاہتی تھی کہ کسی ویرانے میں جہاں کوئی مخل نہ ہو اچھی طرح قدرت کا نظارہ کروں۔

چنانچہ میں نے چوکیدار سے دریافت کیا کہ اندھیری برج کس جگہ واقع ہے۔ اور یہاں سے کتنی دور ہے۔

چوکیدار نے جواب دیا سفید عمارت جو سامنے دکھائی دیتی ہے۔ وہی اندھیری برج ہے۔ مگر راستہ ناہموار اور دور ہے۔ ادھر سے جاتے ہوئے آپ کو تکلیف ہو گی میں آپ کو ایک چور دروازہ کھول دونگا۔ ادھر سے ایک نہایت صاف اور آرام دہ راستہ فصیل کے اوپر سے جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ آپ آسانی سے وہاں پہنچ جائینگی۔ مگر وہ راستہ ہے۔ بڑا سنسان کبھی کبھی انگریز سیاح جو یہاں مقیم ہوتے ہیں۔ اس راستے سے وہاں جاتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں آپ کے ساتھ جاؤں۔

میں۔ نہیں تمہاری کچھ ضرورت نہیں۔ راستہ سنسان ہے۔ تو کیا ہوا ہم بھی تو دو ہیں۔

چوکیدار۔ حضور اندھیری برج بڑا خطرناک ہے۔ وہاں اکیلے دکیلے کا کام نہیں۔ وہ تو چڑیلوں کا مسکن کہا جاتا ہے۔

رضیہ۔ چڑیلیں ہمیں کیا کہیں گی۔ ان سے تو ہمارا بہناپہ ہے۔

چوکیدار خاموش ہو گیا۔ اور تعجب خیز نگاہوں سے دیکھ کر ہمارے آگے ہو لیا۔ اور چور دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ گیا

(۴)

نیلگوں آسمان پر سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہوا یاد رفتگاں میں سرد آہیں بھرتی ہوئی خاردار جھاڑیوں میں سے گذرتی تو ایسی دردانگیز صدا نکلتی جیسے کوئی دکھیا مزار محبوب پر نوحہ کر رہی ہے۔ کھنڈرات زبان حال سے پکار پکار کر دنیا کی بے ثباتی کا اظہار کر رہے تھے۔ راستہ واقعی مہیب تھا۔ جا بجا ٹوٹے ہوئے زینے اور برجیاں مکڑی کے جالوں سے پٹی ہوئی تھیں جگہ جگہ جنگلی جانوروں کے گھونسلے تھے۔ جب وہ ہمارے پاؤں کی آہٹ سنکر پروں کو پھڑپھڑاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ غول بیابانی تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہم دونوں تیز رفتاری سے چلنے لگیں۔ خدا خدا کر کے راستہ ختم ہوا۔ اور اندھیری برج میں پہنچیں۔ نام کو تو اندھیری برج ہے۔ مگر اندھیرے کا نام و نشان تک نہیں۔ یہاں آکر ہماری وحشت دور ہو گئی۔ سنسان تو یہ بھی تھا مگر کہیں کہیں چرواہے اپنی بکریوں کے پیچھے اونچے سروں میں الاپتے ہوئے نیچے سے گزر جاتے تھے۔ ہم دونوں دریچوں میں بیٹھ گئیں یہاں سے نہایت دلفریب مناظر دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف میلوں لمبا چوڑا نالہ۔ دوسری طرف پہاڑ۔ تیسری طرف جہلم کی شاندار چھاؤنی۔ اور سامنے رہتاس کا خوبصورت قلعہ۔

ہم دیر تک وہیں بیٹھے ناپائیداری دہر پر اشک حسرت بہاتی رہیں۔ چڑیلوں وغیرہ سے تو سامنا نہ ہوا۔ البتہ باد تند کے جھونکے جب جھروکوں سے ٹکراتے تو ایک نامعلوم مگر پرسوز نغمہ پیدا ہوتا۔ جس سے عمارت کے در و دیوار گونج اٹھتے۔ یہ سماں ہمیں کچھ ایسا بھایا کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی طنجیانہ انداز میں کہتا ہے۔ کہ ایک لمحہ تو اور ٹھہرو۔ اس نامعلوم کشش نے ہمارے دلوں کو مسحور کر رکھا تھا۔

یکایک بستی کی طرف سے کچھ شور و غل کی آوازیں سناٹے کو توڑنے لگیں۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ایک نحیف و کمزور ضعیفہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتی لڑکھڑاتی چلی آتی ہے۔ اور اس کے پیچھے بستی کے آوارہ لونڈے تالیاں بجاتے پگلی رشیمہ پگلی کا غل مچاتے آتے ہیں۔

ضعیفہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ کوئی دم میں گرا ہی چاہتی تھی۔ بار بار کھانسنے سے دمہ کی مریض ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اس کا یہ حال ہم سے نہ دیکھا گیا۔ فوراً نیچے اتر کر اسی شکستہ سڑک پر آگئیں۔ اور بمشکل اس کو ظالم بچوں کے چنگل سے چھڑایا۔

(۴)

پگلی میانہ قد کی گوری چٹی پاکیزہ صورت عورت تھی۔ گو کہن سالی نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ مگر خد و خال صاف کہہ رہے تھے کہ کسی زمانے میں نہایت ہی حسین و جمیل ہوگی۔ بظاہر اس میں دیوانہ پن کی کوئی علامت نہ تھی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھی میری طرف دیکھ کر اظہار تشکر کے طور پر مسکرا رہی تھی۔ اب اس کی حالت کچھ سنبھل چکی تھی۔ مگر تھکی ماندی ہونے کی وجہ سے جائے رہائش تک جانے کے قابل نہ تھی۔ مجھے اس پر بے حد رحم آیا۔

میں۔ بڑی بی مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر میری مدد کی آپ کو ضرورت ہو تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔

پگلی۔ (جس کی آنکھوں میں اب آنسو بھر آئے تھے) بیٹی خدا تجھے جزائے خیر دے۔ اگر تو وقت پر نہ آتی تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ میں پچھلے ہفتہ بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ ان ناسمجھ بچوں کو کیا خبر کوئی مرے یا جیے۔ ان کی بلا سے۔ میں لاوارث ہوں۔ اور قبرستان کے پچھواڑے کھنڈرات میں رہتی ہوں۔

میں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم دونوں مل کر آپ کو وہاں تک پہنچا آئیں۔

پگلی نے میری طرف دیکھا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کچھ کہا اور ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

رضیہ۔ (میرے کان میں آہستہ سے) آپ تو پوری طرح اس پگلی کی گرویدہ ہو گئی ہیں۔ اگر یہ چڑیل ہوئی تو پھر۔

میں نے ہرچہ بادا باد کہتے ہوئے پگلی کو اٹھایا۔ وہ ہمارے بازوؤں کا سہارا لیتی ہوئی پیچ دار راستوں اور پگڈنڈیوں میں سے گزرتی ہوئی ایک کھنڈر کے قریب آ کر رک گئی۔

یہ تھا اس پگلی کا گھر جس میں وہ زندگی کے آخری اور تکلیف دہ دن گزار رہی تھی۔ دو کوٹھڑیوں کے آگے ایک چھوٹا سا صحن

میں کی ایک دیوار منہدم ہو چکی تھی۔ اس نے ادھر گھاس پھوس کی دیوار بنا رکھی تھی۔ یہ مکان کسی شاہی عمارت کا حصہ تھا۔ اس کا سامان بالکل مختصر تھا۔ صرف دو چار پائیاں۔ ایک پھٹا ہوا پرانا بستر ایک بوریہ۔ اور چند مٹی کے برتن اس کی کائنات تھی مگر سب چیزیں صاف وستھری تھیں۔ صحن میں ایک طرف بکری بندھی ہوئی تھی۔ جس کے دودھ پر اس کا گذارہ تھا۔ میں نے کچھ نقدی اس کے آگے رکھی۔

پگلی (نقدی واپس کرکے) بیٹی خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں تمہاری بہت ممنون ہوں۔ تم نے میرے لئے بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔ مجھے نقدی کی ضرورت نہیں۔ خدا نے مجھے ان سب چیزوں سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ میں صرف دودھ ہی پیتی ہوں۔ سو میری بکری کا دودھ کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ میرا بال بچہ تھوڑا ہی ہے۔ جس کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہو۔

میں۔ اس ویرانے میں آپ کی خبر گیری کون کرتا ہے

پگلی۔ ایک نیک عورت ہر روز صبح قبرستان آتی ہے۔ [illegible] جب کبھی وہ خود نہیں آتی تو اپنی لڑکی کو بھیج دیتی ہے۔ آج تین چار دن سے وہ خود نہیں آئی۔ اس کی لڑکی [illegible] معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ میں اس کی بیمار پرسی کو قصبہ کی طرف گئی تھی۔ ورنہ ڈیڑھ دو سال سے میں کبھی قصبہ کی طرف نہیں گئی۔

بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ کہ کب آئی ہو کس طرح آئی ہو۔ کہاں ٹھہری ہو۔ کہاں سے آنا ہوا۔ میں اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔

لیکن جب میں نے جہلم سے آنے کا بتایا۔ تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی پھر ایک لمبی سانس لی اور آبدیدہ ہوکر سر نیچا کر لیا۔ یکایک وہ کرب واضطراب سے کراہنے لگی۔

جب میں نے ذلگوں ... اس کی طرف دیکھ رہی تھی تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں ... منہ سے کف جاری تھا۔ مجھے مخاطب کرکے رعب دار آواز میں کہنے لگی۔

پگلی۔ ظلم کی بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھتی۔ خدا کی ... بدلتا چھوڑتا نہیں۔ دنیا دار المحن ہے۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ ضرور کسی دن اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

گو یہ باتیں مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ مگر ان سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس کی حالت دم بدم ابتر ہو رہی تھی۔ وہ یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں حیران تھی کہ اس بڑھیا میں اتنا زور کہاں سے آگیا ہے۔ اندر جاکر وہ طاقچے سے ایک بٹوہ نکال لائی اور کہنے لگی۔

پگلی۔ لو یہ بتیس روپے ہیں جو ہاشم نے مجھے بطور حق مہر دئے تھے۔ یہ اسے واپس دیدو۔ کیا ان چند ٹکوں سے اس ظلم و ستم کی تلافی ہو سکتی ہے جو اس نے مجھ بے زبان پر توڑے اور کیا ان سے میری کھوئی ہوئی محبت واپس مل سکتی ہے۔ کیا ان سے میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ سکتا ہے۔ کیا یہ میرے ناسور دل پر مرہم کا کام دے سکتے ہیں۔ کیا ان سے خوشی اور سکون خریدے جا سکتے ہیں۔ نہیں کبھی نہیں۔ میری فریاد عرش معلےٰ میں غلغلہ کرتی ہوئی رب العزت کے حضور میں پہنچ چکی ہے۔

مظلوموں کا خدا اس پر ملائکہ مقربین کے سمیت لعنت کرتا ہے۔ عرش و کرسی لوح و قلم تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ ان چند ٹکوں کی ادائیگی پر وہ خدا کے سامنے سچا نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔ مگر خود ہی اس دھوکے میں گرفتار ہوگا۔ اسے کہہ دو کہ اے انسان نما درندے میں نے اس عظیم الشان عدالت میں جس کے سامنے دنیا کی تمام عدالتیں ہیچ ہیں۔ انصاف کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ تو بدلے کے لئے تیار ہو جا۔ اور آج سے چالیسویں دن اسی بڑی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کر۔

میں اس پگلی سے اتنی مرعوب ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے بٹوہ اس کے ہاتھ سے لیلیا۔

رضیہ ہر چند اشاروں سے منع کرتی رہی مگر میں نے توجہ نہ دی۔ میں کسی نامعلوم طاقت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ پگلی برابر بول رہی تھی۔ یکایک اسے دمہ کا ایسا سخت دورہ پڑا کہ کھانستے کھانستے بیہوش ہو کر گر پڑی۔

ہم دونوں نے ملکر منہ پر پانی ڈالا۔ پلنگ پر لٹا دیا۔ جب کافی عرصے کے بعد اس کو ہوش آیا تو میں نے ہاشم کے متعلق دریافت کرنا چاہا۔ مگر وہ باوجود انتہائی کوشش کے کچھ نہ کہہ سکی۔ دورہ پھر شروع ہوا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں چہرے پر مردنی چھا گئی۔ یہ نظارہ میرے لئے سوہان روح تھا۔ میں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اسی گھبراہٹ میں باہر کی طرف بھاگ کر دروازے تک پہنچ گئی۔ چاہتی تھی کہ بھاگ جاؤں لیکن رضیہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

رضیہ نے مجھے تسلی دیتی ہوئی بہن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مرنے سے کیا ڈرنا۔ یہ وقت ہر ذی روح پر آتا ہے حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ آخر وہ بھی ہماری طرح انسان ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے منہ میں پانی ٹپکائیں۔ اور اس کے پاس کلمہ شریف پڑھیں۔ رضیہ ایسے بہت سے وقت گذار چکی تھی۔ اس کا دل مضبوط ہو گیا تھا۔

مجھے بھی مجبوراً اس کی پیروی کرنی پڑی۔ ہم دونوں پانی کا پیالہ لئے کلمہ شہادت پڑھتی ہوئی اس کی چارپائی کے قریب گئیں۔ مگر وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ہم نے مرحومہ کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ منہ کعبہ کی طرف پھیرا اور میت پر کپڑا ڈال انا للہ وانا الیہ راجعون کہتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

جب ہم گرتی پڑتی جائے رہائش پر پہنچیں۔ تو دن ڈھل چکا تھا۔ والدہ محترمہ کو بہت تشویش تھی۔ آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ مگر آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا گیا۔

میرا دل کچھ اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ بغیر کچھ کھائے پیئے سو گئی۔ اب مجھے رہتا اس کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ہم لوگ دوسرے دن ہی واپس آگئے اور یہ واقعہ سب کے سامنے بیان کیا۔ مگر سوائے حیرت کے کوئی بھی اس کے متعلق کچھ رائے قایم نہ کر سکا۔

(۵)

رات کا وقت تھا۔ بارش بڑے زور و شور سے ہو رہی تھی۔ کبھی اولے پڑتے۔ کبھی موسلا دھار پانی برستا۔ رعد کی گرج سے کانوں کے پردے پھٹے پڑتے تھے۔ بجلی کی چمک سے کمروں کے اندر بھی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

طوفان کا وہ زور تھا کہ الاماں۔ درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت کا فرشتہ اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ دنیا والوں سے آمادۂ جنگ ہے۔ یہ رات ایسی ہولناک تھی کہ خدا پھر کبھی نہ دکھائے۔

ہم لوگ سہمے ہوئے اپنے بستروں میں بیٹھے تھے کہ اچانک ہماری خوابگاہ کے پچھواڑے والا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں، اس وقت دستک دینے والا کون ہے۔ سب نے تعجب سے کہا۔

میں (اپنی ملازمہ سے) مرجان جاکر دریافت کرو کون ہے۔

مرجان بیچاری ہچکچاتی ہوئی گئی اور آنے والے کا نام سنکر یکدم اچھل پڑی۔ جیسے کسی سانپ نے کاٹا ہو۔ اگر دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو ضرور گر پڑتی۔

ہم لوگ حیران تھے کہ اِس کو کیا ہوا۔ کھٹاکھٹ پھر آواز آئی۔

میں۔ مرجان کون آیا ہے۔

مرجان۔ صدائے برخواست۔

میں (جھڑک کر) اری مرجان موئی بتاتی کیوں نہیں۔

مرجان۔ (لڑکھڑاتی زبان سے) ہا......ہا.........ہا......... ہاشم

سب کی زبان سے یکدم نکلا ہاشم۔ اور کلیجے دھک سے رہ گئے۔ بچے چیخیں مار کر رونے لگے۔ مجھ پر ایسی ہیبت چھائی کہ "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں"۔

میں۔ الہی آج کیا ہونیوالا ہے۔ ایسے وقت میں آنے والا ہاشم خدا جانے کیسا مہیب اور ڈراؤنا ہوگا۔

دروازہ برابر کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ ہمارے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے۔ آخر میرے شوہر نے کہا اجی کیا اندھیر ہے وہ بھی تو انسان ہی ہوگا۔ کوئی ہوّا تو نہیں۔ یہ کہکر دروازہ کیطرف بڑھے ہم لوگوں نے شدت خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ دروازہ کھول دیا گیا وہ ہنسکر کہنے لگے۔

لو جی۔ جس سے ڈرتے تھے وہ تو گھر کا ہی آدمی نکلا۔ اور ساتھ ہی ہمارا بوڑھا خانساماں چھٹن ہانپتا کانپتا اندر آگیا۔

میں۔ کیوں خانساماں تمہیں کیا ہوا؟

خانساماں۔ آہ بیگم صاحبہ میں وہی بدنصیب ہاشم ہوں جس کی بیوی کا قصہ چالیس روز ہوئے آپ نے بیان کیا تھا۔

ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ چھٹن ہی ہاشم ہوگا۔ اس نے اپنی کہانی اس طرح بیان کی:۔

چھٹن۔ میں یوپی کا نہیں۔ بلکہ ضلع جالندھر کا رہنے والا ہوں جسین وجمیل۔ رشیمہ میرے سگے چچا

کی اکلوتی لڑکی اور میری منکوحہ تھی۔ والدین کا سایہ بچپن ہی سے میرے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لئے چچا کے پاس ہی رہنے لگا۔ میرا چچا اچھا خاصہ زمیندار تھا۔ میں چونکہ لاڈ پیار کی وجہ سے آوارہ ہوگیا تھا۔ اسی لئے کوئی ہنر نہ سیکھ سکا۔ چچا کی وفات کے بعد مجھے کمانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک خانساماں سے چچا کی جان پہچان تھی۔ اس نے مجھے کچھ عرصہ کام سکھا کر ایک صاحب کے ہاں ملازم کروا دیا۔ اب مجھے تنخواہ بھی اچھی ملنے لگی۔ اور بددیانتی سے بھی کافی روپیہ پیدا کرنے لگا۔ تین چار سال تک تو مجھے ریشمہ سے بڑی محبت رہی۔ مگر جب ننھا قاسم پیدا ہوا۔ میری طبیعت خود بخود اس سے ہٹ گئی۔ حالانکہ پاکباز ریشمہ بدستور مجھ سے محبت کرتی رہی۔ بالآخر میری آوارگیاں رنگ لائیں۔ جو کچھ کماتا اس سے دُگنا عیاشیوں پر خرچ کر ڈالتا۔ اس لئے مقروض ہو گیا۔ ریشمہ اپنی نقدی اور زیور وغیرہ بھی میرے حوالے کر چکی تھی۔ اب میں چاہتا تھا۔ کہ چچا کی زمین پر بھی ہاتھ صاف کروں۔ مگر چچی کی زندگی میں یہ کام ناممکن تھا۔ وہ ابھی اتنی بوڑھی بھی نہ تھی۔ کہ اس کے مرنے کی امید ہوتی۔ میں اسی فکر میں رہنے لگا۔ کہ کسی طرح اس کو ٹھکانے لگاؤں۔ چنانچہ انہی دنوں وہ ملیریا میں مبتلا ہو گئی۔ ایک دن موقع پا کر میں نے اس کی دوائی میں زہر ملا دیا۔ جس سے وہ بیچاری جاں بحق تسلیم ہوئی۔ اور میری سیاہ کاری پر پردہ پڑا رہا۔ اب میں آزاد تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ چچا کی زمین کا ملنا دھندہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے صاحب کا تبادلہ جہلم چھاونی میں ہو گیا۔

میں بھی ریشمہ کو لیکر جہلم چلا آیا۔ یہاں ہماری میم صاحبہ کے پاس ایک نئی آیا ملازم ہوئی جو اتنی خوبصورت تو نہ تھی۔ مگر بڑی عیاش اور نٹ کھٹ عورت تھی۔

میں اس پر ریجھ گیا اور میری اس کی آشنائی ہو گئی۔ میں اکثر آدھی آدھی رات تک آیا کے پاس ہی رہتا وہ بھی اکثر میرے گھر آتی جاتی تھی۔ میں ریشمہ کے سامنے ہی اس سے اظہار محبت کرتا۔ اور اب میں ریشمہ سے بالکل متنفر ہو چکا تھا۔ روز بروز اس سے سختی سے پیش آتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی مگر منہ سے اُف تک نہ کرتی تھی۔ اس کی امیدوں اور خوشیوں کا مرکز اب صرف ننھا قاسم تھا۔ اب وہ چار برس کا تھا۔ اور اپنی محبت بھری معصومانہ باتوں سے اس کا دل بہلاتا تھا۔

جاڑے کے دن تھے قاسم کا کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ وہ ٹھنڈے کپڑوں میں صحن کی مرطوب زمین پر کھیلتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ وہ بخار اور نمونیہ میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اس کا کچھ علاج نہ کیا۔ ریشمہ مہترانی کی منت کرتی۔ تو وہ اس کو ہسپتال سے دوائی لا کر دے جاتی۔ بچے کی بیماری کو چھ دن گزر چکے تھے۔

میں رات کو بارہ بجے اپنی محبوبہ دلنواز کی خاطر مداریوں سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ دروازہ پر دستک دی۔ تو ریشمہ نے خلاف معمول بڑی دیر کے بعد دروازہ کھولا۔ مجھے اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ اندر جا کر اس کو بہت مغلظات سنائیں۔ وہ بیچاری بےبس تھی۔ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر تو میں آگ بگولہ ہو گیا۔ لاتوں اور گھونسوں سے خوب زدوکوب کیا۔

اور اسی وقت گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

اس پر وہ بولی۔ دیکھ اتنا ظلم نہ کر۔ خدا سے ڈر۔ میرا بچہ دم توڑ رہا ہے۔ میں خود بھی بخار میں پھنکی جا رہی ہوں۔ مجھ پر رحم کر۔ آخر تمہاری بیاہتا بیوی ہوں۔ میرا بھی تم پر حق ہے۔ میں کیوں جاؤں۔

میں نے یہ الفاظ اس کی زبان سے کاہے کو سنے تھے۔ مجھے بڑا طیش آیا۔ کہ اب یہ اپنا حق جتاتی ہے۔ میں نے جستیں نکالکر اس کے پلے باندھ دیے۔ کہ لے اپنا حق جس پر تو اتنا اتراتی ہے۔ اور کوئی دم کا مہمان بچہ اس کی گود میں دیا۔ اور اسے دھکے دیکر باہر نکال دیا۔

دوسرے دن شہر جانے پر پتہ چلا۔ کہ صبح دریا کے کنارے ایک عورت معہ چار پانچسالہ بچے کے سردی سے اکڑی ہوئی بیہوش پائی گئی۔ جسے فوراً سول ہسپتال میں پہنچا یا گیا۔ بچہ مر چکا ہے۔ اور عورت قریب المرگ ہے۔

میں خوش تھا کہ ان دونوں سے پیچھا چھوٹا۔ اب ہر وقت آیا کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہنے لگا۔

آخر ایک دن میرا اور آیا کا تعلق طشت از بام ہوا۔ دونوں بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ برطرف کئے گئے۔ آیا اپنے وطن لکھنؤ چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ مگر اب وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتی تھی۔ کیونکہ اب میں بالکل قلاش تھا۔ میں نے اپنا نام بدل کر چھمن رکھ لیا۔ اور بیس سال تک لکھنؤ میں ذلیل سے ذلیل مشقت کر کے پیٹ پالتا رہا۔

آخر ایک پنجابی ڈاکٹر صاحب کے پاس جو وہاں تبدیل ہو کر گئے تھے۔ ملازم ہوا اور انہی کے ساتھ دوبارہ پنجاب میں آیا۔ جوں جوں وہ یہ واقعہ بیان کرتا جاتا تھا۔ اس کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ہذیان بکنے لگا۔

(۶)

بوڑھے خانساماں کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر سر پٹکتا تھا۔ اور مجھے بچاؤ بچاؤ کہکر جگر خراش چیخیں مارتا۔ کبھی کہتا ہائے چچی حفیظہ گرم سلاخوں سے میرا بدن داغ رہی ہے۔ کبھی کہتا رشیمہ مجھے آتشیں بھالا نہ مارو۔ ہائے مجھے دوزخ کے فرشتے "پابجولاں" کر کے لے چلے ہیں۔ مجھے چھڑاؤ۔

غرضیکہ اسی طرح چیختا چلاتا صبح کے وقت مر گیا۔ ادھر طوفان بھی ختم گیا تھا۔ صبح سویرے ہی اس کی تجہیز کا اہتمام کیا گیا۔ جب جنازہ تیار ہوا تو میں نے وہ بٹوہ جو جوگی نے دیا تھا کفن کے اندر رکھوا دیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

کسی سے

(”شہیدِ ادب“ حضرت مائل مدظلہٗ معتمد انجمن اردو بھوپال)

اے سراپا عیش اے فخرِ جوانانِ چمن
اے بہارِ حسن اے آنِ چمن شانِ چمن

اے کہ تیری ہر ادا رشکِ تماشائے بہار
ایک خاکہ تیری ہستی کا سراپائے بہار

بس گئی ہے ہر فضائے حسن میں تیری شمیم
عطر آگیں تیرے ہی دامن سے دامانِ نسیم

نکہتِ زلفِ معنبر سے فضائیں عطر بیز
جوششِ خوشبوئے گیسو سے ہوائیں مشک ریز

غنچوں میں تیری دلآویزی گلوں میں تیری خو
ہو گیا تقسیم کل عالم میں تیرا رنگ و بو

رات دن تجھ پر تصدق انجم و شمس و قمر
حشر تک تجھکو مبارک عشرتِ شام و سحر

کچھ خبر بھی ہے مگر اے زینتِ ایوانِ غیر
کیا گذرتی ہے کسی دل پر کہیں تیرے بغیر

ایک تو جس پر فضائیں حسن کی چھائی ہوئی
ایک میں جس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی

ایک وہ جو تیری بزمِ ناز میں محوِ سرور
ایک میں جو وقفِ کلفت صرفِ حسرت تجھ سے دور

ہائے وہ دل جو تری بزمِ طرب میں شاد شاد
ہائے یہ دل جسکو ہر دم چھیڑتی ہے تیری یاد

ٹوٹ کر جب گلشنِ عالم پہ آتی ہے بہار
یاد کرتا ہے تڑپ کر تجھ کو میرا قلبِ زار

مسکراتی ہے جب آغوشِ مسرت میں کلی
کس قدر ہوتی ہے قلبِ مضطرب کو بیکلی

جب تصور میں کبھی گلزار کی کرتا ہوں سیر
یاد آتی ہے تری ہر اک ادا یادش بخیر

کیا کہوں میں تجھ سے اپنے دردِ دل کا ماجرا
دل ہی دل میں حالِ دل کہدیگا تجھسے دل ترا

آئینے ہیں لالۂ گلزارِ دل کے داغ کے
راز داں ہیں میرے غم کے غنچے تیرے باغ کے

ہر دعا۔ ہر التجا۔ ہر آرزو رد ہو چکی
دل کو اب تسکیں عطا کر درد کی حد ہو چکی

خواب و خیال

(از جناب احمد نواز خاں سلیم ــ سعدی مدظلہ العالی)

رات کے سناٹے میں جبکہ تاریکی زمین و آسمان کی وسعتوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ ریل گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ چھک چھک کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھا تصورات کے عمق میں گم تھا۔ میری نظریں کھڑکی کے باہر لگی ہوئی بظاہر درختوں، جھاڑیوں، عمارتوں اور اونچے ٹیلوں کے رقص پیہم کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ باہر اس منظر کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید جنگل کے بہت سے جن اور دیو محفل رقص و سرود قائم کئے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت نہ اس عجیب قسم کے ناچ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اور نہ تاریکی کی وسعت اور منظر کی وحشت سے کچھ زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ بلکہ میرا دل کسی خواب دیرینہ کے پرتو سے مچل رہا تھا۔ گذشتہ زندگی کے گریز پا نظارے سینما فلم کی طرح سامنے آتے۔ اور پھر محو ہو جاتے۔ ان بزم آرائیوں کا خیال جو قلیل مدت میں گلدستۂ طاق نسیاں ہو جانے والی تھیں اور ان محفل طرازیوں، مدہوشیوں اور لطف کوشیوں کا تصور جو تھوڑی دیر بعد ایک قصۂ پارینہ میں تبدیل ہو جانے والی تھیں۔ مجھے از خود رفتہ کئے ہوئے تھا۔ جب رہ رہ کر یہ خیال آتا۔ کہ کالج کی زندگی جو ایک مسلسل قہقہۂ سیمیں تھی کس قدر جلد ختم ہو گئی۔ اور باقی عمر کشمکش حیات کے جھمیلوں میں گزارنی ہو گی۔ تو کلیجہ منہ کو آتا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے تمام اعضا سے جان نکلی جا رہی ہو۔ زیادہ سوچ کی تاب نہ رہی گھبرا کر سلسلۂ خیالات منقطع کر دیا۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کر اپنے ماحول پر جس سے ابھی تک بے خبر رہا تھا ایک نگاہ ڈالی۔ میرے ساتھی اسی طرح برج کھیلنے میں مشغول تھے۔ وہ ہنستے، لڑتے۔ شور مچاتے۔ اور کبھی کبھی خوشی سے اچھل پڑتے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کس قدر انہماک سے کھیل رہے ہیں۔ گویا احباب سے جدا ہونے اور کالج کو چھوڑنے کا انہیں ذرہ بھر بھی افسوس نہیں۔ اے کاش میں بھی ان کی طرح "ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا" اور "چلے" کے نظریہ پر عمل کر سکتا تو آج یہ سفر اس رنج و کرب اور وحشت و انتشار میں نہ گزرتا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تاسف بیسود سے کیا حاصل۔ لیکن کیا کرتا مجبور تھا۔ میری طبیعت اس طرح اپنے اختیار میں نہ تھی جس طرح ان کی یہ بے حسی اور جمود اپنے بس کی بات نہ تھی۔

ریل گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک خفیف جھٹکے کے ساتھ بالکل رک گئی۔ اسلم نے اوپر نظر اٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کونسا سٹیشن ہے۔ دہلی ہے۔ سعدی بولا علیگڑھ اور دہلی کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا۔ یہ کہکر دونوں پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔ میں نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اتنے میں بجلی کی سرعت [illegible] ریل آئی اور ساتھ ہی آکر رک گئی۔ یاس و وارفتگی و سوگواری کی حالت میں دفعتہ سامنے جو نگاہ پڑی تو کیا کہوں کہ

میں نے کیا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے خوابوں کی پری اور حسن وجمال کی ذہنی تصویر جسم وجان اختیار کرکے سامنے والے کمپارٹمنٹ کے کونے میں جا بیٹھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رعنائی وجمال کا ایک مافوق الفطرت مجسمہ تھی۔ جس کی ستارہ سحری کی سی حسین آنکھیں آہوئے رمیدہ کی طرح ایک جگہ نہ ٹھہر سکتی تھیں۔ وہ کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ ادھر سے برقی قمقمے نے خدا جانے اسے کیا سے کیا بنادیا تھا۔ اور یہ تمیز کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ برقی قمقمے سے اس کا چہرہ روشن ہو رہا ہے۔ یا اس کے حسن جہاں افروز کی تنویر سے برقی قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ آنکھوں کے سکر و مخموری کی یہ کیفیت تھی۔ جیسے شراب ناب کے دو چھلکتے ہوئے بلوریں جام۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی انھیں ہمہ تن نگاہ بن کر دیکھ رہا ہے۔ تو کچھ محجوب سی ہوگئیں۔ شرم آلود نگاہیں فوراً پلکوں کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن یہاں ان کی ہر جنبش مژہ کے ساتھ دل بھی تھر تھرا اٹھتا تھا۔ دوسری بار پھر آہستہ سے نظر اٹھا کر اس طرح دیکھا گویا دیکھنا بھی ان کے لئے بار ہے۔ یہ دزدیدہ نگاہ ایک تیر نیمکش "تھی۔ جو دل کے پار ہوتی ہوئی جگر میں اٹک کر رہ گئی۔ آنکھیں پھر نیچے کرلی گئیں۔ مگر جو روشنی آنکھوں سے شعاعوں کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی وہ نازک گلابی ہونٹوں کے کونے سے نمودار ہونے لگی۔ اب انھیں یہ شرم کہ کسی کی طرف کیوں دیکھیں۔ چاہے کوئی کتنا ہی بیتاب تماشا کیوں نہ ہو۔ اور یہاں محویت واستغراق کا یہ عالم کہ اپنی بھی خبر نہیں۔ ادھر انداز تغافل کی وہ شان کہ جیسے انھیں کچھ علم ہی نہیں۔ ادھر بے تابی تمنا کا یہ حال کہ "دل مے رود زدستم" کہکر چپ رہ جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ آخر کار وارفتگی شوق نے اپنی زبان بے زبانی سے کچھ اس طرح اظہار تمنا کیا کہ "شرم" کو بند نقاب حسن" کھولتے ہی بنی۔ اس سے مجھ پر مخموری وسرشاری کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھیں بند کرلیں۔ یا یوں کہو کہ موگئیں۔ یہاں تک کہ پچھلے تمام خیالات یکسر بھول گیا۔ کیونکہ اب میری روح فردوس تصور میں محو گلگشت تھی۔

اتنے میں کیا محسوس کرتا ہوں کہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بدستور برج کھیلنے میں مشغول تھے۔ ان کی نظر بچاکر نیچے اتر گیا۔ اس کے بعد کسی جذبہ بے اختیار نے مجھے ان کے آستانہ ناز پر اپنا سر نیاز جھکانے پر مجبور کردیا۔ وہ کونسی کشش تھی جو مجھے کشاں کشاں ان کی بارگاہ حسن تک لے گئی۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ ان تمام باتوں کا مجھے خود علم نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا اور مجھ میں یہ جرأت کہاں سے آئی۔ فقط اتنا یاد ہے کہ ان کے کمرے میں اردگرد کی تمام چیزوں میں ایک ارتعاش تھا۔ فضا میں ایک لرزش تھی۔ یہاں تک کہ برقی قمقمے کی شعاعیں بھی ان تک کانپتی اور تھرتھراتی ہوئی پہنچتی تھیں۔

پھر میں گاڑی سے کیسے اترا۔ دوستوں کو کس طرح چھوڑا۔ ان تک کیسے رسائی ہوئی۔ ان کا پتہ کس طرح معلوم ہوا۔ یہ سب باتیں ایک معمہ ہیں۔ اور شاید معمہ ہی رہیں گی۔ میری حالت اس وقت ایسی تھی۔ جس طرح بعض وقات انسان نیند کی حالت میں چلنے پھرنے اور کام کرنے لگتا ہے۔ درحالیکہ اسے خود کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اور

کیا کرتا ہے۔

قصہ کوتاہ ایک دن اور دو راتوں کے مسلسل سفر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے سہ منزلہ مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد ایک پست قد سیاہ فام آدمی نکلا۔ غالباً یہ ان کا نوکر تھا۔ میں نے پوچھا کیا سیٹھ طیب جی تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ نوکر نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ چپکے سے کارڈ لیکر اندر چلا گیا۔ اس کو گئے ہوئے دو منٹ بھی نہ گزرے تھے۔ کہ انھوں نے مجھے بلا لیا۔ سیٹھ صاحب شکل و صورت سے شریف اور خوش مزاج آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ مجھ سے اس طرح تپاک سے ملے جیسے مدتوں سے شناسائی ہو۔ کچھ دیر کے سکوت کے بعد آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا کہ میں سرحد کا رہنے والا ہوں۔ ملازمت کی تلاش میں بمبئی آیا۔ اور اتفاق سے آپ کی تعریف سنی۔ اس لئے اب حاضر ہوا ہوں۔ کہ شاید آپ کو میرے خدمات کی ضرورت ہو۔ پھر میں نے انھیں اپنی تعلیم کے متعلق بتایا۔ سیٹھ صاحب نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ میرے پاس کوئی جگہ تو ایسی نہیں ہے۔ لیکن .... کچھ سوچتے ہوئے کل میرا سیکرٹری کہہ رہا تھا۔ کہ آجکل کام زیادہ ہو گیا ہے وہ اکیلا نہیں کر سکتا۔ اچھا تو اس کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کے کام کریں۔ آپ کو ساٹھ روپے ماہوار اور رہنے کے لئے مکان ملیگا۔ اگر منظور ہو۔ تو کل سے چلے آئیں۔ یہ سنکر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے فوراً اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ دوسرے دن باقاعدہ وہاں کام کرنے لگا۔

ایک دن دفتر میں میں ایک ضروری خط کا مسودہ پڑھ رہا تھا۔ اور سیکرٹری اسے ٹائپ کرتا جاتا تھا۔ ابھی خط کا مسودہ نصف سے کچھ زیادہ ٹائپ ہوا تھا کہ پردے کی سرسراہٹ کی آواز میرے کان میں پڑی۔ مڑکر دیکھا تو کوئی پردہ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ خوشی سے کاغذ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شمیم ایک ادا سے مسکرائی اور پردہ کی اوٹ میں چھپ گئی۔

اب تو یہ تھا کہ میرے صبح و شام۔ دن اور رات۔ بلکہ میرے تصورات کی ساری دنیا اسی کے دم سے آباد تھی۔ شمیم جب میرے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ تو اس کی یاد میرے ساتھ رہتی تھی۔ اس طرح باوجود اکیلا رہنے کے میں کبھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے۔ شمیم کا التفات بڑھتا گیا۔ اس کی عنایتیں روز بروز زیادہ ہوتی گئیں۔ ہمارا آپس میں ملنا نہ صرف نوکروں اور اس کے رشتہ داروں پر شاق گذرتا تھا۔ بلکہ اس کا باپ بھی بعض دفعہ اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ ہم اکثر سیر کو اکٹھے نکلتے تھے۔ کبھی وکٹوریہ گارڈنز میں ایک بنچ پر بیٹھے کسی دلچسپ اور لطیف موضوع پر ہلکی سی بحث کر رہے ہوتے تھے۔ یا کبھی ساحل سمندر پر جاکر دیر تک چاندنی رات میں سمندر کی اٹھتی ہوئی موجوں کا منظر دیکھکر خوش ہوتے۔

... متعلق ... اعتبار کے جو میرا کالج کا ایک پرانا رفیق تھا۔ کسی کو اپنے حال سے

نگاہ نہ کیا تھا۔ ایک دن کراچی سے اس کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔

عقلمند آدمی!

"میں نہیں کہتا تھا کہ تمہاری رومان پسندی ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائیگی۔ واقعی حد سے زیادہ شہرت بھی وبالِ جان بن جاتی ہے۔ اب دیکھو اور غور کرو۔ ایک شریف و معزز خاندان کا فردِ علمی۔ ادبی ذوق رکھنے والا گریجوئیٹ (مبارک ہو۔ نتیجہ نکل چکا ہے۔ تم فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو) ساٹھ روپے پر معمولی کلرک اور وہ بھی ایک دور افتادہ جگہ میں ایک گمنام شخص کے پاس۔ کالج کے زمانہ میں تم سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر افسوس کہ تم نے اپنے اس عمل سے ان سب پر پانی پھیر دیا۔"

خط پڑھکر خوشی بھی ہوئی۔ اور غصہ بھی آیا۔ خوشی اس لئے کہ میرے نتیجہ کے متعلق خبر تھی۔ اور غصہ اس بات پر کہ سیٹھ صاحب کو گمنام شخص کیوں لکھ دیا۔ اس "مسرت آمیز غصہ" کی حالت میں خالی لفافہ تو بکس میں پھینک دیا۔ اور کاغذ کا ٹکڑا غلطی سے اس کتاب میں رہ گیا جو سیٹھ صاحب نے اپنی لائبریری سے نکال کر مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی۔ کتاب چند دنوں کے بعد واپس کر دی۔ اتفاق سے ان کی نظر کاغذ کے ٹکڑے کی طرف جا پڑی۔ پڑھا تو حیران و مبہوت ہو کر رہ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ دو ماہ کی قلیل مدت میں وہ میری خاموشی۔ اطاعت گذاری۔ اور دیانتداری سے کافی متاثر ہو چکے تھے۔ اور یہ غلط نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ انہیں ایک قسم کا انس ہو چلا تھا۔ اور وہ مجھے اب خاندان کا ایک فرد تصور کرنے لگے تھے۔

ایک دن وہ مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ڈرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کیونکہ اب میں مجھے اپنی غلطی کا علم ہو گیا تھا۔ دل میں ڈرتا تھا کہ کہیں انھوں نے وہ خط دیکھ نہ لیا ہو۔ اندر گیا تو شمیم بھی ان کے پاس کھڑی تھی۔ مجھے دیکھکر مسکرائی۔ آج اس کی آنکھوں میں وہ چمک تھی۔ جو اس سے پیشتر میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ سیٹھ صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مجھے تو تم سے یہ توقع نہ تھی۔ تم نے مجھے اب تک دھوکہ میں رکھا۔ بتاؤ تمہاری کیا سزا ہونی چاہیئے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کی عقابی نگاہ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئی ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک مجرم کی طرح سر جھکا کر فیصلہ کی انتظار کرنے لگا۔ "اچھا" ان کے لہجے میں وہ نرمی اور لطافت تھی۔ جو اب تک ان کی کاروباری گفتگو میں مفقود تھی۔ تو تمہاری سزا یہ ہے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کہ تم کو سمندر پار چار سال تک یہاں سے دور (شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے) رہنا ہوگا۔ اور پھر واپس آکر ....

"اٹھو اٹھو" یہ کہتے ہوئے کسی نے میرے شانے کو ہلایا۔ آنکھ کھولی تو صادق سر پہ کھڑا تھا۔

"اٹھو بھائی" پھر میرے شانے کو ذرا زور سے ہلاتے ہوئے لاہور آگیا ہے۔ گاڑی بدلنی ہے۔ جلدی کرو۔ تم تو ساری رات بقول شخصے گھوڑے بیچ کر سوئے رہے۔ میں حیران ہو کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ تو دیکھا نہ وہ شمیم

ہے۔ نہ وہ سیٹھ طیّب جی نہ وہ جگہ ہے۔ نہ وہ سماں ہے۔ بلکہ وہی ریل گاڑی کا کمرہ وہی میں اور وہی میرے ساتھی جن سے چھپ کر اپنے خیال میں کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ رات کے دلخوشکن خواب کی سرشاریوں کے بعد جب اس تلخ حقیقت کا سامنا ہوا۔ تو میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے کسی نے مجھے ہزاروں فٹ کی بلندی سے اُٹھا کر کسی عمیق غار میں پھینک دیا ہو۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آخر کھُلا کہ یہ تمام واقعہ غالب کے اس شعر کی تفسیر سے زیادہ نہ تھا ؂

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا!

اس واقعہ کو قریباً دو سال ہو چکے ہونگے۔ اور خواب کی بات کو مدت ہوئی فراموش کر چکا ہوں لیکن اس حقیقت دلنشیں کی یاد اب بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ جب اس شیریں نام کی یاد میری زندگی کے اداس اور پژمردہ لمحوں میں مسرت وشادمانی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ تو مست و بیخود ہو کر یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؂

اگر بہ دل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد



خان بہادر سردار مغل باز خانصاحب بالقابہ
سابق پولٹیکل ایجنٹ خیبر صوبہ سرحد -

سواری پولیٹیکل ایجنٹ

خان بہادر سردار مغلباز خان کا افسانۂ زندگی!

جب کسی شخص کے گلشن حیات کی خزاں و بہار دیکھنی ہو اور یہ جانچنا منظور ہو کہ بازار کائنات میں اس کے کارنامے کیا قدر و منزلت رکھتے ہیں. تو اس کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ پھر یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ وہ کس پائے کا انسان ہے۔

بادشاہ ہفت اقلیم ہو جانے میں کوئی بڑی بات نہیں۔ البتہ گمنامی کے گڑھے سے نکلکر اپنی جد و جہد سے آسمان شہرت کا آفتاب بنجانا ضرور فخر و مباہات کے قابل ہے۔ اس قسم کی اولوالعزم بلند پایہ ہستیوں میں ہمارے صوبہ کے ہر دلعزیز بیدار مغز انسان جناب خان بہادر سردار مغل باز خان صاحب ناقہ سابق پولیٹیکل ایجنٹ کی ذات گرامی کا نمایاں درجہ ہے۔ جو رسالہ گائیڈ میں ایک سوار سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو کر اپنی خداداد قابلیت سے صوبہ سرحد میں پولیٹیکل ایجنٹ خیبر ایسے اہم عہدہ جلیلہ کی کرسی پر متمکن ہوئے۔ ع آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو۔ چنانچہ ہزایکسلنسی گورنر صاحب بہادر صوبہ سرحد نے ازراہ قدردانی و عزت افزائی ایک غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ سردار صاحب کے حالات زندگی پر روشنی ڈالکران کی عدیم النظیر خدمات کی تعریف فرمائی جس کا ترجمہ اخبار سول سے درج ذیل ہے۔ تاکہ اردو خواں اصحاب اپنے اس قابل قدر سرحدی بھائی کے افسانہ زندگی سے محروم نہ رہجائیں:۔

مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۳۴ء کو خان بہادر مغل باز خان صاحب او۔ بی۔ ای + آئی۔ او۔ ایم + آئی۔ ڈی۔ ایس۔ ایم۔ آفیسر محکمہ پولیٹیکل اپنے فرائض متعلق خیبر ایجنسی کا چارج دیکر رخصت پر تشریف لیگئے۔ ہزایکسلنسی گورنر صاحب صوبہ سرحد نے اس موقع پر ایک اعلان فرانٹیر گزٹ میں سردار صاحب کے ۳۸ سالہ عدیم النظیر خدمات کا ذکر فرما کر اسمیں لکھا ہے کہ خان بہادر صاحب رسالہ گائیڈ میں بحیثیت ایک سوار سپاہی بھرتی ہوئے۔ اور محکمہ پولیٹیکل میں منتخب ہونے کے بعد صوبہ سرحد میں ایک نہایت اہم معزز عہدہ پر مقرر کئے گئے۔

سردار مغلباز خان اپنے والد طرہ باز خان آئی۔ او۔ ایم۔ کی وفات پر سال ۱۸۹۶ء میں رسالہ گائیڈ میں بھرتی ہوئے۔ فوج میں چھ سال ملازمت کرنے کے بعد آپ کو جغرافیکل اینڈ انٹیلیجنس کے کام پر مامور کیا گیا۔ جہاں آپنے بہت اچھا کام کیا جس کے صلہ میں آپ کو آئی۔ ڈی۔ ایس۔ ایم کا خطاب دیا گیا۔ سال ۱۹۰۸ء کے مہم زخاخیل کی نمایاں خدمات کے بعد ۱۹۱۱ء میں آپ بطور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منتخب کیے گئے۔ جبکہ آپ اس عہدہ پر مامور تھے۔ تو آپ کو ایک مشہور و معروف مفرور کے تعقب و گرفتاری کے صلہ میں آئی۔ او۔ ایم کا خطاب ملا۔ دوران

سال ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۸ء آپ آنریبل چیف کمشنر صاحب کے پاس بطور انڈین پرسنل اسسٹنٹ کے رہے۔ ان کے وسیع تجربے و کارگزاری نے آنریبل چیف کمشنر کو بڑی مدد دی۔

مس ایلس کی رہائی

ان دنوں آپ مس ایلس کو ان ڈاکوؤں کے ہاتھ سے جنہوں نے اس کی والدہ کو قتل کر دیا تھا۔ اور اپنے پہاڑوں پر اٹھا کر لے گئے تھے چھڑا لائے۔ یہ خان بہادر صاحب کا ایسا کارنمایاں تھا جس کے صلہ میں آپ کو قیصر ہند گولڈ میڈل اور سینٹ جان ہسپتال فلسطین کا جان بچانے (Life Saving Medal) کا تمغہ ملا۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ آف انڈیا ہر دو جانب سے سردار صاحب کی خدمات کا شکریہ ادا کیا گیا۔

دوران سال ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء خان بہادر صاحب خیبر ایجنسی میں اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کے عہدہ پر مقرر رہے۔ یہ سال ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے جبکہ سنی شیعہ کے تعلقات آپس میں خراب تھے۔ اور افریدیوں کے خلاف تعزیری کارروائی عمل میں آئی۔ ان جملہ امورات میں جو حصہ خان بہادر صاحب نے لیا کسی حالت میں بھی کم نہیں ہو سکتا۔

آپ نے افریدیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو از سر نو استوار کیا۔ نیز شیعہ سنی میں خاطر خواہ فیصلہ کر کے فساد کی جڑ کاٹ ڈالی۔ چنانچہ آپ کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند نے سال ۱۹۳۳ء میں سردار صاحب کو محکمہ پولیٹکل میں منتخب کیا۔ اور آپ پولیٹکل ایجنٹ خیبر مقرر کئے گئے۔

ان خدمات جلیلہ کے علاوہ جس کا ذکر گورنر بہادر نے فرمایا ہے سردار صاحب کا یہ کارنامہ بھی قابل داد ہے کہ آپ نے لیوانی فقیر کو گرفتار کر کے حکومت افغانستان کے حوالے کیا تھا۔ یہ وہی فتنہ پرداز فقیر ہے جس نے افغانستان و سرحد کے امن کو برباد کیا۔ نیز باجوڑ مہمند پر اسی شخص کی گرفتاری کے لئے فوجی مہم بھیجی گئی۔ اور بمباری بھی کی گئی۔

سردار صاحب موصوف کی علمی استعداد بھی کافی سے زیادہ ہے۔ آپ اگرچہ پٹھان ہیں۔ لیکن اردو کے ساتھ آپ کو خاص انس ہے خصوصاً سفیر سخن کے ساتھ آپ کو جو دلبستگی ہے اس کے لئے ہم سردار صاحب موصوف کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کرتے ہیں۔ خداوند عالم اپنے محسن کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

"ادارہ"

دِل کی دُنیا

(از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد)

اس بھری دنیا میں شیام باوجود اپنی دولت اور لیاقت کے بالکل تنہا تھا۔ اس کے پتا بدلاپور کے بہت بڑے تعلقہ دار تھے۔ جب وہ سرگباش ہوئے تو اس وقت شیام کی عمر بیس سال کی تھی۔ اب تک اسکی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے نام سے دور بھاگتا تھا۔ اس کا خیال نہ صرف یہ تھا کہ وہ ایسی عورت سے شادی کریگا جو اس کے منجمد دل کو محبت کے شعلوں سے نرم کر دے۔ اور خود اس کی محبت کا آئینہ بنکر اس کی زندگی کو ایک حقیقی لطف سے بہرہ اندوز کرے۔ شادی کے پیام آتے تھے۔ لیکن وہ نامنظور کر دیئے جاتے تھے۔ شیام نے بی۔ اے میں فلسفہ لیکر پاس کیا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں فلسفہ ازدواج کے متعلق پڑھیں۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ محبت کی تلاش میں پریم کی کھوج میں ہندوستان کے قریباً ہر شہر میں گیا۔ اس نے خوبصورت عورتوں کے چہروں میں پریم کو تلاش کیا۔ لیکن کوئی حسن کی دیوی اس کے دل کی دنیا کو موہ نہ سکی۔ آہ۔ اس کو کیا معلوم تھا۔ کہ پریم ڈھونڈھا نہیں جاتا۔ محبت تلاش نہیں کی جاتی۔ محبت کا جذبہ بالکل فطری اضطراری بے اختیاری ہے۔

اس کا وقت زیادہ تر زمینداری کے کام میں گزرتا۔ اپنی غریب اسامیوں کی آسائش کا وہ خاص طور سے خیال رکھتا۔ بدلاپور میں اپنے خرچ سے غریبوں کے لیئے دواخانہ کھول دیا۔ جہاں غریبوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ روزانہ شام کو وہ اپنے دروازہ پر گاؤں والوں کو جمع کرتا اور انھیں ملکی، مذہبی باتیں سناکر ان کے معلومات میں اضافہ کرتا۔ اب اس کو اپنی شادی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ دنیا میں آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں عورتوں کی جانب سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے بہت سی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا۔ اس سے سبق حاصل کیا۔ اور دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ جب تک خود بخود اس کو کسی عورت سے محبت نہ ہوگی وہ ہرگز شادی نہ کریگا۔

(۲)

"میری دلی خواہش ہے کہ آپ اپنی شادی کر لیں"

"منیم جی! اس کے متعلق میں اپنی رائے دیچکا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ میں آپ کو پتا جی کی جگہ پر سمجھتا ہوں۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن شادی کے معاملے میں مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ہم خیال نہیں"

"میں حضور کا قدیمی نمکخوار ہوں میری رائے میں اب آپ کو اسوقت شادی سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ اتنا بڑا عالیشان مکان

عورت کے بغیر بے رونق ہے۔ عورت ہی سے مکان کی زینت ہوتی ہے۔ آپ جوان ہیں۔ اس عمر میں اگر آپ بیاہ نہ کرینگے تو لوگ طرح طرح کی کہانیاں کرینگے۔"

"واہ منیم جی! آپ کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں میں لوگوں کے ڈر سے اپنی آزادی بیچ نہیں سکتا۔"

آپ کی آزادی بیاہ ہونے کے بعد بھی قایم رہے گی۔

"وہ کس طرح؟"

مہابھارت میں لکھا ہے کہ عورت مرد کا آدھا جسم ہے۔ بھگوان منی کا قول ہے کہ جہاں عورت رہتی ہے وہاں سکھ کی دیوی باس لیتی ہے، جس گھر میں عورت نہیں رہتی وہ گھر تاریک مندر ہے۔ جس میں چراغ کی روشنی نہیں۔ بیاہ ہونے کے بعد مرد کو گھر کے کام سے فرصت ملجاتی ہے۔ گرہستی کا کام عورت کرتی ہے۔ اور اس لحاظ سے تو مرد کو اور بھی فرصت ملتی ہے اور اس کی آزادی بڑھ جاتی ہے۔

شیام سندر نے مسکرا کر اپنے بوڑھے منیم کی طرف دیکھا اور کہا۔

واہ منیم جی! میں تو سمجھا تھا کہ آپ کھاتہ ہی کے کیڑے ہیں۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ زبردست عالم بھی ہیں۔"

منیم جی نے اپنے نوجوان مالک کو دیکھا ان کی آنکھوں میں احسانمندی کی جھلک تھی۔

بھیا کا خیال درست ہے۔ میں تو بہی کھاتہ کا کیڑا ہوں۔ مجھے علمی بحث سے کیا نسبت۔ میں نے تو جو کچھ بھی عرض کیا ہے وہ محض بغرض خیر خواہی ہے۔ کہار۔ مہاراجن اور نوکر چاکر سے گھر کا کام اچھی طرح سے نہیں چل سکتا۔ آپ باہر کے بیٹھنے والے ہیں۔ گرہستی کا کام تو عورت ہی کر سکتی ہے۔ میں نے دنیا کا سب سکھ پایا۔ اس ڈیوڑھی سے مجھے سب طرح کا آرام ملا۔ اب میں پکا پھل ہوں نہیں معلوم کس وقت موت آجائے۔ مرنے سے پہلے میری دلی خواہش ہے کہ آپ کے سر پر سہرا دیکھ لوں۔ اس کے بعد میں موت کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہوں۔

منیم جی کی عمر اس وقت قریب ستر برس کی ہوگی۔ شیام سندر کے پتا جی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان پر انھیں اتنا اعتبار تھا کہ تمام تعلقہ کا حساب کتاب ان کے سپرد کر رکھا تھا۔ ان کے مشورہ کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

منیم جی کی باتیں سنکر شیام سندر کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔

منیم جی میں آپ کی باتیں سنکر بہت خوش ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ میرا دل شادی کرنے کے لئے فی الحال بالکل تیار نہیں ہے۔

آخر اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہے یا یونہی۔

شادی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

"بھیا میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ شادی کرنا برا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شادی فریقین کی رضامندی سے نہیں ہوتی اُس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

اگر آپ شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو آپ ایسے سنسکرت ۔ خوبصورت ۔ بلوان اور رئیس ہر کے لئے سینکڑوں تعلقدار اپنی لڑکیاں دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ آپ صرف ہاں کر دیجئے۔ اور پھر دیکھئے آپ کا یہ بوڑھا خادم کیا کرتا ہے۔"

"منیم جی! میرا خوش ہونا بہت مشکل ہے۔ میں صرف ایسی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے دل کی دنیا کو بہشت یاد کرے۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ لیکن مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ میں نے خود بہت کوشش کی۔ لیکن آج تک مجھے کسی حسین سے حسین لڑکی سے پریم نہ ہو سکا۔"

منیم جی نے ہنسکر کہا۔ "واہ بھیا! اتنے بڑے ہو گئے لیکن آج تک آپ میں لڑکپن کی باتیں باقی ہیں۔ ایسی بات ہے جیسی آپ کی مرضی ہو کیجئے۔ میرا کام تو صرف سمجھانا تھا۔ اور بس۔" یہ کہکر منیم جی شیام سندر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

(۴)

بدلاپور کے آخری سرے پر تالاب کے کنارے پنڈت سیتا رام کا جھونپڑا تھا جس کے سامنے گلاب۔ چنبیلی۔ بیلا۔ سورج مکھی۔ لسبق کا نتا اور گیندہ وغیرہ کی ایک چھوٹی سی پھلواری تھی۔ گاؤں والے پنڈت جی کو بھگت جی کہتے تھے۔ اُن کی بیوی سرگباش ہو چکی تھی جس کی یادگار میں ایک لڑکی پیاری تھی۔ اکلوتی لڑکی ہونے کی وجہ سے "پیاری" ہی بھگت جی کی محبت اور شفقت کی تنہا مالک تھی۔ اب وہ پندرھویں سال میں تھی۔ نہایت سلیقہ مند۔ نیک طبیعت اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کی شرمگیں آنکھیں انسانی جذبات میں ہلچل ڈال دیتی تھیں۔ اس کا سینہ بھری جوانی کا آئینہ تھا۔ جس میں عصمت و دوشیزگی کے جلوے تڑپ رہے تھے۔ مگر آہ! اس حسن و دلکشی کا کوئی خریدار نہ تھا۔ صرف اس لئے کہ غریب باپ کے پاس دولت کے پرستاروں کو دینے کے لئے کافی دولت نہ تھی۔ کوئی دو ہزار طلب کرتا۔ کوئی چار ہزار۔ بھگت جی کی جھونپڑی میں تو اتنے کھپریل بھی نہ تھے۔ دو چار بیگھ موروثی کاشتکاری تھی۔ اس میں ان کی اور پیاری کی زندگی بسر ہو جاتی تھی۔ لیکن ان کے پاس اتنے فاضل روپے نہ تھے۔ کہ وہ دولت کے پجاریوں کے حسب منشا لینا دینا دیتے۔

"بھگت جی نے پیاری کو ہندی اور اردو کی کافی تعلیم دی تھی۔ جب علی الصبح پیاری خوش الحانی سے رامائن پڑھتی تو در و دیوار وجد میں آجاتے۔ بھگت جی کا معمول تھا۔ کہ وہ روزانہ صبح اور شام پوجا کا سامان لیکر گنگا کے کنارے پر کھٹ پٹ کرتے گاؤں کے مندر میں جو ان کے گھر سے تھوڑی دور پر تھا پوجا پاٹ کرنے چلے جاتے۔ اور گھر پر پیاری تنہا رہ جاتی۔ ایک دن سہ پہر کے وقت جب بھگت جی ٹھاکر دوارے میں تھے۔ پیاری اپنی پھلواری کو سینچ رہی تھی۔ اتفاق سے شیام سندر ٹہلتے ہوئے اس طرف آنکلے۔ دن ڈوب رہا تھا۔ سورج بھگوان اپنا رتھ بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ ان کی سنہری کرنیں پیاری کے مکھڑے پر اس انداز سے ناچیں کہ شیام سندر کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔

پیاری کا حسن دلکش۔ اس کی کنول سی آنکھیں جن میں عصمت کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ دیکھکر شیام سندر کو ایسا محسوس ہوا گویا ان کی دل کی دنیا میں کوئی دیوی براجمان ہو گئی۔ ان بیخودی سے اس نے آجتک کسی عورت کو نہ دیکھا تھا۔ اپنی اس بدتہذیبی پر وہ دل میں بہت نادم ہوئے۔ لیکن کوشش کرنے پر بھی وہ پیاری کی جانب سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکے۔ ٹھیک اسی وقت پیاری نے مینا کی طرح اپنی گردن موڑی۔ اور شیام سندر کو اپنی طرف گھورتے دیکھکر وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ وہ پھلواری میں کھڑی نہ رہ سکی۔ سہاگ کراتی جھونپڑی میں جا چھپی۔ اس عرصہ میں شیام سندر کا کام تمام ہو چکا تھا۔ پیاری کے حسن عالم افروز نے اس کے دل کی دنیا میں اجالا کر دیا تھا۔ شیام سندر کو اس بات کا غرور تھا۔ کوئی عورت اس کے دل پر قابو نہ لا سکی تھی۔ ان کا یہ غرور خاک میں مل گیا۔ آج وہ ہار گئے ہار نہ سکے۔

(۴)

"آہ! کیا میرے دل میں کوئی پاپ پیدا ہو گیا۔ کیا میری نیت میں کوئی فرق آ گیا۔ آخر مجھے ایک معصوم آب لڑکی سے محبت کرنے کا کیا حق ہے۔ میں نے تمام دنیا چھان ماری۔ مگر مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ہی گاؤں میں ایسا خوبصورت پھول کھلا ہے۔ جو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پنڈت سیتارام کو اگر پتہ چل گیا کہ میں ان کی لڑکی سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا گاؤں والے کیا کہیں گے۔ مگر ادنہہ! محبت کوئی گناہ نہیں۔ اگر پریم کرنا بھی پاپ ہے تو دنیا میں کوئی پُن نہیں ہو سکتا۔ شیام سندر کے دل میں اس قسم کے خیالات آتے لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کا بہت جی چاہتا کہ وہ پیاری کو دیکھے لیکن وہ دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اپنے گھر سے پنڈت سیتارام کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن وہ وہاں تک نہ جا سکے۔ راستہ ہی سے لوٹ آئے۔ انہوں نے اپنے دل سے پیاری کو بھلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اٹھتے بیٹھتے۔ سوتے۔ جاگتے ان کو بھولی بھالی پیاری کا چہرہ یاد آ جاتا۔

برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ درختوں پر کوئلیں کوکنے لگی تھیں۔ شام سے کچھ پہلے پانی برس چکا تھا۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں۔ شیام سندر گاؤں کے اندر کا راستہ چھوڑ کر کھیتوں کی جانب ایک بیخودی کے عالم میں سر جھکائے ہلتے چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے ان کو پنڈت سیتارام آتے دکھائی دئے۔ شیام سندر نے ادب کے ساتھ جھک کر پرنام کیا۔ بھگت جی نے اشیرباد دیکر کہا "بھیا کدھر چلے"۔

کہیں نہیں "ذرا کھیت دیکھنے ادھر نکل آیا"

یہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ بھگت جی نے کہا "میری جھونپڑی یہاں سے قریب ہے تکلیف نہ ہو تو وہیں چلے چلئے۔ نہیں تو بھیگ جائیں گے۔

شیام سندر انکار نہ کر سکے۔ پنڈت جی کا گھر قریب ہی تھا۔ دونوں قدم بڑھاتے ہوئے وہاں بہت جلد پہنچ گئے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ گاؤں میں چراغ جل چکے تھے۔ پیاری اپنے دروازہ پر کھڑی ہوئی پنڈت جی کا انتظار کر رہی تھی۔ پنڈت

جی کے ساتھ شیام سندر کو دیکھکر اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پنڈت جی نے کہا آسن بچھا دے۔

پنڈت جی کا مکان بہت چھوٹا تھا۔ رسوئی گھر کے علاوہ صرف دو کمرے اور تھے۔ آسن پر بیٹھکر پنڈت جی کھیتی باڑی کا ذکر کرنے لگے لیکن شیام سندر کو اس گفتگو سے کوئی لطف نہ آیا۔ وہ تو کسی اور ہی خیال میں محو تھے۔ انھوں نے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ پنڈت جی نے پیاری سے جو ایک طرف دبکی ہوئی بیٹھی تھی "اپنی گائے کا دودھ تو گرم کرکے اپنے مالک کو پلاؤ۔

شیام سندر چونکے۔ انھوں نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں" اس کی کیا ضرورت ہے۔

پنڈت جی بولے "غریب برہمن کے یہاں کے دودھ کو آپ امرت سمجھئے"

شیام سندر چپ ہو گئے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے اوپر جھلا رہے تھے کہ آخر اسوقت میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ میں کوئی بات سوچ سمجھکر کیوں نہیں کرتا۔

پیاری نرم نازک شانوں پر بالوں کی لٹیں جھکائے ہوئے گلاس میں دودھ لیکر شیام سندر کو دینے کے لئے آگے بڑھی۔ اس وقت اس کے شرمیلے رخساروں پر چراغ کی روشنی ایک عجیب انداز سے پڑی۔ اس کے پاؤں ڈگمگائے۔ گویا شعلۂ حسن ہوا میں کانپ اٹھا جیں اس وقت شیام سندر سے اس کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ پیاری کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر آرہا۔ شیام سندر اگر چاہتے تو بہت آسانی سے چھینٹوں سے بچ سکتے تھے۔ لیکن وہ قصداً اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دودھ کی چھینٹیں ان کے کپڑوں پر پڑیں۔ اس شگون بد کو دیکھتے ہوئے پنڈت جی رام رام کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے پیاری کی طرف غضب آلود نظروں سے دیکھا مگر شیام سندر نے ادھر ادھر کی باتیں کرکے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد سے شیام سندر روزانہ پنڈت جی کے یہاں آنے جانے لگا۔ دو چار ملاقاتوں ہی میں پیاری شیام سندر سے بے تکلف ہو گئی۔ پریم ساگر میں دھیرے دھیرے باڑھ آنے لگی جس میں اپنی کشتی دل ڈال دی۔ ایک دن سہ پہر کے وقت جب شیام سندر پنڈت جی کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پنڈت جی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ اور پیاری پھلواری میں بیٹھی ہوئی مالا گوندھ رہی ہے۔ وہ چپ چاپ پیاری کے سامنے بیٹھ گیا۔ پیاری نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اٹھی۔ اور پھولوں کی مالا کو شیام سندر کے گلے میں ڈالدیا۔

شیام سندر نے مسکراکر کہا "پیاری یہ تمنے کیا کر دیا؟"

"میں نے کیا کیا؟"

"آہا تم کو کچھ خبر نہیں۔ اچھا اگر تم کو معلوم نہیں تو میں بتاتا ہوں۔ اسے خوب اچھی طرح یاد رکھنا بھولنا نہیں۔ آج تم نے اپنے ہاتھوں سے میرے گلے میں "جے مالا" ڈالی ہے۔

پیاری نے شرما کر اپنا سر نیچا کر لیا۔ اس کے وہم و خیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی تھی۔ کہ مالا پہنانے کا شیام یہ مطلب نکالیگا۔ وہ چنتا ساگر میں غوطہ کھانے لگی۔

شیام نے کہا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب کچھ سوچنا بیکار ہے۔ یہ کہکر شیام اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب تک شیام نظر آتا رہا۔ پیاری اس کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے یا رنج کے اس کا کچھ پتہ نہیں۔

(۵)

پیاری بالکل بے پرواہ اور بے فکر لڑکی تھی۔ نہ اسے کسی قسم کی تکلیف تھی اور نہ کوئی رنج گناہوں سے پاک اور دنیا کے جھگڑوں سے آزاد تھی۔ مگر دفعتاً اس کے دل کا کنول کملا گیا۔ اس کی خوشی مفقود ہو گئی۔ پانی کے زور سے چلتی ہوئی ناؤ کیا ایک بھنور میں پھنس گئی۔ شیام سندر کی محبت زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی۔ آہستہ آہستہ پیاری کو بالکل بھول گیا۔ گویا کبھی کی جان پہچان بھی نہ تھی۔ پیاری برہ آگ میں جلنے لگی۔ اس کے چہرہ کی شگفتگی جاتی رہی۔ اب اس کو اپنی پھلواری سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی۔ آہ! اگر میں غریب نہ ہوتی تو وہ مجھے کیوں بھولتے۔ تو کیا وہ محبت سے زیادہ دولت کے بھوکے ہیں؟ نہیں نہیں۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ شاید وہ مجھ سے خفا ہوں لیکن میں نے آجتک کوئی ایسی بات ہی نہیں کی جس سے ان کو خفا ہونے کا موقع ملتا۔ پھر آخر وہ مجھ سے کیوں روٹھ گئے۔

اپنی کشتی حیات کو پریم ساگر کے بھنور میں پھنسی دیکھکر پیاری کو صرف لہروں پر ہی غصہ نہ آتا تھا بلکہ اس ملاح پر بھی جس نے اس کی کشتی حیات کو ایسے راستہ پر لگا دیا جہاں پانی کی تھاہ نہیں ملتی۔ پنڈت سیتارام اپنی لڑکی کی حالت دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتے ان سے کچھ پوشیدہ نہ تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے۔ پیاری کا علاج ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی عالم میں دو سال گزر گئے۔ نہ تو شیام نے پیاری کی خبر ہی لی اور نہ پیاری کی حالت سنبھلی۔

بہار کا موسم اور رات کا وقت تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پُرسکون رات کے سناٹے میں گاؤں کی لڑکیوں نے گانا شروع کیا ؎

کاہے مچاوے شور پپیہا کاہے مچاوے شور

باغ میں بولے کالی کوئلیا بن میں بولے مور۔ پپیہا کاہے مچاوے شور

اس دلفروز گیت نے پیاری کے دل میں ہلچل ڈالدی ؎

پا پی پپیہا بول نہ بولے۔ بنتی کروں میں تور۔ کاہے مچاوے شور

پیاری بستر علالت پر پڑی تھی۔ اٹھکر بیٹھ گئی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے سازِ دل سے صدا نکلنے لگی ؎

پیا پیا مت بول پپیہا۔ بنتی کروں میں تور۔ کاہے مچاوے شور

پیاری کو ایسا محسوس ہوا گویا تمام سنسار پریم رس میں ڈوبا ہوا فریاد کر رہا ہے ؎

پیا پیا مت بول پپیہا۔ بنتی کروں میں تور۔ پپیہا

پیاری کے ہر بُن مُو سے یہ صدا آنے لگی ؎

پیا پیا مت بول پپیہا - بنتی کروں میں تورے پپیہا

وہ پاگلوں کی طرح گھر سے گاتی ہوئی باہر نکلی۔ ایک بیوہ مہاراجن نے جو پیاری کے گھر سے قریب ہی رہتی تھی پیاری کو دوڑ کر پکڑ لیا۔ اور اس کو لیجا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ چارپائی پر لیٹتے ہی پیاری بیہوش ہوگئی۔ پنڈت سیتارام گھر پر موجود نہ تھے۔ گاؤں میں کسی کے یہاں ستیا نارائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ وہ وہیں گئے ہوئے تھے۔ شہر سے زیادہ گاؤں والوں میں ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ کسی نے خبر کر دی کہ پیاری بہت بیمار ہے۔ اس سبھا میں شیام سندر بھی موجود تھے۔ پیاری کی بیماری کا حال سنکر ان کے دل میں خوابیدہ محبت نے کروٹ لی۔ جس طرح گھٹا ٹوپ آندھی میں مشعل کی روشنی تاریکی کو دور کرتا ہے اسی طرح پیاری کی شمع محبت نے ان کے دل کے مندر کو جگمگا دیا۔ اب وہ سبھا میں نہ بیٹھ سکے۔ گھر کی طرف بڑھے۔ اسوقت نہ ان کو اپنی بدنامی کا خیال تھا۔ نہ جگ ہنسائی کا۔ راستہ میں ان کو پنڈت جی مل گئے۔ لیکن دونوں میں کوئی گفتگو نہ ہوئی شیام جب پنڈت جی کے گھر پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پیاری بے سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے پڑا تھا۔ اور دوسرا سینہ پر رکھا ہوا تھا۔ دونوں گال جو کبھی گل انار کی طرح سرخ تھے اب انگور کے پتوں کی طرح زرد تھے شیام مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے پیاری کی چارپائی کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ پنڈت سیتارام گاؤں کے ایک وید راج کو بلانے دوڑے۔ شیام کو ایسا محسوس ہوا گویا پیاری کائنات پر ہنس رہی ہے۔ وہ شرم و ندامت سے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہے اور پیاری کے قدموں پر گر کر لوٹنے لگے۔ پیاری کی آنکھیں کھل گئیں۔ شیام کو سامنے کھڑا دیکھکر اس کے جسم کا عضو عضو مسرت کا احساس کرکے پھڑک اٹھا۔ شیام کے اشک ندامت نے برہ کی آگ کو جو مدت سے پیاری کے کلیجہ میں جل رہی تھی بجھا دیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شیام کو پرنام کیا۔ اور اٹھکر اس کے چرنوں پر جھک گئی۔

پنڈت جی کا وید راج کو بلانا فضول ہی ہوا۔ کیونکہ وید راج کے آنے سے پیشتر ہی پیاری اپنے شیام کے درشن کو پاکر صحتیاب ہو چکی تھی۔ اس کے تھوڑے دنوں ہی بعد اچھی ساعت میں پیاری کے ساتھ شیام کا بیاہ ہوگیا۔ اب شیام کے دل کی دنیا آباد ہے جس میں خزاں کا گزر نہیں۔ پنڈت سیتارام بھی اب بڑی بے فکری کے ساتھ ٹھاکر جی کی سیوا میں لگے رہتے ہیں۔ اب انھیں دنیا سے کوئی مطلب نہیں۔

ایک شعر

مٹ جائے دلوں کی نفرت سب۔ کچھ دور نہیں تجھ سے یارب
اس دیس کے رہنے والوں کو۔ یک جان بنا یک دل کر دے

نغمات

(جناب خان نصیر حسین خان صاحب مدظلہ۔ لاہور)

عشق محبوب رہا مظہرِ یزداں ہوکر
حسن انداز بنا نازِ حسیناں ہوکر

بیٹھے ہیں گرد و غبارِ رہِ جاناں ہوکر
اُٹھ چلے دودِ چراغِ تہِ داماں ہوکر

اور کچھ بن نہ سکا میرے جنوں کا انداز
صبحِ محشر ہی بنا چاکِ گریباں ہوکر

تونے کر ڈالی مری راہِ عدم بھی دشوار
قتل کے بعد مرے خود پشیماں ہوکر

صدقے ہوتا ہے ترے روئے کتابی پہ مدام
طائرِ قبلہ نما دیدۂ حیراں ہوکر

کٹ گئے ہجر کے ایام مزے سے اپنے
کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی سوزاں ہوکر

چھین لی خاتمِ تقدیر فلک نے اے نصیرؔ
کس لئے خاک پہ بیٹھا ہے سلیماں ہوکر

افسانہ

مسافر کی موت

(از جناب عبدالحئی خان سرحدی ایڈیٹر مجلہ خیبر اسلامیہ کالج پشاور)

ریاست رام پور کے ایک گاؤں میں ایک حکیم رہتا تھا جو افلاس کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور تین بچے تھے۔ ہر روز یہ تلاش معاش میں اپنی گٹھلی کو کاندھے سے باندھے گاؤں میں اور قریب کے شہر میں جاتا۔ صبح سے شام تک سرگرداں رہتا۔ مگر اس کے نصیب ایک کوڑی بھی نہ تھی جو اسے ملتی۔ ناچار اپنے جھونپڑے کو لوٹتا۔ راستے میں بچوں کے بھوکا ہونے کا خیال اسے رلاتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی ماں انھیں میرے انتظار میں بہلاتی ہوگی۔۔۔ وہ میری راہ تکتے ہونگے ..... مگر اب تو شام ہے وہ سو چکے ہونگے .... نہیں بھوک کب نیند کو آنے دیتی ہے .... یقیناً اب تو وہ دروازے کو دیکھتے ہونگے .... ان کی ماں اپنی جھوٹے وعدے سے دیگچہ پکراتی ہوگی .... کیا وہ اس کی باتوں میں آجاتے ہونگے .... مگر ہر روز میرا بے نیل و مرام واپس آنا انھیں خوب یاد ہوگا۔ پھر اس کی باتوں پر انھیں کیسے یقین آتا ہوگا۔ شاید میرے پڑوسیوں نے کچھ بھیجا ہوگا .... کیا میری غیور اور وفا شعار عورت نے اسے قبول کیا ہوگا؟ .... آج تو ضرور انکار کیا ہوگا .... وہ نہیں چاہتی کہ دوسرے اسے روٹی دیں۔ وہ اپنی قسمت پر قانع ہے۔ ..... کیا وہ میری بیوی ہونے پر نالاں اور نا شکر گذار ہے .... زمین کی پیداوار گئی دنوں سے ختم ہو چکی ہے۔ .... اور دوسری فصل تک تین ماہ کا عرصہ ہے .... اگر کام کا یہی حال رہا تو موت یقینی ہے .... معلوم کس مصیبت میں ہوں .... والد کا ترکہ تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے .... روزگار کا یہ حال ہے کہ محض روٹی کمانا گراں ہے .... طبیبوں کی کثرت ہے .... میرے پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھکر لوگ میرے پاس کب آتے ہیں .... وہ بھاگتے ہیں .... ڈرتے ہیں۔ میں انھیں کیسے باور کراؤں کہ میرے پاس بڑے عجیب و غریب نسخے ہیں .... وہ کب میری باتوں کو سنتے ہیں .... طبابت کو چھوڑ دوں؟ اور مزدوری کروں .... مزدوری کرنے کے قابل نہیں .... لوگ توانا آدمی چاہتے ہیں۔ میں تو مزدور ہوں۔ دوسرا یہ کہ میں محنت شاقہ کا کیسے متحمل ہو سکتا ہوں .... اگر خدا نہ کرے مر گیا تو .... میرے بچے ننھے .... نہیں رہ سکتے .... رات ہو چکی ہے بچے سوتے ہونگے۔ انھوں نے کھانا کھایا ہوگا؟ .... کس طرح! .... وہ تو بھوکے ہونگے .... میری رفیقہ حیات میری انتظار میں ہوگی .... اندھیرے میں ہوگی .... کیا وہ میری بدحالی پر نالاں ہوگی .... میری بدقسمتی کی وجہ سے وہ بھی تکلیف میں ہے .... میرے شریک زندگی ہونے پر وہ کڑھتی ہوگی .... نہیں وہ وفادار ہے .... وہ میرا استقبال ہر روز خندہ پیشانی سے کرتی ہے .... ہر حال میں شاکر ہے .... اس

نے اپنی قسمت پر کبھی گلا نہیں کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا یہ ابتلائے ربّانی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ تو مجھے بھی شاکر ہونا چاہیئے ۔۔۔۔۔۔۔ کیا اس تنگی کے بعد فراخی بھی ہوگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک دن انہیں خیالوں میں وہ مستغرق گھر کو آرہا تھا۔ اور ایک گاؤں میں سے جو راستے میں تھا گزر رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی دفعہ اس گاؤں سے گزرا تھا۔ مگر کسی نے اس کی پرواہ نہ کی تھی۔ ۔۔۔۔۔۔۔ وہ جا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں رونے کی آواز آئی۔ اور یہ اس طرف بڑھا۔ اور اس مکان پر جا ٹھہرا جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔ ۔۔ ۔۔۔۔۔ کوئی مرگیا ہوگا۔ یا قریب المرگ ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو امیر صاحب کا مکان ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ معلوم کیا ہوا ہوگا؟"

ابھی اسے کھڑے ہوئے تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ اندر سے ایک پریشان حال لڑکا نکلا جس کی عمر ۱۶ برس کی ہوگی۔

"یہاں کیوں روتے ہیں؟" حکیم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میرے ابا بیہوش ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ بات نہیں کرتے ہیں حکیم جیلانی صاحب کو بلانے جا رہا ہوں۔ یہ نام اس فلاس زدہ حکیم کا تھا۔

"میں تو یہاں کھڑا ہوں۔ چلو اندر پردہ کراؤ" حکیم نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب اندر بلائے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مسہری پر ایک بے حس و حرکت لاش پڑی ہے۔ جس کے سرہانے نیلے برقع میں ایک عورت کھڑی ہے۔ اور اس کے پاس یہی لڑکا جو حکیم کو بلانے جا رہا تھا کھڑا ہے۔

یہ عورت امیر کی بیوی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ تین چھوٹے بچے اور ماما ئیں بھی پاس تھیں۔

حکیم نے لاش کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "انہیں کیا تکلیف تھی؟"

"صبح سے سر درد اور زکام کی شکایت کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ شام کو چائے پی ۔۔ ۔۔۔۔ اچھے بھلے تھے ۔۔۔۔۔۔ تفریح کو گئے ۔۔۔۔۔۔۔ شام کو آئے اور بستر پر لیٹ گئے ۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے سمجھا کہ آرام کرتے ہیں۔ اس لئے چھیڑا نہیں ۔۔۔۔۔۔ خادمہ دودھ لیکر آئی ۔۔۔۔۔۔۔ بلایا ۔۔۔۔۔۔ بولے نہیں۔ ہم سب آئے پوچھا ۔۔۔۔۔۔ پھر بھی نہیں بولے" لڑکے نے رکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

حکیم نے گرم دودھ طلب کیا، جو فوراً حاضر کیا گیا۔ پھر اپنی گتھلی سے ایک شیشی نکالی۔ اور دودھ میں دوا ملائی۔ اور پھر امیر کے دانتوں کو جو بل چکے تھے کھولا اور دودھ کے چمچے دئے۔

"انہیں سکتہ ہوگیا تھا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ ابھی خدا نے چاہا تو اچھے ہو جائینگے ۔۔۔۔۔۔۔۔ شکر ہے کہ بروقت خبر ہوئی۔ ۔۔۔۔۔۔ اچھا پاؤں اور سر کی مالش سرسوں کے تیل سے کریں" حکیم نے آہستہ سے کہا۔

حکم کی تعمیل کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد امیر صاحب نے آنکھ کھولی۔ اور ایک کروٹ لی۔ اور پانی مانگا۔ مگر حکیم نے منع کیا۔ اور اس کی جگہ دودھ دیا۔ پانی کا مانگنا تھا کہ گھر والوں نے آرام کا سانس لیا۔ امیر نے ایک غیر معروف آواز کو جو حکیم کی تھی سنا۔ اور کہا ۔۔۔۔۔ یہ کون آئے ہیں؟"

حکیم: "آپ بیمار تھے اور مجھے بلایا گیا تھا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب تو کچھ فرق ہے" جواب ملا۔

حکیم (لڑکے کو مخاطب ہوکر) "اچھا میں اب جاتا ہوں" چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے: "انھیں آرام کرنے دیں۔ یہ چھ گولیاں ہیں ایک گھنٹے بعد اور دوسری تین گھنٹے بعد دودھ کے ساتھ دینا۔ اور باقی چار گولیاں کل دینی ہیں۔ میں کل شام کو پھر مزاج پرسی کو آؤں گا"

یہ کہکر اس نے اپنی گٹھلی سنبھالی۔ اور ابھی اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ امیر کی بیوی نے دس روپے کے تین نوٹ اس کی طرف پھینک کر کہا "یہ آپ کا شکرانہ ہے"

حکیم نے کچھ توقف کے بعد نوٹ لئے۔ اور رخصت ہوا۔ راستے میں اس نے ایک دوکاندار سے چند روٹیاں۔ کچھ کباب کی ٹکیاں اور کچھ مٹھائی خریدی۔ اور ساتھ ہی ساتھ جو خیالات اس کے دل میں اٹھتے تھے اس کا بیان مشکل ہے۔ اب یہ خراماں خراماں جارہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچا تو ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ آواز نہایت ولگداز تھی۔ دوڑا اور دروازے پر دستک دی۔ تینوں بچے جو انتظار میں تھے اٹھ بیٹھے۔ اور باپ کے ہاتھ میں روٹیاں دیکھکر فرط مسرت سے اس کی طرف بڑھے۔ یہ منظر نہایت ہی دل سوز تھا۔ والدہ اور والد کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ .... بچے روٹی پر پل پڑے تھے۔ اور ساتھ ہی حیران بھی تھے۔ کہ یہ کیوں رو رہے ہیں ..... مگر انھیں اس بات کا شعور نہ تھا۔

امیر حکیم کی دوائی سے اچھا ہوگیا۔ اور دوسرے دن کی شام کو جب حکیم مزاج پرسی کے بعد رخصت ہونے کو تھا۔ تو اس نے دس روپے اور دئے۔ اس سے اس دل برداشتہ حکیم کی ڈھارس بندھ گئی۔ اور آئندہ زندگی کے سدھرنے کے مبہم خواب دیکھنے لگا .... مگر پھر وہی حال تھا۔ شام و سحر پھرتے گزرتی۔ مگر پیسہ کا نام تک نہ دیکھنا۔ اور امیر کے عطیات بھی روز بروز کم ہورہے تھے۔ یہاں تک کہ صرف پچیس روپے باقی رہ گئے۔ سرمایہ میں کمی ہوتی ہوئی دیکھکر گھبراہٹ بڑھی۔ آخر دونوں میاں بیوی نے مشورہ کیا کہ باہر کسی اور ملک میں قسمت آزمائی کی جائے۔ ممکن ہے کہ خدائے برتر یہ مصیبت ٹالے۔ سوموار کی صبح حکیم نے جانے کی تیاری کی۔ خود پانچ روپے لئے اور باقی بیوی کے حوالے کئے۔

جدائی کا منظر نہایت ہی رقت انگیز تھا۔ بیوی اور خاوند کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات کا دریا موجزن تھا۔ دونوں کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ یہ جدائی ہمیشہ کے لئے نہ ہو .... بچوں کا یہ گمان تھا۔ کہ ان کا باپ اپنے معمول کے دورہ پر جارہا ہے۔ اس لئے وہ آپس میں کھیل رہے تھے .... کاش کہ انھیں اس بات کا علم ہوتا۔ کہ وہ پھر اپنے باپ کو کبھی نہ دیکھیں گے .... سب سے بڑے لڑکے نے باپ کی انگلی کو پکڑکر کہا۔

"ابا! کہاں جارہے ہو؟"

اس مختصر سوال کے جواب دینے سے باپ قاصر تھا۔ غم سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ مگر اس نے دل کو ضبط کرکے کہا۔

یہ کام پر جارہا ہوں"

یہ الفاظ کہتے تھے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے اپنے تمام بچوں کو بلایا۔ اور ان کے ماتھے پر آخری بوسہ دیا...... دل میں جذبات کا طلاطم برپا ہوا۔ جو بغیر الفاظ کے چہرے پر ظاہر تھے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ حقیر رقم جو وہ چھوڑ رہا ہے چند دنوں تک رہے گی۔ اور پھر وہی پہلی حالت ہوگی۔ اس کی بیوی بھی اس بات سے پوری واقف تھی...... مگر شاید خدا ہم پر رحم کرے۔ اور یہ افلاس دور کرے" یہ دونوں دلوں کا خیال تھا۔ لیکن یہ بات ان کے دلوں میں بار بار چٹکیاں لے رہی تھی کہ شاید یہ جدائی ہمیشہ کی جدائی نہ ہو۔ صانع ازل نے واقعات آئندہ سے اپنی مخلوق کو بے خبر رکھا ہے۔ اگر یہ آنے والے واقعہ سے باخبر ہوتے تو کبھی ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوتے۔ فاقہ برداشت کرتے۔ بھوکے مرتے مگر اکٹھے رہتے.... لیکن جو ہونا تھا وہی مقدر کا ہو چکا تھا جس سے یہ دونوں ناواقف تھے۔ آخر چند معنی خیز نگاہوں کے تبادلہ کے بعد حکیم نے اپنا بستر لیا اور سلام علیکم کے بعد جدا ہوا۔

"خط لکھتے رہا کریں" بیوی نے رکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا۔ دعا کرتے رہا کریں" خاوند نے مڑ کر کہا۔ اور پھر روانہ ہو گیا۔ بیوی دیر تک اس کی نظروں سے غائب ہوتے ہوئے سائے کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ دل میں کہتی تھی کہ وہ پھر آئیں گے۔ مگر اس کا جواب کچھ نہ تھا جب وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا تو اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ اور چہرے پر اسب شفقت، بیچارے ... بچے ماں کے غمگین چہرے کو معصومانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ آپ سے ... تھے۔

"کہاں جاؤں" یہی خیال حکیم کے دل میں تھا۔ جب وہ جدا ہو کر اسٹیشن کو جا رہا تھا۔ وہ تمام پنجاب کے شہر ... تھا۔ آخر کار نظر انتخاب لاہور پر پڑی

روانگی کے دوسرے دن وہ لاہور کی گلیوں میں اپنی اسی پرانی ٹوکری کو اٹھائے "بچہ بادام" ... میں تھا۔ کوئی بھی پرسان حال نہ تھا کوئی اس کی طرف بھولے سے دیکھتا بھی نہ تھا۔ دو دن پھرتا رہا۔ ... ہوا اور ... خاک چھان ماری۔ مگر کسی نے بھی نہ پوچھا کہ بھیا کون ہو کہاں سے آئے ہو۔ اس کی رہی سہی پونجی بھی قوت لایموت پر صرف ہو گئی ...... حیا اس بات سے مانع تھی کہ وہ دریوزہ گری کرے..... بھوک سے مرجانا منظور تھا۔ لیکن دست سوال دراز کرنا ناگوار تھا۔ دوسرے دن کی رات وہ بھوکا رہا۔ تیسرے دن وہ علی الصبح روزی کے لئے نکلا۔ اس تلاش کا نتیجہ اسے معلوم تھا مگر بیکار بیٹھنا اسے پسند نہ تھا۔ وہ جفاکش اور متوکل انسان تھا۔ اسے یقین تھا کہ خدا اسے بھوکا نہ مرنے دے گا۔ "شکر ہے کہ خدا نے میرے بچوں کے لئے کچھ دیا ہے" اس نے خیال کیا۔ سورج نکل چکا تھا۔ شہر والے بیدار ہو چکے تھے اور کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے۔ رات کا سکوت ان کے شور و غل میں مبدل ہو گیا تھا۔ مگر یہ مسافر حکیم اسی طرح کوچہ بکوچہ پھر رہا

لوگ اسے فقیر جان کر بے پروائی سے گزر جاتے۔ یہ ہر ایک کی طرف دیکھتا۔ مگر کوئی بھی نظر التفات نہ کرتا۔ پھرتے پھراتے کشمیری بازار میں پہنچا۔ کہ اس کی نگاہ ایک نوجوان پر پڑی۔ جس کا چہرہ زرد تھا۔ حکیم آگے بڑھا اور کہا۔

"آپ بیمار ہیں"

نوجوان نے خاموش ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے آپ کی بیماری تشخیص کر لی ہے۔ اور میرے پاس اس بیماری کی دوا بھی ہے"

"پہلے بھی میں نے بازاری حکیموں پر کافی روپیہ ضائع کیا ہے" نوجوان نے جواب دیا "مگر رتی بھر بھی فرق نہیں ہوا"

"آپ دوائی لے لیں اور افاقہ ہونے پر قیمت دیں" حکیم نے جواب میں کہا۔

"اچھا میری دکان (اشارہ کرتے ہوئے) اس کونے میں ہے۔ آپ ایک دن کی دوائی دیں۔

حکیم نے دوائی دی اور چلتا ہوا۔

دوسری رات پھر فاقے میں گذری۔ مگر زبان پر کوئی گلہ کا لفظ نہ تھا۔ چہرہ سے بشاشت عیاں تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو وہ اسی دکان پر گیا جہاں اس کا مریض تھا۔ اس نے حکیم کو آتا ہوا دیکھا تو پیشقدمی کو آگے بڑھا اور تپاک سے ملا۔ اور پاس کی کرسی پر بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ اور کہا۔

"آپ کی دوا نے اچھا اثر کیا ہے۔ رات کو خوب بھوک لگی۔ اور خوب جی بھر کر کھانا کھایا تھا اور نیند بھی اچھی آئی تھی۔ اچھا آپ ایک ماہ کی دوا دیں۔

حکیم نے فرمائش کی تعمیل کی۔ اور ایک ماہ کی دوا معہ ہدایات کے دی۔ نوجوان نے سات روپے ہاتھ میں دیئے اور پوچھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ آپ اجنبی نظر آتے ہیں"

حکیم نے اپنی تمام داستان غم سنائی۔ اور یہاں آنے کی غرض بتائی۔ یہ تمام کہانی سنکر نوجوان کا دل بھر آیا۔ اور اس نے کہا "یہ تین روپے اور لیں۔ میری توفیق یہی ہے۔ ورنہ میں آپ کی پوری مدد کرتا۔ آپ بہتر ہے ضلع ہزارہ جائیں۔ وہاں [illegible] میں کوئی حکیم نہیں۔ آپ کا کام وہاں اچھا ہوگا"

حکیم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت طلب کی اور اس شہر کو جانے کا ارادہ کیا جس کا ذکر نوجوان نے کیا تھا۔ رات کی گاڑی پر وہ روانہ ہو گیا۔ تیسرے دن دوپہر کو وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا۔ اور اپنے رفیق سفر کے ہاں ٹھہرا۔ جو اسی شہر کا باشندہ [illegible] اور جس کو اس نے گاڑی میں اپنی کہانی سنائی تھی۔ اور کام کرنا شروع کر دیا۔ تین ہفتے تک پچاس اور سے کی رقم جمع ہو گئی۔ [illegible] نے گھر اپنی بیوی کے نام بموجب رسید نامہ کے بھیجی۔

یہاں حالات مفید پا کر اس نے مستقل رہنے کا ارادہ کیا۔ اس شہر کے چالیس میل کے فاصلہ پر وادی کاغان ہے۔ جہاں جڑی بوٹی بکثرت پائی جاتی ہے۔ یہاں اس نے ایک درخت کی اطلاع پائی۔ جو اس وادی میں پایا جاتا ہے۔ اور جس کی

اسے مدت سے تلاش تھی۔ اور جس کی پہچان اس کو ایک سنیاسی نے بتائی تھی۔ اس درخت کی خصوصیات مختصریں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر قسم کی دھات اس کے دودھ میں بآسانی کشتہ ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ درخت سخت زہریلا ہے اگر اس کے سایہ میں کوئی تین منٹ تک ٹھہرے تو تمام جسم متورم ہو جاتا ہے۔ بلکہ چلنا بھی دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے دودھ کا حاصل کرنا خالی از خطر نہیں۔ مگر جنون طبابت اور اس کے فوائد نے اس کے دل کو بھڑکایا۔ اور یہ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کاغان کے ایک گاؤں سے اس نے ایک رہبر کو ساتھ لیا۔ اور جنگل کا پتہ پوچھا جس میں یہ عجیب و غریب درخت ہے۔ راستے میں اس نے کئی بوٹیاں توڑیں۔ اور تھیلے میں جمع کیں۔ جو وہ ساتھ لایا تھا۔

راستہ بہت دشوار گذار تھا۔ کئی برف کی پُر گھاٹیوں سے گذرا۔ اس کے جسم پر کپڑے ناکافی تھے۔ اور سردی کافی تھی۔ مگر دل اس کے حصول کے لئے گرم تھا۔ اس لئے اس نے سردی کو کم محسوس کیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد یہ اور اس کا ساتھی اس جنگل میں پہنچے جہاں یہ درخت تھا۔ یہ درخت جنگل کے عین وسط میں تھا۔ اس کی بلندی تقریباً ۵ افٹ تھی۔ اور اس کا پھیلاؤ بھی تقریباً ۱۵ فٹ کے قطر میں تھا۔ اس کے قریب کوئی جھاڑی نہ تھی۔ اور نہ کوئی درخت۔ حتیٰ کہ اس کے سائے میں کوئی سبزہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کی جگہ جا بجا پرندوں اور جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جن کو دیکھکر کلیجہ مارے دہشت کے منہ کو آتا تھا۔ اس کا ہر ایک پتہ اور ہر ٹہنی تنہ بھی خون کی طرح سرخ تھا۔ اور ایسا نظر آتا تھا کہ اس پر ابھی خون فشانی کی گئی ہے۔ اجنبی آدمی تو دیکھکر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی بلا ہے۔ جس نے یہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اور قریب کے دیہات میں اس کے متعلق عجیب و غریب افسانے اور کہانیاں زبان زد تھیں۔ ...... ہر طرف سکوت تھا۔ نہ کسی پتے کے ہلنے کی آواز تھی۔ نہ کسی پرند کے بولنے کی۔ عجیب ہیبتناک اور بھیانک منظر تھا۔ حکیم حیران تھا کہ وہ کس طرح اس درخت کا دودھ لے جس کے لئے اس نے اتنی مسافت کی تکلیف برداشت کی ہے۔ اگر قریب جاتا ہے تو موت کا ڈر ہے۔ اگر کھڑا رہتا ہے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی حیرانی میں تھا کہ یکایک اسے اس سنیاسی کی ترکیب یاد آئی۔ جو اس نے اس درخت کی توصیف کرتے ہوئے بتائی تھی۔ خوشی کے مارے دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ ترکیب ایک وقت کا لحاظ تھا۔ جس کے دوران میں درخت اپنا عمل چھوڑ دیتا تھا۔ اور اس کی مدت غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے تھی جس میں ابھی دیر تھی۔

حکیم وقت کے انتظار میں، ایک قریب کے پتھر پر جا بیٹھا۔ اور سگریٹ سلگائی اور منہ سے کش لگانے لگا۔ اور اس درخت کی خصوصیات عرابیہ کے متعلق اپنے ساتھی سے گفتگو کرتا رہا۔ کہ آفتاب اپنی دن کی گردش ختم کر کے مغرب کے بستر پر استراحت کرنے لگا۔ جس کی خمار آلود نگاہوں سے مغرب شرابوں سے بھر گیا تھا۔ اس وقت حکیم اپنی جگہ سے انگڑائی لیکر اُٹھا۔ اور اس نامعلوم انجام تجربے کو کرنے لگا۔ اس نے کمبل کو کاندھے پر رکھا۔ اور ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے پہنے جو اس نے آتے وقت کیاڑی سے اس غرض کے لئے خریدے تھے۔ ...... مگر یہ تجربہ کرنے سے پہلے اس نے خدا کے حضور میں اپنے ہاتھ کامیابی کے لئے اٹھائے۔ زبان پر تو حصول تمنا کے الفاظ تھے۔ مگر دل میں اندیشہ کی

یا دتھی۔ جو اس کام کی تکمیل میں حائل ہو رہی تھی۔ "اگر میں مر گیا" اس کے دل میں خیال اٹھا "تو میرے بیوی بچے کیا کریں گے .... ان کا تو کوئی نہیں .... اس کام سے باز رہنا چاہیئے .... نہیں خدا ان کا والی ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے۔ تو انھیں روٹی بھی دیگا .... موت آج نہ آئی تو کل تو ضرور ہی آئے گی۔ اس سے چھٹکارا تو ہرگز نہیں"۔ اس خیال نے عمل کی صورت اختیار کی۔ حکیم نے اپنے تھیلے سے دو شیشیاں نکالیں۔ ایک بڑی تھی اور دوسری چھوٹی جس میں کوئی دوائی تھی۔ ان شیشیوں کو جیب میں ڈالکر چاقو کھولکر اس نے اس درخت کے گول سلسلے میں جست لگائی۔ اور کئی ہڈیوں کو روندتا ہوا وہ درخت کے تنے تک پہنچا۔ اور اس پر ایک بڑی کاٹ لگائی اور بڑی شیشی کے کنارے کو اس نے اس کے ساتھ لگا دیا۔ تاکہ اس درخت کی رس اس میں گرے۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ ٹہنیاں توڑنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی آنکھوں میں غبار چھا گیا اور سر چکرانے لگا۔ مگر اس نے اس ہاتھ سے جس سے وہ ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ جیب سے چھوٹی شیشی نکالی۔ اور سونگنے لگا۔ جس سے غبار اور چکر دور ہوئے اور پھر برابر سونگتا رہا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا صرف تھوڑا حصہ باقی تھا۔ حکیم نے جلدی رس والی بوتل کو بند کیا۔ اور ٹہنیوں کو اکھٹا کر کے باہر آیا۔ خوف سے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وحشت سے سینہ دھڑک رہا تھا۔ ہیبت سے ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا۔ مگر دل میں اطمینان تھا۔ حکیم نے ٹہنیوں کو زمین پر پھینکا۔ اور بوتل کو صاف کر کے کاغذ میں لپیٹ کر تھیلے میں حفاظت سے رکھا۔ اس کے ہاتھوں کو گرمی محسوس ہوئی۔ اس کے دستانوں پر درخت کا دودھ (رس) نکلتے وقت پڑ گیا تھا۔ جس سے وہ سلگ رہے تھے۔ حکیم نے فوراً اتار کر پھینک دیا۔ اور ہاتھوں پر تیل کی مالش کی۔ اگر اس کے ہاتھوں پر دستانے نہ ہوتے تو ہاتھ جل جاتے۔ پھر اس نے ٹہنیوں کو احتیاط سے کمبل میں لپیٹا۔ اور روانہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھی نے یہ کمبل اور تھیلا اس سے لے لئے۔ اور دونوں واپس گاؤں کو روانہ ہوگئے۔

حکیم کا دل مسرت سے لبریز تھا جس کا بیان مشکل ہے۔ شام ہوگئی تھی۔ اور رات کی سیاہی بسرعت تمام زمین پر پھیل رہی تھی۔ سردی بہت کڑاکے کی تھی۔ مگر حکیم نے اس کو محسوس نہ کیا۔ کیونکہ وہ اپنی کامیابی پر بیحد خوش تھا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا۔ کہ اس دودھ سے استفادہ نہ کر سکے گا۔ اگر اسے اس بات کا علم ہوتا تو وہ ہرگز اتنی تکلیف برداشت نہ کرتا۔ مگر مستقبل سے کون باخبر ہے؟ رات کو وہ گاؤں پہنچے۔ اس کے راہبر نے اسے اپنے مکان کا ایک کمرہ دیا۔ جس میں آگ جل رہی تھی۔ حکیم بہت تھکا ہوا تھا۔ اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس لئے وہ دودھ وغیرہ سے ناشتہ کر کے اپنی چیزوں کو سنبھال کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔ رات کو اسے حرارت ہوگئی اور ساتھ ہی پسلی کے نیچے دونوں طرف سے درد اٹھا۔ یہ نمونیہ کی علامت تھی۔ حکیم کے پاس دوائی نہ تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ واقعہ پیش آئیگا۔ ورنہ وہ ضرور اپنے ساتھ تمام ادویات لاتا۔ ایسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ درد سخت شدت کا تھا۔ بخار زوروں پر تھا۔ حکیم جان گیا کہ یہ ہاتھ موت ظالم کا ہے۔ جو اسے ان بچوں سے جن کا کوئی والی نہیں جدا کرنا چاہتی ہے۔ بخار کی حالت میں اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اور ایام گذشتہ کی یاد آئی۔ اسکی پیاری بیوی کا وہ فقرہ "خط لکھتے رہا کریں"۔ اس کے کان میں گونج رہا تھا۔ ان کے بے یارومددگار ہونے کا نقشہ اس کی

آنکھوں کے سامنے تھا۔ کیا میں مرونگا؟ جو اس نے خیال کیا۔ اور .... میری جاں نثار بیوی کو اس بات کا علم نہ ہوگا .... کیا مجھ پر رونے والا کوئی نہ ہوگا .... مگر انہیں معلوم نہیں کہ میں مر رہا ہوں۔ انہیں خبر دینے والا کوئی نہیں .... میرا خط نہ ملنے پر انہیں کیا گمان گزریگا۔ میرے نہ لوٹنے پر وہ کیا خیال کرے گی .... کیا وہ میری انتظار کرے گی .... مگر کب تک قیامت تک! .... کیا اس کے دل میں میرے دیکھنے کی حسرت ہوگی .... میرے پیارے بچے کیا کہیں گے۔ انہیں کون پالے گا .... کیا وہ میری راہ اب بھی تکتے ہونگے .... مگر انہیں معلوم نہیں کہ میں انہیں بالکل چھوڑنے والا ہوں۔ وہ میری انتظار کب تک کرینگے .... کاش کہ انہیں اس بات کا علم ہوتا .... میری قبر پر کوئی نہ روئیگا .... میں کہاں مر رہا ہوں۔ انہیں خیالوں میں مستغرق تھا کہ پیغام اجل صبح کے قریب آپہنچا۔ اور وہ فرشتہ اجل کے ہمراہ اپنے محبوبِ حقیقی کو ملنے گیا۔"

میزبان کو اپنے مہمان کی موت پر سخت رنج ہوا۔ اس نے اور تمام گاؤں والوں نے تجہیز و تکفین کی۔ جنازہ والوں کے ساتھ حسرت برستی اور یاس آنسو بہاتے جا رہی تھی ....

ناکام تمنا

(جناب ڈاکٹر عبدالودود خان قمر بی۔ اے سرحدی)

اگرچہ سر کو پٹکتے ہوئے زمانہ ہوا
حصول پھر بھی کوئی اپنا مدعا نہ ہوا

ہمیں بھی اس نے بلایا تھا اپنی محفل میں
یہ اتفاق ہوا تھا اسے زمانہ ہوا

کسی کے دم سے تھا روشن دیارِ عالمِ دل
ہوا کچھ ایسی چلی گل چراغ جانا نہ ہوا

کبھی وہ ہم سے ملے تھے خیال ہے شاید
بہار آئی تھی گلشن میں اک زمانہ ہوا

گئی تھی ہاتھ سے دنیا چلی تھی عقبیٰ بھی
یہ خیر گذری کہ وہ بُت مرا خدا نہ ہوا

ہزار حیف رہی جستجو ہی منزل کی
تمام عمر نہ اپنا کہیں ٹھکانہ ہوا

وہ تیرہ بخت ہیں قسمت نہ آجتک چمکی
جبینِ شوق رگڑتے ہوئے زمانہ ہوا

حضور! "اوروں" کے چلتے رہا اشاروں پہ
ہمیں تھے "غیر" ہمارا کبھی کہا نہ ہوا

قمر رہا شبِ وعدہ عجب تذبذب میں
کبھی قیام کی سوجھی کبھی روانہ ہوا



دارو بیار

Durga Art Press Anarkali Lahore

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواب ساز

(جناب نذیر مرزا برلاس سرحدی (منشی فاضل)

افراد

جاوید۔
ناہید
کارخانہ دار

سین

(شام۔ جدید طرز عمارت کا ایک کمرہ۔ عقب کی کھڑکی سے چاندنی شعاعیں چھن چھن کر آ رہی ہیں۔ اور آتشدان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی روشنی سے مل کر کمرہ روشن کئے ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے دور تک گئی ہوئی گلی دکھائی دے رہی ہے۔ کھڑکی کے مقابل دائیں طرف کمرہ کا دروازہ ہے۔ آتش دان کے بالمقابل برتن رکھنے کی الماری دھری ہے۔ جس میں چائے کے برتن قرینہ سے رکھے ہیں۔ برتنوں پر آگ کی روشنی کا عکس جھلملا رہا ہے۔ آتشدان کے پہلو میں لکڑی کی نشست گاہ ہے۔ کمرہ کے بیچ میز لگ رہی ہے۔ میز پوش سرخ ہے۔ کوئلوں کے پاس کیتلی دھری ہے۔ آتشدان کی کارنس پہ مدھم روشنی سے لمپ جل رہا ہے۔

ایک سایہ کھڑکی کے پہلو سے ہو کر گزرتا ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ ناہید داخل ہوتی ہے۔

اپنا لبادہ اتار کر دروازے سے لٹکا دیتی ہے۔ سردی سے کانپ اٹھتی ہے اور آگ تاپنے آتشدان کو بڑھتی ہے لمپ کی روشنی تیز کرتی ہے۔ اور کیتلی اٹھا کر کوئلوں پر رکھ دیتی ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ اور برتن نکال کر دو آدمیوں کی چائے پینے کو برتن میز پر سجاتی ہے۔ دل میں اک خیال سا گزرتا ہے۔ کھڑکی کی طرف بڑھتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے آتشیں رنگ کے پردوں کو ہٹاتے ہوئے دور تک نگاہ ڈالتی ہے۔ اور مایوس سی پھر سماں کی طرف لوٹ آتی ہے۔ چائینک میں چائے کی پتی ڈالتی ہے۔ ایک چمچہ دوسرا۔ اور پھر تیسرا۔ باہر کی کوئی آواز کان میں پڑتی ہے؟

متوجہ ہوتی ہے۔ دھیمے سروں میں گانے کی آواز آتی ہے ؎

ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد
باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد

[آواز قریب آرہی ہے۔ کھڑکی کے پہلو سے ہو کر پھر ایک سایہ گزرتا ہے۔ جاوید داخل ہوتا ہے]

جاوید۔ (ٹوپی ناہید کی طرف پھینکتے ہوئے) کس شدت کی سردی ہے۔ پاؤں برف ہو رہے ہیں

ناہید۔ یہ رہے سلیپر۔ گرم ہونے کو میں نے آگ کے پاس رکھ دئے تھے۔

[جاوید آگ کے قریب لکڑی کی نشستگاہ پہ بیٹھ کر بوٹ اتارتا ہے۔ ناہید سامنے دو زانو ہو کر پاؤں میں سلیپر پہنا دیتی ہے]

جاوید۔ (گا رہا ہے)

ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد
باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد

چائے تیار ہونے میں کیا دیر ہے

ناہید۔ ہوا چاہتی ہے۔ پانی جوش کھالے۔

جاوید۔ وہاں شدت کی سردی تھی۔ اچھا نہ گا سکا۔ سردی میں سُر سے گا ہی نہیں سکتا۔

ناہید۔ خوب! تم بھی کیتلی کی مثال ہو۔ وہ بھی سردی ہو تو گا نہیں سکتی۔ کیتلی صاحبہ جلدی کیجئے۔

جاوید۔ کاش! اسے بھی اپنی آواز سے محبت ہو۔

ناہید۔ ضرور ہوگی۔ یہ لو وہ گا رہی ہے۔ ہماری چائے صدائے بلبل سے تیار ہوگی۔ [پانی چائینک میں ڈالتے ہوئے] آیئے۔

جاوید۔ [آگ کو بغور دیکھتے ہوئے] حسن بے صورت ہے۔ روح نہ ہوگی کیا؟

ناہید [میز پہ برتن درست کرتے ہوئے] آیئے۔ خوش ہو جیے۔ [پلٹ کر دیکھتے ہوئے] یہ آگ سے کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔

جاوید۔ یونہی۔ ذرا سوچ رہا ہوں۔

ناہید۔ آیئے۔ چائے نوش کیجئے۔ آگ کے پاس بیٹھ کر دیکھنے سے خیالات غذیا آتش ہو جاتے ہیں۔

جاوید۔ دنیا ایک آتش دان ہے۔ دنیا والوں کو کاغذ کی سی ناچیز شے دے دیجئے۔ اسے آگ لگ جائے گی۔ ایک ہنگامی جوش پیدا ہوگا۔ لیکن ایسا خیال جسے حقیقت کہا جاسکے دھوئیں کی اوٹ میں فنا ہو جائیگا۔

ناہید۔ فلادو دیکھ کس طریقے سے برتن سجائے گئے ہیں۔

جاوید۔ ناہید! تمہارے ہونٹوں پہ ہمیشہ تبسم کھیلا کرتا ہے؟

ناہید۔ جی ہاں۔ میں خوش رہنے کی کوشش کیا کرتی ہوں۔

جاوید۔ خوب!

[میز کو بڑھاتا ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ چائے پیتا ہے۔ ذرا دیر خاموشی رہتی ہے]

ناہید۔ چائے کیسی رہی۔

جاوید۔ خاصی ہے۔

ناہید۔ صرف خاصی۔ لایئے تازہ پیالہ بنا دوں۔

جاوید۔ ضرورت نہیں۔ میں ان تکلفات سے دق ہوتا ہوں۔

ناہید۔ کیتلی کہاں کھا رہی ہے نیچے رکھ دوں کیا؟

جاوید۔ میں نے کہا ناہید تم نے آج وہ لڑکی دیکھی؟

ناہید۔ کون لڑکی؟

جاوید۔ آج کے تماشائیوں میں ایک تھی۔ اللہ رے تمکنت۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا کیا زیب دے رہی تھی۔

ناہید۔ میں نے تو نہ دیکھا۔

جاوید۔ ہم نے دیکھا۔ اس نے ہمیں دیکھا۔ جب تک ہم گاتے رہے برابر دیکھتی رہی۔ تالی بجا بجا کر ہمارے گانے کی داد دیتی رہی۔
ناہید! کیا عورت کی روح بھی اتنی حسین ہے جتنا جسم؟

ناہید۔ ایسی بن رہی ہوگی۔

جاوید۔ کبھی نہیں، اور تم کیسے کہہ سکتی ہو جب اسے دیکھا ہی نہیں۔

ناہید۔ یاد نہیں۔ شاید دیکھا بھی ہو۔

جاوید۔ ناہید! یہ اظہار رشک ہمیں پسند نہیں۔ ہم تم ایک کام کے شریک ہیں، اور بس۔ شرکت سے پہلے فیصلہ ہو چکا کہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ جس سے جی چاہے ہم شادی کریں۔ جس کا جی چاہے تم سے شادی کرے۔

ناہید۔ ہوش کی لو کیسا رشک؟

جاوید۔ [گاتا ہے]
دل بہ کسے نباختہ با دو جہاں نساختہ
من بہ حضور تو رسم روز شمار ایں ہمہ

ناہید۔ کہیں ختم ہونے پہ تم نے اسے دیکھا۔

جاوید۔ نہیں۔ کہیں بھیڑ میں کھو گئی۔ چائے ختم ہوئی۔ لو۔ میں اس کی تلاش کو جاتا ہوں۔

ناہید ۔ باہر بہت سردی ہے۔ بیٹھئے آگ تاپئے۔ جرابیں رفو کرنی ہیں۔ میرا ہاتھ بٹایئے۔

جاوید ۔ رفو! خوب ۔ زندگی خود میں رفو سے بہتر دلچسپیاں رکھتی ہے۔

ناہید ۔ مجھے اتفاق نہیں۔ دنیا کی تمام دلچسپیاں یکساں ہیں۔ ہر روز کے استعمال سے جراب میں سوراخ ہوئے مرمت ہوئی۔ دانا وہ ہیں جو اس مرمت کو نبھا جائیں۔

جاوید ۔ تمہارا خیال شعر میں موزوں کر رہا ہوں۔ ایک مصرع سوجھا ہے۔

ناہید ۔ فرمایئے!

جاوید ۔ شعر مکمل تو ہو لے۔ بات چیت میں ایک مصرع خود بخود ذہن میں آگیا۔ لو سنو۔

[اُٹھ کر میز پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اسے سٹیج سمجھتا ہے]

زندگی نیند نہیں سوز محبت ہوگی۔

[مصرع اس خیال سے بار بار دہراتا ہے کہ شعر مکمل ہو جائے]

نہ ہوا۔ خیال تشنہ رہا۔ ہو جائیگا۔

ناہید ۔ آج یہ شعر سٹیج پہ گاؤ گے۔

جاوید ۔ [نیچے اترتے ہوئے] تم ہمیشہ سے بے صبر ہو۔ بابا کی پرستش سے اکتا جاتا ہوں۔ فنون لطیفہ سے حسیات تیز ہو جاتی ہیں۔

ناہید ۔ باہر نہ جاؤ شدت کی سردی ہے۔

جاوید ۔ کچھ اور پوچھنا باقی ہوگا نا؟

ناہید ۔ تم ابھی کہہ رہے تھے میں ہمیشہ خوش نظر آتی ہوں۔

جاوید ۔ جی ہاں۔ کہا تھا۔ غلطی کی۔ معاف فرمایئے کیا سزا ہے؟

ناہید ۔ تو بڑا آج بات کیا ہے۔ تم بات بات پہ بگڑتے ہو۔ صرف تمہاری تکلیف کا خیال ہے ورنہ مجھے کیا۔

جاوید ۔ میرا ارادہ اٹل ہے۔ مجھے اس لڑکی کو ڈھونڈھنا ہے۔ شاید وہی میرے خوابوں پر حکومت کر رہی ہو۔

ناہید ۔ تم ہمیشہ ایک موہوم عورت کا تصور کیوں کرتے ہو۔

جاوید ۔ تم بھی اپنے خیال کے سنگھاسن پہ اک موہوم مرد کو بٹھا لو۔

ناہید ۔ میں عمل کو تخیل پہ ترجیح دیتی ہوں۔

جاوید ۔ اس لئے کہ صنف لطیف تخیل سے محروم ہے۔ وہ ہمدردی کا مجسمہ ہے۔ ایسی ہمدردی جس میں مادرانہ شفقت کا شائبہ زیادہ ہے۔ اور جب صرف مادرانہ شفقت ہو۔ تو یہ اسے "محبت" کہتی ہے۔ اس کے تمام جذبات گھر کی چار دیواری تک محدود

ہوتے ہیں۔ مجھے ایسی عورت کی تلاش ہے جسے دیوی کی طرح تخت پہ بٹھا دوں۔ میں اس کی پوجا کروں۔ اور اپنی عقیدت مشتاق نظروں کی وساطت سے اس کے قدموں پر نچھاور کرتا رہوں۔

ناہید [کھوئی سی اسے دیکھتی ہے] خوب! پھر کیا ہو۔

جاوید آہ تم کبھی نہ سمجھوگی۔ لو میں چلتا ہوں۔

[وہ قدم بڑھاتا ہے۔ اور کنکھیوں سے ناہید کو دیکھتے ہوئے طنز آمیز دھیمی آواز سے گاتا ہے ؎

ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد

ناہید اسی طرح کھوئی کھوئی سنتی ہے۔ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی ہے۔ اور آخر سنائی نہیں دیتی۔ وہ آتشدان کو بڑھتی ہے۔ اور قریب بیٹھ کر ذرا جھکتے ہوئے کوئلوں کو درست کرتی ہے۔ ایسے میں اسے چند اشعار حسب حال یاد آتے ہیں۔ وہ درد بھری آواز میں انھیں اس انداز سے گاتی ہے گویا دیکھتے ہوئے کوئلے بغور سن رہے ہیں

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست ؛ منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

من ازیں طالع شوریدہ برنجم ورنہ ؛ بہرہ مند از سر کوئت دگرے نیست کہ نیست

از سر کوئے تو رفتن نتوانم گامے ؛ ورنہ اندر دل بیدل سفرے نیست کہ نیست

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ؛ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

بجز ایں نکتہ کہ حافظ ز تو ناخوشنود است

در سراپائے وجودت ہنرے نیست کہ نیست

[اس پہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔ آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔ کوئی آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ تعجب سے اس طرف نظریں اٹھاتی ہے۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا جاتا ہے]

ناہید۔ تشریف لائیے!

[دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ اس طرح گویا دونوں پٹ آپ سے آپ کھل رہے ہیں۔ دہلیز پہ کارخانہ دار کھڑا نظر آتا ہے۔ چاندنی اسے احاطہ کئے ہے۔ بوڑھا۔ شکل و صورت عجیب لیکن شفقت سے مملو۔ وضع قطع ایسی کہ جو دیکھ پائے تو خوف کھا جائے۔ گہرے سبز رنگ کا لبادہ پہنے ہے۔ جسے چاندی کے بٹن لگ رہے ہیں۔ دونوں پہلوؤں پہ دو بڑی بڑی جیب ہیں۔ شکل و صورت یا لباس سے امارت ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی اور دنیا کا فرد نظر آتا ہے۔ آہستہ آہستہ کمرے کے اندر قدم بڑھاتا ہے۔ دروازہ کے پٹ آپ سے آپ بند ہو جاتے ہیں۔

ناہید۔ [جلدی سے اٹھتے ہوئے] معاف کیجئے گا۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی۔

کارخانہ دار کوئی بات نہیں۔ میں دروازے کھولنے کا عادی ہوں۔ تمہارا دروازہ اوروں کی نسبت آسانی سے کھل گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ

بعض لوگ دروازوں میں میخیں جڑ دیتے ہیں۔ ایسے دروازوں کا کھٹکھٹانا ہی عبث ہے۔ آپ حیران ہو رہی ہیں کہ آخر میں ہوں کون۔

ناہید۔ نہیں تو۔ یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔

کارخانہ دار۔ آہ۔ عورت کی ذہنیت۔ جی نہیں۔ شکریہ۔ میں بہت کم کھاتا ہوں۔ بہت ہی کم۔ ایک ہلکا سا تبسم۔ ہاتھوں کی ایک معنی خیز ادا میرے زندہ رکھنے کو کافی ہیں۔

ناہید۔ تو آپ بے تکلفی سے تشریف رکھیے۔ غریب خانہ کو اپنا گھر جانئے۔

کارخانہ دار۔ [آتش دان کو بڑھتے ہوئے] جی ہاں میں ہر کہیں بے تکلفی برتتا ہوں۔ ہر گھر کو اپنا گھر جانتا ہوں۔ بعض کا خیال ہے کہ کوئی "گھر" میرے بغیر گھر نہیں ہو سکتا۔ اجازت ہو تو آگ کے پاس بیٹھوں۔ یہ میری ایک قدیم عادت ہے۔

ناہید۔ سر و چشم مشہور ہے۔ کہ محبت کا شعلہ گھر کی آگ کے پاس بیٹھنے ہی سے بڑھتا ہے۔

کارخانہ دار۔ درست بن کر آگ تاپنے کا راز نہیں کھلتا۔ ناہید۔ تم روتی رہی ہو؟

ناہید۔ جی ہاں۔

کارخانہ دار۔ اللہ رحم کرے جانتا ہوں کس کے لئے۔ جاوید کے لئے۔ تو تمہیں اس سے محبت ہے۔ اور وہ تمہاری پرواہ نہیں کرتا۔ خوب! آہ دنیا تیرے بکھیڑے اور تم رو رو کر اپنی آنکھیں اس کی نذر کر رہی ہو۔

ناہید۔ نہیں۔ اکثر نہیں روتی۔ آج رات اس کی بے رحمی کی حد ہوگئی جب بھی ٹھنڈے دل سے برداشت کیا۔

کارخانہ دار۔ بے رخی۔ اچھا یہ بات ہے۔

ناہید۔ جی ہاں لیکن اس نے جان بوجھ کے ایسا نہ کیا۔ مرزی زوروں پہ ہے۔ کاروبار مضطرب ہو رہا ہے۔ جاوید مقامی اخبار کیلئے بطور اشتہار ایک مقالہ لکھنا چاہتا ہے۔ اس خیال سے کہ اگر ٹکٹ مفت ایڈیٹر کی نذر ہوں تو یہ چھپ جائیگا۔

کارخانہ دار۔ تو جاوید تمہارے لئے ایسا ہے کہ تمہارے آنسو اس کے لئے ٹپکیں۔

ناہید جی!

کارخانہ دار۔ جانتی ہو آنسو ضائع کرنے کی چیز نہیں۔ ان کی محدود مقدار ہمیں دل کے شاداب رکھنے کو دی جاتی ہے۔ اگر ہم انہیں آخری آنسو تک صرف کر دیں تو دل کی دنیا خشک ہو جائے۔

ناہید۔ جاوید میں بڑی خوبیاں ہیں۔ آپ اتنا نہ جانتے ہونگے جتنا میں جانتی ہوں۔ مانا کہ تسلیم و رضا کا عادی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسے کسی سے محبت نہیں۔ محبت کرنے سے زندگی میں انقلاب آجاتا ہے۔

کارخانہ دار۔ درست۔ تو تمہاری زندگی میں انقلاب آچکا ہے۔

ناہید۔ یقیناً میں جاوید کے سلیپر گرم ہونے کو آگ کے پاس رکھ دیتی ہوں۔ میں اس کے لئے چائے تیار کرتی ہوں۔ اس دوران

میں اسے پیار کرتی ہوں۔ مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہی ہوں محبت نہ ہو تو یہ کام میرے لئے مسرت کا باعث نہ ہوں۔

کارخانہ دار۔ تمہیں یقین۔ کہ تمہاری محبت بے لوث ہے۔

ناہید جی ہاں!

کارخانہ دار۔ جب بھی تم جاوید کا خیال کرتی ہو۔ تمہاری رگ رگ میں لرزش سی محسوس ہوتی ہے۔ جب بھی وہ تم سے گفتگو کرتا ہے تمہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی تمہارا دل چٹکیوں میں مسل رہا ہے۔

ناہید۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ بالکل ایسے ہی۔..........

کارخانہ دار۔ خوب! اب رہا یہ۔ صرف جاوید ہی سے تمہاری لطیف شعریت بیدار کیوں ہوئی۔

ناہید کیونکہ.......... کیونکہ وہ جاوید ہی تو ہے۔

کارخانہ دار۔ "کیونکہ وہ جاوید ہی تو ہے"! پھر وہی پرانا فلسفہ.......... وہی بار بار کی سنی دلیل۔

ناہید وہ اکثر تخیل میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس سے اس کی روح تسکین پاتی ہے۔ یقیناً وہ چاہے تو کارخانوں کا مالک ہو۔ آپ نے اس کا تبسم نہ دیکھا۔ کتنا لطیف ہے۔ اکثر جب اس کا خیال کہیں اور ہو۔ میں اس ادا سے لطف اندوز ہوئی ہوں۔ کاش اس کا تبسم اوروں کی بجائے صرف میرے لئے ہو۔

کارخانہ دار اچھا۔ اس کا تبسم عام ہے۔

ناہید کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ ایک نہ ایک خوبصورت عورت تماشا میں شریک نہ ہوئی ہو۔ آج بھی تھی۔ دراز قامت۔ نوخیز وہ ابھی ابھی اسی کی تلاش میں نکلا ہے۔ لیکن ان کی کیا خطا۔ وہ مجبور ہیں کہ اسے چاہیں۔ (رعونت سے) کون ایسا ہوگا جو جاوید کو دیکھے اور اس سے محبت نہ کرے۔

کارخانہ دار۔ ایسی خوبصورت عورتوں سے کوئی اس سے شادی کرلے جب کیا ہو۔

ناہید ناممکن ہے جن غربت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر اس کی شادی ہو جائے تو میری ہستی مٹ کر رہ جائے۔ لیکن اُہ۔ میں کیوں اس بے تکلفی سے دل کے بھید آپ پر کھول رہی ہوں۔ گویا آپ سے برسوں کی جان پہچان ہے۔

کارخانہ دار۔ [اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ ناہید کی طرف بڑھتا ہے۔ جو میز پوش تہ کر رہی ہے۔] شاید تم مجھے برسوں سے جانتی ہو!

[اس کا لہجہ اس قدر شفقت آمیز ہے کہ ناہید میز پوش تہ کرنا بھول جاتی ہے اور بے اختیار اسے دیکھتی ہے۔ وہ زیرِ لب مسکراتا ہے۔ اور پلٹ کر اپنی جگہ آبیٹھتا ہے۔]

ناہید۔ [اس کو پلٹتے وقت اس کی جیب کے باہر نکلی ہوئی چھوٹی سی کمان کو کھینچتے ہوئے] اوہو! یہ کیا ہے۔

کارخانہ دار۔ ہوں! اسے نہ دیکھنی تو اچھا تھا۔ کہیں بےفکری میں یہ جیب سے باہر لٹکتی رہ گئی۔ گئے گزرے زمانے میں عشق بتیر اندازی کیا کرتا تھا۔ یہ جب کی یادگار ہے۔ آج کل اس کا کم اتفاق ہوتا ہے۔ [کمان واپس لیکر جیب میں ڈال لیتا ہے]

جاوید [کہیں دور گاتے ہوئے]

ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بہ باد میدہد
باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد

کارخانہ دار۔ (ناہید کے کان میں) یہ کون ہے؟

ناہید۔ جاوید۔

(کھڑکی کے پہلو سے ہوکر پھر اک سایہ گزرتا ہے۔ جاوید داخل ہوتا ہے)

جاوید۔ کہیں نظر نہ آئی (کارخانہ دار کو دیکھتے ہوئے) ہیں! آپ کون ہیں؟

کارخانہ دار۔ تمہارے لئے اجنبی ہوں۔ ناہید تو دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔

جاوید۔ "اک شعلۂ دیرینہ"... شائد۔

کارخانہ دار۔ "شعلۂ دیرینہ" جی ہاں اک عرصہ سے دنیا کو روشن کئے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ دیرینہ کیوں۔ سب کا خیال ہے کہ میں باوجود سالخوردہ ہونے کے جوان ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کتنے طویل عرصہ سے اس جہاں میں بادیہ پیما ہوں

جاوید۔ (ہاتھوں سے بتاتے ہوئے) اتنے طویل عرصہ سے۔

کارخانہ دار۔ تمہارا پیشہ تمہیں تہذیب سے دور لے جا رہا ہے۔

ناہید۔ جاوید۔ اخلاق سے بات چیت کرو۔

کارخانہ دار۔ (جاوید سے تنہائی چاہنے کی بےقراری کا اظہار کرتے ہوئے) ناہید! کھانا تیار ہوگا؟

ناہید۔ ہو جائیگا۔ بازار کھلا ہے۔ ابھی لئے آتی ہوں۔ آپ میری واپسی تک تو یہیں ہونگے نا؟

کارخانہ دار۔ (اسے بھیجتے ہوئے) کہہ نہیں سکتا شائد ہوں۔

[ناہید جاتی ہے۔ خاموشی۔ کارخانہ دار جاوید کی شخصیت کے مطالعے سے لطف اٹھاتا ہے]

کارخانہ دار۔ دوست جاوید۔ کاروباری بات چیت مختصر ہونی چاہیئے۔

جاوید۔ مختصر! اگر خندہ ہائے بے اختیار کے معنی کاروبار ہیں تو وہ مختصر ہونگے۔ لیکن اس میں تم کو کیا دخل۔ آج ایک خوب کام کر آیا ہوں۔ یہ کہ ایڈیٹر سے وعدہ لے لیا کہ میرا مضمون چھاپے گا۔

کارخانہ دار۔ جہان بھر کی دولت سمیٹ لو۔ لیکن حقیقی مسرت تمہارے پاس تک نہ پھٹکیگی۔

جاوید۔ اچھا یہ بات ہے تو لائیے شرط لگا لیجیے۔

کارخانہ دار۔ تمہیں شہرت کی خواہش ہے۔ دولت کی ہوس ہے۔ اور ناچیز مقاصد کی چاہت ہے۔ ان کی تحصیل کی سعی میں تم حقیقت

جاوید۔ سے کوسوں دور جا پڑے ہو۔ تمہاری روح کو تسکین نہیں کیونکہ تم نہیں جانتے حقیقی مسرت کیسے حاصل ہو۔
میں ان دنوں گیت لکھنے میں مشغول ہوں۔ اس سے مسرت محسوس کرتا ہوں۔

کارخانہ دار۔ تو ایسا گیت لکھو جس کا خاتمہ نہ ہو۔

جاوید۔ یہ عجیب بات ہوئی۔ ہے نا۔

کارخانہ دار۔ ہر ایک کی سمجھ تک ہے۔ جب حقیقی مسرت حاصل ہو ویسے ہی گیت گایا کرتا ہے۔

جاوید۔ یہ ہمارے پیشہ سے متعلق ہے۔ خوب پھر۔

کارخانہ دار۔ اچھا تو میں پھر کاروبار کی طرف آتا ہوں۔

جاوید۔ ضرور۔ کہیئے آپ کو کتنی کرسیاں چاہئیں پہلی دو میں ہوں نا مخملی گدیوں والی۔ ایک روپیہ فی۔ پانچ آٹھ آنے..... فرشی دو آنے۔ حکم کیجئے۔

کارخانہ دار۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔

جاوید۔ کیا ضرور ہے سبھی تو آتے ہیں۔ ہم آپ کی خاص توجہ کے مشکور ہیں۔

کارخانہ دار۔ جاوید۔ میں "خواب ساز" ہوں۔

جاوید۔ (حیرت سے) کیا کہا کیا "ساز"۔

کارخانہ دار۔ میں ان خوابوں کا خالق ہوں جو دنیا پہ چھا رہے ہیں۔

جاوید۔ بُرا نہ مانئے۔ جلد سے اس تجارت کو بند کر دیجئے۔ خدانخواستہ یہ "سازی" دماغ کے لئے مضر ثابت نہ ہو۔

کارخانہ دار۔ جاوید۔ جاوید۔ تمہارا پتھر دل میری صدا پہ لبیک نہیں کہتا جبکہ ایک معصوم بچہ یا دنیا کا کوئی مسافر فوراً پکار اٹھیگا۔
میں خواب ساز ہوں۔ وہ ننھی ننھی چیزیں جو لوگوں کے دلوں میں چمکتی ہیں اور انہیں حقیقی راحت پہنچاتی ہیں تمہیں تعجب ہوگا یہ حد درازملک کے آتے ہر نئے موسم خزاں میں کہاں چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کارخانے میں آتے ہیں اور اطلاع کرتے ہیں کسے کون خواب چاہئے اور ان خوابوں کا کیا ہوا جو بہار میں وہ ساتھ لیتے گئے۔

جاوید۔ میں نے کہا آپ کو یہ توقع تو نہیں کہ میں اسپہ یقین کر لوں۔

کارخانہ دار۔ پھولوں کے مرجھانے پر کبھی تم نے غور کیا کہ ان کی رنگت اور خوشبو کیا ہوئے۔ کبھی یہ سوچا کہ جاڑے میں حسین تیتریاں کہاں گئیں۔ ہمارے کارخانہ میں جاڑے کی آفت نہیں۔

جاوید۔ ہم نے کبھی دماغ کو ان الجھنوں میں نہیں ڈالا۔

کارخانہ دار۔ ہمارا کارخانہ گمشدہ اشیاء کا آخری دارالاجتماع ہے۔ جس حسین چیز سے دنیا بے رخی برتتے ہمارے ہاں آتی ہے۔ اور وہاں معصوم خوابوں کی تخلیق میں برتی جاتی ہے۔ ایسے خواب جنہیں لوگ "محبت" کہتے ہیں۔

جاوید۔ جی جی۔ بات تو اب شروع ہوئی نا۔

کارخانہ دار۔ تمہیں کاہے کو یقین ہوگا۔

جاوید۔ ایک طرح کا یقین تو ہے لیکن اسے ثبات نہیں۔ اسے ثبات نہیں۔ صورت ہو تو روح اور جو روح ہو تو صورت نہیں۔ سینکڑوں بار آزمایا۔ پہلی دھلائی میں رنگ غائب!

کارخانہ دار۔ تمہیں فریب ملا ابھی حقیقت کھلی جاتی ہے۔

جاوید۔ وہ کیسے؟

کارخانہ دار۔ کئی آثار ہیں حقیقت کا سامنا ہوا۔ اور شانوں میں حرکت ہوئی۔ گویا محبت کے پر تل رہے ہیں۔ "پھر تم ستاروں کے پاس اُڑ جانا چاہتے ہو۔" "کہ آسمان کی نیلی چھت پہ بیٹھ کر چاند کو اپنے بے پناہ نغمے سناؤ۔" میرے بنائے خوابوں میں چاندنی کا بڑا حصہ ہے۔ ان خوابوں کی تخلیق کا طریقہ انوکھا ہے۔ ان کے اجزا مست مست کرنہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ پھر ان کی تجدید کی جاتی ہے۔ یہ حیرت انگیز سرعت سے پروان چڑھتے ہیں۔ اور پندرہ روز میں ایک کیف آور حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جاوید۔ کتنی مسحور کن حقیقت ہے۔ تو کیا سبھی خواب یہ پردیسی پرندے ہی لاتے ہیں۔

کارخانہ دار۔ نہیں اور پیغامبر بھی ہیں۔ ہر روز آدھی رات گئے جب گھڑیال بارہ بجاتا ہے۔ کیلنڈر سے ایک "دن" سرک کر ہمارے کارخانہ کو بھاگتا ہے۔ جو خطۂ ماضی میں واقع ہے۔ ہم اس میں سرخ و سنہری رنگینیاں بھر دیتے ہیں۔ اور اس سے کہتے ہیں۔ "ننھے کل کے دن جا اور دنیا کے حافظہ میں ایک خواب تھا یاد بن کر رہ جا۔" ہمارے بہترین خواب "آج کے دن" کے لئے ہوتے ہیں۔ ہم معصوم بچے مول لیتے ہیں۔ ان کے ننھے دماغوں میں یہ خواب بٹھا دیتے ہیں۔ اور بعد وصولی مزدوری انہیں والدین کے ہاں واپس بھیج دیتے ہیں۔

جاوید۔ میں عمر بھر خواب دیکھا کیا ایسے خواب جو میرے اپنے بنائے ہوئے تھے اب سمجھا کہ ان کی بناوٹ میں نقص ہوگا۔

کارخانہ دار۔ ہمارے بنائے خواب ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ لیکن تلاش شرط ہے۔

جاوید۔ درست۔ لیکن ان آوارہ خوابوں کی تلاش کہاں کی جائے۔

کارخانہ دار۔ عرصہ ہوا ہم نے ایک خواب بنایا تھا جو تمہارے قابل تھا۔ ہم نے اسے ایک بچی کے دماغ میں بٹھا دیا۔ یہ بیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ اب وہ بچی نامِ خدا جوان ہے۔ اس کی آنکھیں انتہائی حسین ہیں۔ اس کے لمبے لمبے

بال بلا کے لیڈر ہے۔

جاوید۔ یہ تذکرہ ذرا تفصیل چاہتا ہے۔

کارخانہ دار۔ تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے جب اسے دنیا میں واپس کیا تو کسی سے اپنی محنت کے دام نہ لئے۔ یہ رہی اس کی تفصیل۔ دام دلوائیے!

جاوید۔ شکریہ! لیکن اس سے فائدہ؟

کارخانہ دار۔ جو دام دے اس کا مالک ہو۔ وعدہ ہے کہ تم خسارہ میں نہ رہو گے۔ اس میں اس کا حلیہ تفصیل سے لکھ رہا ہے۔

جاوید۔ دراز قامت۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا۔۔۔۔۔۔۔

کارخانہ دار۔ نہیں۔

جاوید۔ تو پھر وہ نہیں کہاں ملیگی؟

کارخانہ دار۔ یہ تمہارا کام ہے۔ ڈھونڈ نکالو۔

جاوید۔ تو لیجئے ہم ابھی سے چل دیے۔ (یوں اضطراب سے گویا جانے کو ہے)

کارخانہ دار۔ ابھی نہیں۔

جاوید۔ دیر سے فائدہ۔ کسی اور کے ہتے نہ چڑھ جائے۔

کارخانہ دار۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کسی کو ایک خاص قسم کے جنگلی پھول کی ضرورت ہوئی۔

جاوید۔ (حیرت سے) جنگلی پھول

کارخانہ دار۔ سرِ شام ہی جنگل کو چل نکلا۔ رات بھر ٹکریں ماریں۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ پھول نہ ملا۔ پو پھوٹی۔ مایوس گھر کو لوٹا۔ گھر کے باغیچہ سے گزر رہا تھا۔ پھول نظر پڑ گیا۔ جو رات میں اُگ آیا تھا۔ دوسروں کے تجربہ سے سبق لو۔ اور ایسے شخص کی نصیحت کی قدر کرو جو دنیا خوب دیکھے ہے۔

جاوید۔ یہ آپ کی نصیحت ہے تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ فرمائیے وہ ملیگی تو ضرور۔

کارخانہ دار۔ تم خود کو دیوانہ کہلوانے کے خواہشمند تو نہیں؟

جاوید۔ (کھویا سا جاتا ہے) بات یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ یہ براہ راست سوال کا انداز۔۔۔۔۔۔۔ جواب خاک بن آئے۔۔۔۔۔۔ لیکن اگر۔۔۔۔۔۔ (رک جاتا ہے)

کارخانہ دار۔ ہاں ہاں۔ کہو

جاوید۔ اپنے منہ اپنی تعریف بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔

کارخانہ دار۔ یہی تو وقت ہے۔ ستاروں پہ نظر جمائے قدم بڑھا رہے ہو۔ کوئی ناچیز جان پاؤں تلے نہ روند دو۔

تمہیں ایک نئے گیت کے لئے مواد دیتا ہوں۔ "زندگی عورت کی صدائے دعوت ہے۔ کان دھرو۔ ایسا نہ ہو رات آنے سے پہلے تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوں۔"

[اس کے شفقت آمیز لہجہ سے جاوید ویسے ہی متاثر ہوتا ہے۔ جیسے ذرا دیر پہلے ناہید ہوئی تھی۔ دونو ایک دوسرے پہ نظریں جمائے ہیں۔ دفعۃً کھڑکی کے شیشے سے کوئی گزرتا نظر آتا ہے۔ ناہید کھانا لئے داخل ہوتی ہے۔]

ناہید۔ "!" آپ یہیں ہیں۔

کارخانہ دار۔ بس تیار ہوں۔ میں بلا کا مسافر ہوں۔

ناہید۔ (دروازہ میں راستہ روکتے ہوئے) ابھی نہیں۔

کارخانہ دار۔ ایسا مجبور نہ کرو کہ پر لگا کے اڑ جاؤں۔ حالات دیکھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔

جاوید۔ [جوش اور خوشی ملی جلی آوازیں] ایسا نہیں۔ ایسا نہیں۔ ناہید! تم کیا جانو کس کی میزبان ہو۔ اک خواب ساز تمہارا محترم مہمان ہے۔ جو پلک جھپکنے میں جہان گھوم آئے۔ اس نے ابھی ابھی مجھ سے اپنے شاہکار کی مزدوری کا مطالبہ کیا ہے [اپنی اصلی آواز میں] کاش یہ علم ہو۔ کہاں تلاش کی جائے۔

کارخانہ دار۔ جانے سے پہلے کہتا جاؤں کہ ہر عورت کو معلم ہونا چاہئے۔ کہ مردوں کو عقل کی تعلیم دے۔

ناہید۔ [دروازہ کو جھانکتے ہوئے اور باہر جھانکتے ہوئے] چلا گیا۔ کہاں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جاوید۔ میری زندگی کی مرادیں بر آنے کو ہیں۔ ناہید! یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایک عورت کی محبت حاصل کیا چاہتا ہوں۔

ناہید۔ میری دعائیں تمہارے شاملِ حال ہیں۔

جاوید۔ [گاتا ہے]

ہر کہ بہ عشق نیست خوش عمر بباد میدہد
باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد

ناہید۔ ہمیں خوب محنت سے کاروبار چلانا چاہئے۔ کہ کچھ نقدی جمع ہو جائے۔ جو تمہاری شریکِ زندگی کی آسائش میں صرف کی جائے۔" اتنا ناچوں۔ اتنا ناچوں کہ غش آ جائے۔ اور روح پرواز کر جائے۔

جاوید۔ سچ تو ہے۔ لاؤ میں اخبار کے لئے اشتہار ہی لکھ ڈالوں۔

[کاغذ قلم۔ دوات لیکر میز کے پاس بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہے۔]

چند دنوں سے ایک گویا نوٹل شہر میں براجمان ہے۔ جاوید کا گانا ہر اک سے خراجِ تحسین وصول کر رہا

ہے۔ ناہید کا رقص دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بیس سالہ حسین دوشیزہ ہے۔ جس کے بال۔۔۔"
کیسے ہیں ناہید؟

ناہید۔ لمبے لمبے۔ بلا کے لیٹرے۔

جاوید۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ ہر روز تمہیں دیکھوں۔ اور اتنی بھی خبر نہ ہو۔ اچھا۔
بال لمبے لمبے بلا کے لیٹرے اور آنکھیں۔۔۔۔۔۔" کیا لکھوں؟

ناہید۔ انتہائی حسین! جاوید

جاوید۔ "آنکھیں انتہائی حسین" لمبے لمبے۔ حسین۔ میں بھی عجب بیوقوف ہوں!

ناہید۔ وہ کیوں؟

جاوید۔ یونہی سوچ رہا تھا۔ سبھی لڑکیوں کے بال لمبے اور آنکھیں حسین ہوتی ہیں۔

ناہید۔ جی ہاں۔ لیکن ہر کسی پہ دل لٹو نہیں ہوا کرتے۔

جاوید۔ تمہاری آواز میں کس قدر موسیقیت ہے۔ آج تک نہ سمجھا۔ نادانی کی حد ہو گئی!
[جیب سے کارخانہ والی دی ہوئی تفصیل نکالتا ہے۔ اور پڑھتا ہے]

ناہید۔ جاوید! بات کیا ہے۔ ہمیں نہ بتاؤ گے؟

جاوید۔ وہاں روشنی میں کھڑی ہو جاؤ۔

ناہید۔ کچھ پتہ بھی تو چلے بات کیا ہے؟

جاوید۔ کچھ نہیں [تفصیل پڑھتے ہوئے اور ناہید کو بغور دیکھتے ہوئے] آنکھیں کہیں ہم تمہیں چاہتے ہیں۔
بازو کہیں ہم تمہیں ڈھونڈتے ہیں۔ لب کہیں کیوں نہ۔۔۔۔۔۔" ناہید! ناہید! ایسا بھی ہو سکتا
ہے؟ تم کتنے کافر حسن کی مالک ہو۔ تم کتنی بدلی نظر آ رہی ہو۔ میرا یقین ہے کہ تمہارا چہرہ اصل نہیں گلاب
کا پھول تمہارے چہرہ کا روپ لئے ہے۔

ناہید۔ جاوید! تمہیں کیا ہو گیا؟

جاوید۔ محبت۔۔۔۔۔۔ آخر حاصل کر لی یہ دولت۔ تم ابھی نہیں سمجھی۔ اس خیال سے میری روح کو صدمہ ہوتا
ہے۔ کہ تمہیں ہر روز دیکھا کیا۔ اور دماغ تمہارے خوابوں سے خالی رہا۔ ہاں ہاں۔ یہ بھی اس کا دیا اک
حسین خواب ہے۔ میرا دل صبح کی لطافتوں سے معمور ہو رہا ہے۔

ناہید۔ جاوید! جاوید!

جاوید۔ میرے شانوں میں لرزش پیدا ہو چلی ہے۔ اڑا جا رہا ہوں۔۔۔ دور۔۔۔۔ دور۔۔۔۔ تم نہیں جانتی

کر اڑو اور آسمان کی چھت پر بیٹھکر ستارہ میں گاؤ۔

میں ایک عرصہ سے چاند میں بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہوں۔ جاوید! تمہارا تبسم چاہتی ہوں اسے ایک لمبے بوسے میں تبدیل کردو۔

[انتہائی سرور میں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔]

[سر پیچھے جھکائے حقیقی خوشی سے آہ کھینچتے ہوئے] میری روح کو تسکین ہے۔ میرے خواب سچے تھے۔

جاوید: ناہید! آؤ۔ آتشدان کے پاس بیٹھکر آگ تاپیں۔ اور زندگی ایک دوسرے کیلئے وقف کردیں۔

[دونوں آتش دان کو بڑھتے ہیں۔ بیٹھ جاتے ہیں۔ جاوید گاتا ہے]

ہر کہ بعشق نیست خوش عمر بباد میدہد
باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد میدہد

[لمپ جلتے جلتے عاجز آکر بجھ جاتا ہے۔ دہکتے انگاروں کی سرخ سرخ شعاعیں ان کے چہروں پر پڑ رہی ہیں۔ پردے آپ سے آپ بڑھکر انہیں ڈھانپ لیتے ہیں۔]

رباعی

وہ رشک صد بہار آئے نہ آئے
مجھے ہے انتظار آئے نہ آئے
لپٹ کر چوم لے پھولوں کو بلبل
چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

اضطراب

(از جناب نفیس سندیلوی)

اے تڑپنے والے قلب اور مضطرب نگاہوں کیا تم شوریدگیٔ درون کا پتہ دیتی ہو۔ اور انجذاب فطرت کو نمایاں کرتی ہو۔ لیکن تم یہ سمجھتی ہو اور جانتی ہو کہ میں کیا ہوں؟ میں شوریدہ سر ہوں۔ اور مضطرب طبیعت۔ ایک انقلاب پذیر ہستی ہوں۔ اور وجودِ سیماب جو استقلال اور سکون کو جانتا ہی نہیں تم مجھ کو مسرت کی لوریاں دیتی ہو۔ تم مجھکو درسِ محبت سے الگ کرتی ہو۔ لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مضطرب کیوں؟ کیا تم میری ترجمانِ دل نہیں۔ کیا تمہارے اشک میرے لئے دردِ مسلسل کا پتہ نہیں دیتے۔ پھر کیسے میں اپنے اضطراب میں رک سکتا ہوں۔ اور اپنی بے قراری کو کھو سکتا ہوں۔ اور مسرت کے دامن میں خاموش سو جانے کی جرأت رکھ سکتا ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں درد ہوں۔ سوز ہوں۔ اور غمِ حسرت کا نکتہ ہوں۔ حیرت کی تصویر، تم مجھ کو پڑھو، اور دیکھو لیکن تمہارا یہ عمل میری اشک شوئی کیلئے کافی نہیں۔ تم خود میرے دل سے باتیں کرو وہ تم سے کیا کہتا ہے۔ کہ آہ .... میں لامتناہی خیالات کی تصویر ہوں۔ جس کے اندر سوز و گداز مسرت کا فاتحہ پڑھتے ہیں۔ میں ان حسرتوں کا غم ہوں۔ جس پر بیکسی کے سوا کوئی مرثیہ خواں نہیں۔ آہ .... مجھ پر گریہ کرو اور ماتم۔ میں مردہ ہوں۔ لیکن میری حیات کا غم مجھ کو بار بار اضطراب صورت میں لرزا دیتا ہے۔ بس میری تڑپ دیکھو اور اس کا اضطراب۔ تم میرے لئے آبِ تسکین بخش لاؤ۔ لیکن وہ میرے لئے شعلۂ آہ بن جائیگا۔ میں ضعیف ہوں۔ ناتوان ہوں۔ تاہم آتش ہوں اور اس کی پوشیدہ چنگاری تم میرے خاک کے ڈھیر پہ پانی نہ ڈالو۔ میری حرارت پنہاں بخارات بنکر تم کو بھی مضطرب بنا دے گی۔ پس مجھ کو جلنے دو پھلنے دو اور اڑنے دو۔ کیونکہ میں مضطرب قلب ہوں۔ اور نامتسکن طبیعت جو خود وفورِ غم کی ایک تصویر ہے۔ اور دوسرے کی دماغی فضا میں اپنا عکس کھینچ کے اپنا بنا لیتی ہے۔ بس ہٹو جاؤ میرے قریب نہ آؤ۔ اور مجھ کو مسرور نہ بناؤ۔ کیونکہ میں تو آتش ہوں۔

اے محبت آثار الجھانے والی زلفِ چلیپا تم مجھ کو اسیرِ دامِ گیسو نہ بناؤ۔ کیونکہ میں تڑپ کر نکل جاؤنگا۔ میں وجودِ مجسم نہیں بلکہ اضطراب کا مرقع اور شوریدگیوں کا مخزن ہوں۔ اٹھتا ہوا غبار ہوں۔ اور اڑتا ہوا شہرۂ حسن جو نہ کسی کی گرفت میں آیا ہے۔ اور نہ کسی کا مقید بنا ہے۔ پس مجھ کو بچھلنے دو۔ کیونکہ میں مضطرب لہروں کا دام ہوں۔ اور وفورِ غم کا سمندر جس کے اندر مصائب کا تلاطم برپا رہتا ہے۔ اس لئے تم اپنے گرہوں کو کشادہ کردو۔ اور میری گرفتاری کیلئے پھندے نہ بناؤ۔ میں ایک عقدۂ لاینحل ہوں جو کسی سے بندھ سکا ہے۔ اور نہ کھل سکا۔ کیونکہ میں کوئی تصویر نہیں جو دیکھا جا سکوں۔ اور کوئی ذات نہیں جو چھوا جا سکوں۔ بلکہ اضطراب ہوں اور مجسم اضطراب۔

آہ .... خاکِ گم گشتگانِ فنا کہیں میں ہی تو نہیں ہوں۔ شعلۂ جانکاہ کہیں مجھکو تو نہیں کہتے ہیں۔ بگڑی تقدیر اور مٹا ہوا حسن میں ہی تو نہیں کہلاتا ہوں جو متلاشی

مسرت لرزاں اور مضطرب ہے۔

جب میدان نجد میں قیس کا نشان ملا تو وہ میرا نام تھا۔ جب وادیٔ ناکامی میں فرہاد کا عشق بیان کیا گیا تو وہ میری داستان تھی۔ جو میدان گمنامی میں پنہاں اور پوشیدہ تھی۔

مصر کی حکومت حقیقتاً قصہ ہے۔ یوسف و زلیخا کا جو تجسم ہو گیا ہے میری صورت میں۔ اور گویا ہے کہ زندہ میں ہی شان و شوکت تھا۔ اور میں ہی ناکامی سوز محبت پھر کسی نے مجھکو پایا اور کسی نے نہیں۔

میں انقلاب کا مرقع ہوں، میں شورش بزم جہاں ہوں۔ میں التہاب غم کی تصویر ہوں۔ اور ناکامی زندگی کا قرار میں ہجوم یاس ہوں۔ اور کرشمہ نامرادی۔ میں رہین منت کش بلائے محبت ہوں۔ اور بے درماں۔

آہ.......... بہت ہی آندھیاں چلیں۔ اور بہت سے باد مخالف کے جھونکے آئے۔ لیکن تیرا عارضی جسم مضطرب ہوا۔ ڈگمگایا۔ مگر کشتی مراد کی طرح ساحل مراد پر جاتا رہا۔ لیکن ہنوز میری منزل مراد دور ہے۔ اس لئے میں روانی اضطراب ہوں۔ رفتار بیقرار ہوں۔ برق بیتاب ہوں۔ اور ہمیشہ تمہاری سامنے مجسم ہوں۔ اور غیر مجسم۔ کیونکہ میں درد بصورت آہ ہوں۔ جو جگنو کی طرح چمکتا اور بیر بہوٹی کی طرح ساکت ہے۔ دیوانگی الفت اور نزاکت خیال دونوں کی صورت اگرچہ کچھ تصور کی جا سکتی ہے۔ تو وہ میرا مضطرب افسانہ ہے۔ اور میرا اضطراب پذیر وجود

جو کھویا ہوا ہے۔ اور بھولا ہوا ہے۔ اپنی حیات جاوداں کو۔

اگرچہ یہ سب خیالات ایک اضطرازی صورت میں میرے وجود کی حیات کی بیان کی جانے والی داستان ہے۔ تاہم میں کہیں اس سے زیادہ لطیف اور شررانگیز ہوں۔ اگر مجھکو ماہیٔ بے آب کی ترکیب کہو تو غلط نہیں۔ اور سیماب مضطرب کا عکس نیز تو بیجا نہیں۔ تتری کی پرواز اور جگنو کی چمک سے تشبیہ دو تو بیجا نہ ہوگا۔

لیکن آہ.......... مجھے سوز دروں کی جلتی ہوئی راکھ نہ بناؤ۔ کیونکہ میرے اندر آتش سوز پنہاں ہے۔ جو خود جلکر تم کو بھی جلا دیگی۔ اور میری طرح ایک شعلۂ مضطرب کا لقب دیگی۔

رباعی

مرا مثل نسیم آوارہ کردند!
دلم مانند گل صد پارہ کردند
نگاہم راکہ پیدا ہم نہ بیند
شہید لذت نظارہ کردند

(اقبال)

ارشادات

محترم حضرت مرزا احمد شاہ بیگ جوہر مرادآبادی
"یادگار حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ"

چبھا پڑتا ہے دل مژگانِ چشمِ یار پر کیا کیا
مزے منصور کو آتے ہیں نوکِ دار پر کیا کیا

پسا جاتا ہے سُرمہ چشمِ مستِ یار پر کیا کیا
بلا ہوتی ہے نازل مردمِ بیمار پر کیا کیا

سُنا کرتا ہے گوشِ گل سی منہ سے کچھ نہیں کہتا
تراشے جاتے ہیں الزام ناحق خار پر کیا کیا

ہے لُطفِ انکار پر انکار میں قندِ مکرر کا
مزے آتے ہیں ہم کو یار کی تکرار پر کیا کیا

کوئی نقطہ تو۔ کوئی دیدۂ عنقا بتاتا ہے
گماں ہیں نکتہ سنجوں کے دہانِ یار پر کیا کیا

گلوں کا سب کو رونا ہے مگر کوئی نہیں کہتا
خزاں کی فصل میں گذری چمن میں خار پر کیا کیا

نفس کا کھیل ہے سارا تماشا گاہِ ہستی میں
تماشا کر رہی ہیں پُتلیاں اس تار پر کیا کیا

ادھر چلمن ہے در پر اُس طرف چہرہ پہ برقع ہے
جفائیں ہو رہی ہیں طالبِ دیدار پر کیا کیا

نہیں چھوٹے سماتے وعدۂ فردا پہ اے جوہر
خدا جانے کہ برپا حشر ہو دیدار پر کیا کیا

منقولات بدیہا حاجی سرحدی

۱۳ ــــ ھ ــــ ۵۳

(۱)

اے مظہرِ صد نکتۂ تنویرِ معانی　　اے کاشفِ صد جلوۂ اسرارِ نہانی
خاموشیٔ تو باعثِ خاموشیٔ عالم　　گفتارِ تو صد مظہرِ تحقیق بیانی

(۲)

تو تماشا ہے تو عالم کو تماشائی کر　　ایک گوشہ سے نکل انجمن آرائی کر
خواہشِ جلوۂ نیرنگیٔ دنیا کب تک　　خود تماشا ہو تو عالم کو تماشائی کر
حق رسی جلوۂ کثرت سے گذر جاتا ہے　　دل کو ہر شکل سے وحدت کا تمنائی کر
بیخودی ساتھ لے اور وقفِ تجسس ہو جا　　ذوقِ منزل سے گذر بادیہ پیمائی کر
رکھ خودی پر نہ نظر بلکہ خدا بیں ہو جا　　چھوڑ باطل طلبی حق سے شناسائی کر
توڑنا دل کا بہر شکل برا ہوتا ہے　　تو دل آزار نہ بن حوصلہ افزائی کر

کھل ہی جائیگا کبھی رازِ حرم اے حاجی
درِ حضرت پہ تو جا ناصیہ فرسائی کر





مرحوم ملا حاجي سرحدی

چاندنی رات اور خواب نوشیں

(حضرت جوش ملیح آبادی)

چودھویں مرگ ناگہانی ہے — چاندنی رات کی جوانی ہے
ہاتھ تخیّل کا رباب پہ ہے — چاندنی سادگی شباب پہ ہے
چشمِ اہلِ نظر میں ہیں آنسو — بھینی بھینی ہوا میں ہے خوشبو
نازشِ عالمِ شباب کوئی — فرشِ گل پر ہے محوِ خواب کوئی
خوش نما نقش ہے نگینے پر! — ہاتھ رکھا ہوا ہے سینے پر
سانس لینے سے ہونٹ ہلتے ہیں — سرد جھونکے ہیں پھول کھلتے ہیں
نیم وا آنکھیں حشر کا ساماں — زیرِ مژگاں وہ سایۂ مژگاں
صحنِ گلشن میں حسن کی ضو ہے — پھول پر چاندنی کا پرتو ہے
روئے شفاف پر ہے خواب کا رنگ — یا صراحی میں ہے شراب کا رنگ
رخ پہ لہریں سی ہیں تلاطم ہے — ہائے کیا نیند کا تبسم ہے
زلف بکھری ہوئی قیامت ہے — جھٹپٹے وقت کی سی صورت ہے
کچھ سیاہی ہے کچھ درخشانی — زلف سے چھپ گئی ہے پیشانی
حسن ڈوبا ہوا ہے صنعت میں — کیا تناسب ہے نور و ظلمت میں
لو ہے رخ کی برق پاشی میں — صبح کیا ہو رہی ہے کاشی میں
لوٹتی ہے زمین پر چادر! — سر ہے تکیے کے ایک گوشے پر
رخ نے چمکا دیا ہے گلشن کو — چاندنی چومتی ہے گردن کو
روئے رنگیں و گیسوئے برہم — نیند میں ہائے حسن کا عالم
بے کہے گو میں رہ نہیں سکتا — پھر بھی لفظوں میں کہہ نہیں سکتا

جوش اس وقت کوئی کام نہ کر
غور سے دیکھ اور کلام نہ کر

غزل

(خان بہادر رضا علی خان وحشت مدظلہ)
پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ

نہ منزل کا پتا ہم کو نہ مقصد کی خبر ہم کو
ہوائے کوئے جاناں لیچلی آخر کدھر ہم کو

ترس کھا کر اشارہ کرتی ہے اسکی نظر ہم کو
کہ مایوسی بہت ہو جب تجھے تو یاد کر ہم کو

گلستان ازل سے کس کا سودا سر میں لائے تھے
کہ بازار جہاں میں جستجو تھی عمر بھر ہم کو

ہماری چشم حسرت کا بھی کچھ پیغام سنتا جا
چلا ہے تو تو اے قاتل تڑپتا چھوڑ کر ہم کو

مثال ابر امڈے ہی چلے آتے ہیں اشک اپنے
ڈراتی رہتی ہے گو آپ کی برق نظر ہم کو

ہمارے عقدۂ مشکل کے حل ہونے کا ایما ہے
پس از تاریکی شب جلوۂ نور سحر ہم کو

نہیں ڈرتے ہیں ہم وحشت جو واعظ کے ڈرانے سے
بھروسا ہے کچھ ایسا ہی کسی کے قول پر ہم کو

تجلیاتِ اُفق

(جناب میر اُفق کاظمی مدظلہ العالی)

دلِ بیتاب میں پنہاں قیامت خیز نالے ہیں
اسے ہم کیا سنبھالے ہیں کہ عالم کو سنبھالے ہیں

بہار آئی ہے بالِ شوق نے پھر پر نکالے ہیں
قفس کو توڑ کر اب ہم فضا میں اُڑنے والے ہیں

گلستانِ جہاں کے رنگ بھی یارب نرالے ہیں
اِدھر ہیں قہقہے گل کے اُدھر بلبل کے نالے ہیں

جگر میں درد ہے آنکھوں میں سوزش دل میں چھالے ہیں
مگر شرمِ محبت سے ابھی تک ضبط نالے ہیں

تجھے اے سوزِ پنہانِ محبت آگ لگ جائے
جو نقشِ آرزو تھے میرے دل میں اب وہ چھالے ہیں

خدا جانے حیاتِ دائمی ملتی تو کیا ہوتا
ہم اپنی چند روزہ زندگی پر مرنے والے ہیں

نکل پڑتے ہیں آنسو گلستاں میں خندۂ گل پر
مرے جذبات بھی جذباتِ عالم سے نرالے ہیں

بہا لیجائیں گے سیلاب بن کر کشتیٔ دل کو
یہی وہ اشکِ غم جو میں نے آنکھوں سے نکالے ہیں

حجاب چہرۂ انور اٹھا اے شاہدِ وحدت
بڑے جھگڑے جہاں میں ظلمتِ کثرت نے ڈالے ہیں

یہ سب گلکاریاں ہیں اے اُفق تخمِ محبت کی
شگفتہ میرے دل میں داغ ہیں صحرا میں لالے ہیں

پیغام

(محترم جناب حضرت طالبؔ دہلوی مدظلہٗ)

بے ثباتی اور جذبات فریبِ التفات
اک مبہم سا معمہ ہے طلسمِ کائنات

دلکشی دنیا کی کچھ سیلِ رواں سے کم نہیں
غم ہیں لاکھوں اور پھر دیکھو تو کوئی غم نہیں

خاک کے ذرّوں میں گلکاری ودیعت دیکھئے
اور ہر اک گل میں اسرارِ نزاکت دیکھئے

ذرّے ذرّے پر تغیر یوں اثر انداز ہے
کارفرما جیسے کوئی صاحبِ اعجاز ہے

تیرہ قسمت اپنی قسمت کو بدلتے ہیں کبھی
خشک ہو جاتے ہیں جو چشمے ابلتے ہیں کبھی

وہ فریبِ حسن جس پر عشق ہوتا ہے نثار
ایک دن ہو جاتی ہے نذرِ اجل اس کی بہار

تھی سبق آموزِ عشرت جن کی کل تک زندگی
آج ہے نابود ساری اُن کی وہ تابندگی

جن کے سر اک روز ہوتے ہیں مزیّن تاج سے
پست ہو جاتے ہیں آخر موت کی افواج سے

نازپرور مادرِ گیتی کے مفلس تنگدست
مفلسی کی گود کے پالے ہوئے دولت میں مست

ہیں سراپا جو کہ پتلے عقل اور ادراک کے
درحقیقت ہیں فقط یہ چند ذرّے خاک کے

جن کے ایوانوں میں طوطی بولتے تھے بیشمار
فاتحہ کے واسطے محتاج ہیں اُن کے مزار

بن سنور کر خاک کے ذرّے ابھرتے ہیں کبھی
اور یہ موتی خاک ہو کر پھر بکھرتے ہیں کبھی

باوجود اس کے زمانے کی طبیعت ہے وہی
ہے وہی قانونِ قدرت اور فطرت ہے وہی

ہمسفیرانِ چمن بیدار ہو بیدار ہو
قیدِ ہستی سے رہائی کے لئے تیار ہو

امتحاں گاہِ جہاں میں یوں گذارو زندگی
جس کی اوروں کیلئے باقی رہے تابندگی

چند روزہ زیست اور محوِ خیالِ خام ہو
کام کر جاؤ کوئی ایسا کہ نیک انجام ہو

یہ نگارستانِ عالم یہ فریبِ روزگار
یہ نظر افروز منظر گردشِ لیل و نہار

یہ حیاتِ چند روزہ یہ طلسمِ ہست و بود
کارگاہِ ظاہری یہ عالمِ بزمِ شہود

یہ ستارے یہ ثوابت یہ طلسمی سبزہ زار
ایک دن ہو جائیں گے قدرت کے جلووں پر نثار

بیچ دو جان اور حیاتِ جاودانی مول لو
جو نہ ہو فانی وہ طالبؔ زندگانی مول لو

خوابِ خیال

(محترم جناب علامؔ صاحب مدظلہٗ)

فسونِ شب ہے مجسّم کئے فسانے ہیں
خموشیوں میں محبت بھرے ترانے ہیں

ہے دہیما دہیما سا کمرے میں نور پھیلا ہوا
جلو میں جس کے فسون زا نگار خانے ہیں

ہجومِ رنگ و ضیا میں ہیں گم حواس میرے
لباس حال میں گذرے ہوئے زمانے ہیں

سرک رہا ہے کسی مست ناز کا آنچل
سماعتوں میں لرزتے ہوئے ترانے ہیں

گھرا ہوا ہوں میں اُنکے حسین جلووں میں
محیط مجھ پہ مہکتے ہوئے فسانے ہیں

تصوّرات پہ ہر چند ہے مدارِ حیات
یہ خواب، راحت دل کے مگر بہانے ہیں

گذر چکی ہیں جو راتیں خوشی کی اُنکے عوض
خبر نہیں اُنہیں کتنے فریب کھانے ہیں!

تبرکات

(مولانا عبد المجید سعدی سرحدی پروفیسر ایڈورڈز کالج پشاور)

ہم نہ تھے جب حسنِ جاناں کی چمن میں کچھ نہ تھا
جب نہ تھی بلبل تو گل کی پیرہن میں کچھ نہ تھا

بزمِ امکاں کی تھی رونق میرے ہی دم سے فقط
مچ گئیں آنکھیں مری پھر انجمن میں کچھ نہ تھا

برگِ گل ہیں باغ میں جو جا بجا بکھرے ہوئے
میرے دل پارے ہیں دامانِ چمن میں کچھ نہ تھا

ہے کسی محمل نشیں کی زلفِ مشکیں کی مہک
نافۂ آہوئے صحرائے ختن میں کچھ نہ تھا

شورشِ لیلیٰ تھی مضمر اے صدائے سازِ قیس
کوہکن تھا شوقِ شیریں کوہکن میں کچھ نہ تھا

بند مرقد میں کھلے جب اس شہیدِ ناز کے
حسرتیں لپٹی ہوئی تھیں اور کفن میں کچھ نہ تھا

شمع کی دیکھی سحر جب ہم نے شامِ زندگی
چند قطرے آنسوؤں کے تھے لگن میں کچھ نہ تھا

رات تھا اک حشر برپا بزمِ ساقی میں مگر
صبح کے ہوتے ہی ہوتے انجمن میں کچھ نہ تھا

خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی

(از جناب سراج الدین صاحب ظفر بی۔اے۔ لاہور)

تاریخ غزل گوئی میں آج تک کوئی خواجہ حافظ کا ہمسر نہیں ہو سکا آپ کی شاعری نے تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مقبولیت حاصل کی کہ ایشیا تو ایشیا یورپ میں بھی آپ کے معتقد پیدا ہو گئے۔ چنانچہ متعدد علمائے مختلف زبانوں میں دیوان حافظ کے ترجمے اور شرحیں کیں۔ لیکن افسوس کہ یہ ایسی ہے دنیا اس شاعر باکمال کے حالات زندگی سے بہت کم واقف ہوئی۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے خواجہ صاحب کے سوانح حیات لکھے ہیں۔ مگر اس قدر مختصر کہ ان کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ ایک شاعر کے کلام سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوا کیونکر زندگی بسر کی۔ اور کن واقعات نے اس کی شاعری کو اس کا مخصوص رنگ دیا۔

خواجہ صاحب کے آبا و اجداد توئی سرکان کے رہنے والے تھے۔ توئی سرکان کسی وقت مضافات اصفہان میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیکن اب انقلاب زمانہ کے ہاتھوں صفحۂ دنیا سے نیست و نابود ہو چکا ہے۔

اُن کے جد امجد جن کا نام تاریخ کے صفحوں پر موجود نہیں ہے۔ ایک بلند پایہ تاجر تھے۔ وہ اتابکان شیراز کے زمانے میں تجارت کے سلسلہ میں شیراز آئے۔ اور کاروبار میں فائدہ دیکھ کر مستقل طور پر وہیں مقیم ہو گئے۔

خواجہ صاحب کا سن پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا۔ تخمیناً وہ ۷۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام بہاءالدین تھا۔ اور ان کا خاندان دولتمندوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

خواجہ صاحب کے دو بھائی تھے۔ مگر عیش و عشرت کے از حد دلدادہ۔ والد کے مرنے کے بعد تجارت کا انتظام کوئی بھی نہ کر سکا۔ اور سب پونجی چند روز میں ختم ہو گئی۔ آخرکار وہ دونوں تلاش معاش میں نہ جانے کہاں چلے گئے۔ لیکن خواجہ صاحب چونکہ کمسن تھے اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے۔ جب گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آئی تو ماں نے ان کو محلے کے ایک آدمی کے ہاں ملازم کرا دیا۔ وہ شخص بڑا بد اطوار تھا۔ اس لئے جب خواجہ سن شعور کو پہنچے تو اس کی ملازمت ترک کر دی۔ اور خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔

محلہ میں ایک مدرسہ بھی تھا جس میں لڑکے پڑھا کرتے۔ لڑکوں کو دیکھ کر آپ کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا ہوا اور اس میں داخل ہو گئے۔

وہ رات گئی تک خمیر گوندھتے اور صبح سویرے مدرسے چلے جاتے خمیر میں جو کچھ کماتے اس کا ایک تہائی ماں کو اور ایک تہائی علم کو اور باقی خیرات کر دیتے۔

آپ نے دو سال میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور اسی نسبت سے جب شاعری شروع کی تو حافظ تخلص رکھا۔
اس کے بعد آپ مولانا شمس الدین محمد عبداللہ کے شاگرد ہوئے۔ اور ان سے فقہ تفسیر منطق فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔
استاد نے شاگرد کی ذہانت سے متاثر ہو کر اپنا لقب شمس الدین انہیں عنایت کیا۔ اور ہمیشہ خواجہ صاحب پر نظر خاص رکھی۔
اس زمانے میں سعدی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خواجہ صاحب اکثر ایک بزاز کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ بزاز شاعر تھا۔ اس لئے اس کے پاس سخن شناسوں کا مجمع رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کے دل میں بھی شاعری کا شوق گدگدایا۔ مگر طبیعت موزوں نہ تھی۔ اس لئے تُک بند مشہور ہو گئے۔ لوگوں کو تفریحِ طبع کا سامان ہاتھ آگیا۔ محفلوں میں بلاتے اور ان کی لغو گوئی سے لطف اٹھاتے۔

جب ان کا مذاق حد سے گذر گیا تو خواجہ کو بھی احساس ہوا۔ ایک دن نہایت رنجیدہ ہو کر بابا کوہی کے مزار پر گئے۔ اور دیر تک روتے رہے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ امیر علیہ السلام کچھ کھانے کو دے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جا تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند ٭ وندر اں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے پھر پکڑ لیا۔ کہ شعر سناؤ۔ آپ نے یہی غزل پڑھی۔ لوگ حیران ہو گئے۔ اور سمجھے کسی سے لکھوا کر لائے ہیں۔ امتحان کے لئے طرح دی۔ اس پر بھی عمدہ غزل ہوئی۔ پھر کیا تھا۔ گھر گھر اس بات کا چرچا ہو گیا۔
شیراز میں اس وقت ابو اسحاق حکمران تھا۔ یہ بڑا قابل اور فاضل حاکم تھا۔ خود شاعر تھا۔ اس لئے شاعری کی اس کے دربار میں بڑی عزت تھی۔ انتظام ملک اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر عیش و نشاط کے ہر طرف چرچے تھے۔
ابو اسحاق کا وزیر قوام الدین حسن خواجہ صاحب کا دوست تھا۔ اس نے ان کو ایک اسلامیہ مدرسہ میں مدرسی پر مامور کیا جہاں وہ قرآن اور فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔
۷۵۴ھ میں محمد مظفر نے ابو اسحاق پر چڑھائی کی۔ ابو اسحاق عیش و عشرت میں مشغول تھے۔ غنیم شہر پناہ کے تلے آپہنچا۔ مگر کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ بادشاہ کو آگاہ کر کے عیش و عشرت میں مخل ہوتا۔
آخر امین الدین نے جو اس کا مقرب خاص تھا کہا: حضور کبھی بالاخانہ سے شہر کو تو دیکھیں۔ جوش بہار سے لالہ زار بن رہا ہے۔ ابو اسحاق نے جا کر دیکھا تو چاروں طرف فوج ہی فوج تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ امین الدین نے عرض کی۔ جہاں پناہ! محمد مظفر کا لشکر ہے۔ مسکرا کر کہا: مظفر واقعی احمق ہے۔ کہ ایسے موسم میں بھٹکا بھٹکا پھر رہا ہے۔ اور یہ شعر پڑھ کر نیچے اتر آئے ؎

بیا تا یک امشب تماشا کنیم ٭ چو فردا شود فکرِ فردا کنیم

مظفر نے شیراز فتح کر لیا۔ اور ابو اسحاق قتل کر دیا گیا۔ خواجہ صاحب کو مدت تک اس کے مرنے کا صدمہ رہا۔ چنانچہ

فرماتے ہیں ؎

راستی خاتم فیروزہ بو اسحاقی ٭ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

محمد مظفر کو اس کے بیٹوں نے سازش کر کے جلد ہی معزول کر دیا۔ اور آنکھوں میں گرم سلائیں پھروا دیں۔ جلال الدین شجاع ابن مظفر اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ عالم و فاضل تھا۔ اس لئے عالموں کا قدردان تھا۔

خواجہ صاحب اس کی تخت نشینی پر بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش ٭ کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

اس زمانہ میں خواجہ فقیہہ عمادی ایک باکمال بزرگ تھے۔ شجاع ان کا بڑا معتقد تھا۔ خواجہ عمادی کے پاس ایک بلی تھی۔ اور مشہور تھا کہ وہ ان کے ساتھ نماز پڑھتی ہے۔ حافظ نے اس کے متعلق لکھا ؎

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد ٭ بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اے کبک خوش خرام کہ خوش می روی بناز ٭ غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

شجاع یہ اشعار پڑھ کر بہت ناراض ہوا۔ اور ایک دن خواجہ صاحب کو کہا کہ آپ کی کوئی غزل ہموار اور یکساں نہیں ہوتی۔ خواجہ صاحب نے نہایت بے باکی سے کہا۔ جہاں پناہ باایں ہمہ میرا کلام دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے شاعروں کی شہرت شہر سے باہر بھی نہیں نکلتی۔

شجاع کو اس گستاخانہ جواب سے بہت ملال ہوا اور کشیدگی بڑھ گئی۔ خواجہ صاحب کا مشہور شعر ہے ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ٭ آہ اگر از پس امروز بود فردائے

شجاع نے کہا۔ اس میں قیامت کا انکار ہے۔ خواجہ صاحب کی طلبی ہوئی۔ آپ نے اس سے پہلے ایک شعر کا اضافہ کر دیا ؎

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت ٭ بادف و بربط و نے مغبچہ ترسائے

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ٭ آہ اگر از پس امروز بود فردائے

اب یہ مغبچہ ترسا کا قول تھا اور نقل کفر کفر نباشد۔

شاہ شجاع نے سنہ ۷۸۶ھ میں انتقال کیا۔ اور اس کے بعد زین العابدین تخت نشین ہوا۔ یہ شہزادہ حسن و جمال میں یوسف زمانہ مگر کم فہم اور ظالم تھا۔

چنانچہ خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

چہ قیامت است جاناں کہ بعاشقاں نمودی
رخ ہمچو ماہ تاباں دل ہمچو سنگ خارا

۷۸۶ھ میں امیر تیمور فارس پر حملہ آور ہوا۔ زین العابدین بھاگ کر اپنے چچا منصور کے پاس پناہ گزین ہوا لیکن بزدلی کے جرم میں نظر بند کر دیا گیا۔

قیام شیراز کے دوران میں تیمور نے خواجہ صاحب کو طلب کیا اور کہا میں نے تمام عالم اس لئے ویران کیا کہ سمرقند بخارا کو مالا مال کروں۔ جو میرا اصلی وطن ہے۔ لیکن تم اسے معشوق کے ایک تل کے عوض میں دینے پر آمادہ ہو۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را - بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے عرض کی جہاں پناہ کیا کہوں۔ انہیں فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی ہے۔

شہزادہ نصر الدین یحییٰ نے چونکہ گردن تسلیم خم کر لی تھی۔ اس لئے تیمور نے اسے حاکم شیراز مقرر کر دیا۔ ادھر تیمور واپس ہوا۔ ادھر اس کے دوسرے بھائی منصور نے اس پر لشکر کشی کر دی۔ اور شیراز پر قابض ہو گیا۔ شاہ منصور بڑا فیاض اور قابل حاکم تھا۔ اور خواجہ صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔

خواجہ صاحب نے ۶۵ ۔ ۷۰ سال کی زندگی میں سات بادشاہوں کے عروج اور زوال دیکھے۔ آپ شیراز سے بہت کم باہر نکلے۔ اور یزد، کرمان، اصفہان اور بغداد تک ہی ان کی سیاحت محدود رہی۔

خواجہ صاحب کے زمانے میں دہلی کے تخت پر فیروز شاہ تغلق دکن میں محمود شاہ بہمن بنگال میں غیاث الدین اور بغداد میں احمد بن اویس حکمران تھے۔ حسن اتفاق سے یہ تمام شعرا کے قدردان اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ خواجہ صاحب کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ ہر طرف سے دعوت نامے آنے شروع ہوئے۔

بغداد کے فرمانروا سلطان احمد بن اویس نے آپ کو بار بار بلایا۔ خواجہ صاحب بھی جانا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی وجوہات سے نہ جا سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

رہ نبردیم بمقصود خود اندر شیراز ❊ خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

محمود شاہ بہمن صاحب کمال بادشاہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کی قدردانیوں کے متعلق سنا تو دکن کے سفر کا خیال ہوا۔ یہ خبر جب میر فضل اللہ صدر دربار محمود کو پہنچی تو زاد راہ بھیجکر طلب کیا۔ خواجہ صاحب اس روپیہ سے کچھ بھانجوں کو اور کچھ قرضخواہوں کو دیکر باقی سے سامان سفر کر کے روانہ ہوئے۔ مقام لار میں پہنچے۔ تو ایک مفلس دوست مل گیا۔ آپ نے تمام روپیہ اسے دیدیا۔ اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے۔ اتفاقاً خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی جو مشہور تاجر تھے۔ ہندوستان آرہے تھے۔ وہ خواجہ صاحب کو ساتھ لیجانے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ جب قافلہ ہرمز پہنچا۔ اور سب کشتیوں میں بیٹھ گئے۔ تو اتفاق سے ہوا کا طوفان نمودار ہوا۔ حافظ صاحب فوراً کشتی سے اتر آئے۔ اور سمندر کے سفر سے توبہ توبہ کرتے شیراز واپس آگئے۔

سلطان غیاث الدین فرمانروائے بنگالہ نے بھی حافظ کے کلام سے مستفیض ہوتا چاہا۔ اور طرح کا یہ مصرع بھیجا ؏

ساقی حدیث سرو گل ولالہ سے رود

درحقیقت سرو۔ گل و لالہ تین لونڈیاں تھیں جنہوں نے بادشاہ کو کسی بیماری کے بعد غسل صحت دینے کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان لونڈیوں کی یہ غیر معمولی عزت افزائی دیکھکر بیگمات کو بھی رشک ہوا۔ چنانچہ انھیں ازراہِ تحقیر غسالہ کا خطاب دیدیا۔ حافظ نے اس پر یہ غزل لکھکر بادشاہ کو بھیجدی ؎

ساقی حدیث سرو گل و لالہ می رود ؛ وین بحث باثلاثہ غسالہ می رود

کئی تذکروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ کہ حافظ دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو بچپن میں ہی مرگیا۔ لیکن دوسرا پروان چڑھا۔ اور ہندوستان میں آیا اس کا نام شاہ نعمان تھا۔ اس کی وفات ہندوستان میں ہی ہوئی۔ چنانچہ برہان پور میں قلعہ اسیر کے پاس اس کا مزار اب بھی موجود ہے۔ خواجہ صاحب نے ۷۵۔۷۶ سال کی عمر میں وفات کی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا جنازہ حرام ہے۔ کیونکہ اس کے اشعار میں اکثر کفر ہوتا ہے۔ کسی نے حافظ کا دیوان منگا کر استخارہ کیا۔ تو یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازہ حافظ ؛ کہ گرچہ غرقِ گناہ ہست میرود بہ بہشت

پھر کیا تھا جنازہ پر خاص و عام کا ہجوم ہوگیا۔ شہر کے تمام امیر و وزیر حتیٰ کہ خود سلطان منصور جنازہ میں شریک ہوا۔

خواجہ صاحب کو خاک مصلیٰ عزیز تھی۔ لہٰذا وہیں دفن ہوئے۔

۸۵۵ھ میں جب سلطان بابر بہادر نے شیراز فتح کیا تو اس کے وزیر محمد معمائی نے خواجہ صاحب کا مقبرہ تیار کروایا۔ اور ہفتہ میں ایک خاص دن زیارت کے لئے مقرر کیا۔ اب تک لوگ اس روز وہیں دن بسر کرتے ہیں۔ شراب کے دور چلتے ہیں۔ اور خواجہ صاحب کا حصہ زمین پر گرایا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے کئی برس پہلے کہدیا تھا ؎

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ ؛ کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ایک روز میرے والد کے روبرو ایک شخص نے کہا۔ کہ میں شیراز میں سیاحت کے لئے گیا۔ خواجہ کے مزار پر میلہ لگا ہوا تھا۔ شام تک مجلس سرود و سماع رہی۔ اس کے بعد سب چلے گئے لیکن میں وہیں رہا اور کہا اے خواجہ آپ کا مہمان ہوں بھوکا ہوں۔ اور زادِ راہ بھی پاس نہیں۔ آدھی رات گذری تو دو آدمی مشعل لئے ہوئے آئے میں ڈرا لیکن وہیں کھڑا رہا۔ ایک نے قریب آکر کہا اے خواجہ کے مہمان خواجہ نے عالم خواب میں مجھے حکم دیا ہے۔ کہ میں تمہاری مدد کروں۔ چنانچہ ایک خوان اور پانچ اشرفیاں دیکر چلا گیا۔

خواجہ صاحب کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب نہ ہو سکا - بلکہ یہ کام بعد وفات ان کے ایک معتقد مرزا گل اندام نے انجام دیا - دیوان کی ترتیب حروف تہجی پر بطریق قدیم ہے - مگر ب - چ - ژ - ڈ - اور گ کی ردیفیں نہیں - انہی کے کلام حافظ میں خسرو سعدی سلمان ساوجی خواجو حافظ حلوانی شیرازی اور اہلی کا کلام بھی مخلوط ہو گیا ہے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک ترکی حاکم نے اس بات کو محسوس کیا اور قلمی نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے الحاقی کلام نکال دیا۔ مرزا محمد گل اندام دیباچے میں لکھتے ہیں - کہ قرآن کی تعلیم - شاہی ملازمت ، اشعار شعرائے ادب کی جستجو سے خواجہ صاحب کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ اپنا دیوان زندگی میں مرتب کر سکتے - اس عبارت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کا زندگی بھر کیا مشغلہ رہا - حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب نہایت پرہیزگار رہتے - وہ یا تو درس و تدریس میں دیکھے جاتے۔ یا زہد و عبادت میں - جو لوگ آپ کو رند مشرب سمجھتے ہیں وہ عشق حقیقی اور مجازی میں تمیز نہیں کر سکتے - ساقی مے فروش رباب و چنگ - عیش مستی - میخانہ شراب کا مفہوم مکتب تصوف کا ابجد خوان بھی بتا سکتا ہے - کلام حافظ میں کئی ایسے شعر موجود ہیں - جو کسی صورت تصوف کے زمرے میں نہیں آ سکتے - لیکن یہ ان کا اپنا رنگ نہیں بلکہ دوسروں کی تقلید میں لکھے گئے ہیں - خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں - لیکن ان کا اصل اعجاز غزل گوئی ہے - فارسی شاعری باوجود ہزاروں اوصاف کے جوشِ بیان سے خالی تھی - لیکن خواجہ صاحب کے کلام میں اتنا جوش ہے کہ ایک عالم پر چھا جاتا ہے -

سوز آہ سینۂ سوزان من ÷ سوخت ایں افسردگان خام را
ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم ÷ از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

خواجہ صاحب پر مستی کا جذبہ غالب تھا -

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما ÷ مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم ÷ اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دنیا کی شان و شوکت ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ رکھتی تھی -

بنفشان جرعہ بر خاک و حال اہل شوکت بیں ÷ کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارم

جوش کے علاوہ بدیع الاسلوبی نے کلام کو اور دل آویز کر دیا ہے - جو مضامین مدتوں سے بندھتے آئے ہیں خواجہ صاحب نے اس خوبی اور جدت سے باندھے ہیں - کہ ان کو لطیف تر کر دیا ہے

معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا عام خیال ہے - مگر خواجہ صاحب کی جدت پسند طبیعت اسے یوں ادا کرتی ہے ؎

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد ÷ صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

معشوق کے انتخاب پر نازاں ہونے کا مضمون ملاحظہ ہو ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من ÷ کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

خواجہ صاحب کا کلام عشقیہ شعروں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر ان میں یاس کا رنگ ہرگز موجود نہیں۔ وہ شگفتہ مزاج تھے اور کسی کے پیچھے زندگی برباد کرنے کے مضامین سے گریز کرتے تھے۔ معشوق کو دیکھکر خوش ہونا اس کو پاس بٹھا کر ہمکلام ہونا زیادہ سے زیادہ گلے سے لگا کر باہیں گردن میں ڈال لینا ان کا عشق تھا۔ اور اس میں بھی پاکدامنی کی شرط ضرور تھی۔

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن ❊ منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

وہ عشق کے سرد و گرم سے واقف تھے۔ اور ہر واردات کو نرالے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ بعض دفعہ عاشق معشوق کے ناز و ادا سے تنگ آکر کہتے ہیں کہ محبوب ناز نہ کرو۔ دنیا میں تجھ سے ہزاروں حسین موجود ہیں۔ معشوق اس سے آگاہ ہے۔ مگر سمجھتا ہے کہ عاشق کو یہ کہنا ناروا ہے۔ ان جذبات کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

صبحدم مرغِ چمن با گلِ نوخاستہ گفت ❊ ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم ولے ❊ ہیچ عاشق سخنے سخت بہ معشوق نہ گفت

عشق کی گرمی سے جوان ہو جانے کے خیال کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

گرچہ پیرم تو شبِ تنگ در آغوشم گیر ❊ کہ سحرگاہ زکنارِ تو جواں برخیزم

پھر کہتے ہیں ؎

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم ❊ ہرگہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم

خواجہ صاحب کا فلسفہ خیام کے فلسفہ سے ملتا جلتا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اسرار کائنات سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست ❊ ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

ان کی دانست میں اسرار کائنات اگر معلوم بھی ہو سکتے ہیں تو ریاضت سے نہ کہ تحصیلِ علوم سے ؎

رازِ درونِ پردہ زِ رندانِ مست پرس ❊ کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خود مختار نہیں۔ بلکہ کوئی قوت ان سے کام لے رہی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ❊ آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

خواجہ صاحب نے جس وقت شاعری شروع کی تھی۔ سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے آپ نے بھی غزل گوئی کی ابتدا ان کے کلام کو سامنے رکھکر کی۔ چنانچہ ابتدائی غزلیں سلمان اور خواجو کی غزلوں پر کہی ہوئی ہیں۔ ان میں مضامین اور ترکیبیں کثرت سے متوارد ہیں۔ اور جابجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں۔ مثلاً:-

گر شدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر نیست ❊ ہمچنیں رفت است از روزِ ازل تقدیرِ ما

در خرابات مغاں ما نیز ہم مستاں شدیم ∴ کایں چنیں رفت است از عہد ازل تقدیر ما
عاقل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم ∴ ای لبا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما
عقل اگر داند کہ دل دربند زلفش چوں خوش است ∴ عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما
از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو ∴ گر کماں نرم است زخمش سخت باشد تیر ما
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد حافظ خموش ∴ رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما

لیکن رفتہ رفتہ ان کی غزلوں نے دنیا میں وہ غلغلہ برپا کیا کہ دیگر تمام شعرا کی آوازیں پست ہو کر رہ گئیں۔

"شفق"

(از جناب میرزا غلام رضا صاحب رضاؔ سمہانی شرقی)

(۱) اے شفق اے لالۂ حمرائے فردوس بریں
تو ہے عنوان کتابِ عاشقِ اندوہگیں

(۲) شیشۂ گردوں میں کوثر کی شرابِ ارغواں
گلشنِ فردوس میں یاقوت کی نہر رواں

(۳) ہے زمرد زار صحرائے فلک مسکن ترا
حوریانِ خلد اٹھائیں گوشۂ دامن ترا

(۴) غازۂ رخسارِ خورشیدِ جہاں آرا ہے تو
رشکِ ماہ تو فلک کی آنکھ کا تارا ہے تو

(۵) طفلِ ماہِ نو کا گہوارہ تری آغوش ہے
بارِ ہفت افلاک اٹھائے تیرا نازک دوش ہے

(۶) التہاب نار میں ہے تیری فطرت آشکار
لالہ و گل میں ہے تیرے روئے زیبا کی بہار

(۷) حسن رنگیں سے ترے رخشاں شب دیجور ہے
کیف آور تیرے پرتو سے مئے انگور ہے

(۸) ڈوبتے ہیں دن کو تارے تجھکو پانے کیلئے
رات کو محفل میں تیری جگمگانے کیلئے

(۹) ابلقِ ایام سے ہے تیز تر توسن ترا
ہے محیطِ کارگاہِ دو جہاں دامن ترا

(۱۰) کرمکِ شب تاب ہے آتش بجاں تیرے لئے
صبح تک جلتی ہے شمعِ بے زباں تیرے لئے

(۱۱) حسنِ رنگیں سے ترے رنگِ رخِ مہتاب فق
تیری تنویریں الٹ دیتی ہیں ظلمت کا ورق

(۱۲) ہاتھ میں پیرِ فلک کے خوں بھری شمشیر ہے
خونِ ناحق یا کسی بیکس کا دامن گیر ہے

(۱۳) دیکھکر تجھکو نہ کیوں پہلو میں ہو دل بے قرار
تیری سرخی ہے "شہیدِ کربلا" کی یادگار

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم!

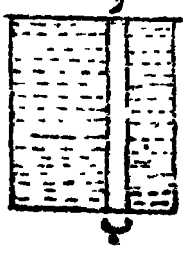
حرکت اور خدا

(از دوست محمد خان کامل بیٹربی سرحدی متعلم بی۔ اے)

ہم دنیا میں کئی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ مگر ہمیں حواس خمسہ کے ذریعہ کسی چیز کا علم ہو سکے اور ہم اس کے وجود سے انکار کریں تو لوگ ہمیں دیوانہ خیال کریں گے۔ مگر چند چیزیں ایسی بھی ہیں کہ باوجود ہمیں دیکھنے کے بھی ہمارے لئے ان کے وجود سے ان کے وجود سے انکار کرنا از روئے عقل ضروری ہے۔ کیونکہ عین اسی وقت جب ہم ان کو دیکھتے ہیں تو نہیں بھی دیکھتے۔ جیسے دریا میں ایک بار سے زیادہ گھسنا اور حرکت۔ بعض عقل کے پتلے میرے آخری فقرہ کو پڑھ کر کہہ اٹھیں گے کہ اس مضمون نگار صاحب کا توازن دماغی بگڑ گیا ہے۔ جو انہیں قانون المانع الاجتماع النقیضین کو باطل ٹھہرانے کی سوجھی۔ اور دریا میں ایک بار سے زیادہ گھسنے کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ اور حرکت جیسی ظاہر اور بین چیز کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ مگر میں ان نئی تاریکی کے شیدائیوں سے جو اکثر اللہ میاں کی ہستی کے دلائل مانگتے ہیں عرض کرونگا کہ بھلا ان چیزوں کے وجود کے ثبوت کے لئے تو کوئی دلیل لائیے۔ وہ یقیناً کہیں گے کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ایسی چیزوں کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو آپ اپنا ثبوت ہوں۔ اور جن کے وجود کا انکار حماقت اور بیوقوفی کے مترادف ہو۔ جس طرح قانون العینیت کا کوئی ثبوت نہیں اسی طرح ان چیزوں کا بھی ثبوت نہیں۔ مگر ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرنا صریح غلطی ہے۔ میں ان سے کہونگا کہ اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی کہ ان چیزوں کا کوئی ثبوت نہیں تو میں ان کو تسلیم کر لیتا کیونکہ از روئے مشاہدہ ان کے وجود کا اقرار صحیح ہے۔ مگر چونکہ از روئے مشاہدہ ان کے وجود کا انکار زیادہ صحیح ہے اور عین عقلمندی ہے۔ اسلئے ہم اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ان کے وجود کو تسلیم کرنا بیوقوفی ہے۔

میرے ان جملوں کو پڑھکر نہ صرف وہی لوگ جن کے ساتھ میرا مناظرہ ہے مجھے فاتر العقل سمجھ رہے ہونگے۔ بلکہ ان حضرات کو بھی میرے صحیح الدماغ ہونے میں شبہ ہو گیا ہوگا۔ جن کا میرے متعلق حسن خیال ہے۔ کیونکہ وہ خیال کرینگے کہ یہ صاحب مضمون کا عنوان تو حرکت اور خدا مقرر کرتے ہیں لیکن اب تک سوائے متضاد باتوں کے اور کچھ لکھا ہی نہیں۔ اگر بجائے حرکت اور خدا اس مضمون کا عنوان اجتماع الاضداد رکھدیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں مگر اپنے قارئین کرام کی خدمت میں گزارش کرونگا کہ یہ بات انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ کہ ایک چیز جتنی ہی عجیب و غریب ہو اسے اتنا ہی زیادہ غور سے مطالعہ کرتا ہے۔ گر کوئی دکاندار کسی ایک مجلہ کے سر کے کسی ایک صفحہ پر اپنی دوکان کا اشتہار شائع کرکے اس کے اوپر لکھدیں کہ "خدا کے لئے اسے ضرور پڑھیں" تو میرے خیال میں معدودے چند لوگ اسے پڑھیں گے۔ لیکن اگر اس کی جگہ لکھدیں کہ خدا کے لئے اسے کوئی نہ پڑھے تو ہر ایک شخص پہلے تو تعجب سے سر کو اسے بغور دیکھنے کے لئے جھکائیگا۔ اور اس کے بعد بڑے شوق اور غور سے پڑھیگا۔ میں کرکٹ محض اسلئے کھیلتا ہوں کہ جب میں بچہ -

کے دن مع اپنی تواریخی داڑھی کے پتلون پہن کر بلا لحاظہ میں لئے کرکٹ کھیلنے جاؤنگا تو کئی لوگ مجھے دیکھنے آئینگے۔ اور اس طرح اگر
دنیا کی نہیں تو ہندوستان کی اور اگر ہندوستان کی بھی نہیں تو کم از کم اپنے صوبہ کی مشہور ترین ہستی ہو جاؤنگا۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے
کہ میں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں متضاد باتیں صرف اس لئے لکھی ہیں کہ آپ میرے مضمون کو پڑھیں۔ یہی باتیں جنہیں آپ
متضاد خیال کرتے ہیں ہرگز متضاد نہیں۔
قارئین ضرور خیال فرمائیں گے کہ یہ سرحدی شنلہ اللہ بھی خدا کی عجیب مخلوق ہیں۔ ابھی تو اپنی تحریر میں تضاد و تخالف کا اقرار کیا
ہے اور اب لگے انکار کرنے۔ مگر جلد ہی آپ پر یہ بات واضح ہو جائیگی کہ میرا دعویٰ بالکل صحیح ہے۔
اصل میں بات یہ ہے کہ بعض چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں۔ مگر انہیں اس رنگت میں نہیں دیکھتے جس طرح کہ وہ درحقیقت ہوتی
ہیں۔ مثلاً ایک آدمی دریا میں نہانے کو جاتا ہے۔ اس سے نکلکر پھر اس کے اندر جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ آدمی دو دفعہ دریا میں نہانے
کو گیا۔ مگر درحقیقت بار دیگر دیا وہ دریا نہیں ہوتا۔ جو پہلی مرتبہ تھا۔ کیونکہ وہ پانی جس میں مذکورہ آدمی نہانے کو گیا تھا۔ گزر چکا ہوتا ہے۔
اور اس کی جگہ لینے کو اور پانی آجاتا ہے۔ لہذا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک ہی دریا میں ایک بار سے زیادہ جانا ناممکن ہے جس طرح
کہ یونانی حکیم ہیراکلیٹس کہتا ہے۔
ہم ایک ہی ندی میں دو دفعہ نہیں اتر سکتے۔ جب ہم ایک دریا میں دوسری دفعہ داخل ہوتے ہیں۔ تو وہ پانی جس میں ہم پہلے
داخل ہوئے تھے بہہ چکا ہوتا ہے۔ لہذا یہ دریا پہلا دریا نہیں ہوتا۔
اسی طرح حرکت کے وجود کو بھی تسلیم کرنا خلاف عقل ہے۔ حالانکہ ہم اسے ہر روز دیکھتے ہیں۔ اور جیسے عرض کر چکا ہوں اس
کے وجود کے خلاف کچھ کہنا لوگوں سے مجنون اور پاگل کا خطاب حاصل کرنا ہے۔ مگر چونکہ میرا مقابلہ اس وقت ان لوگوں کے ساتھ
ہے جنہیں دلدادگان عقل یا عقل کے پتلے کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے میں اس کے عدم وجود کے متعلق کچھ کہنے سے گھبراتا نہیں۔
حرکت کے ناممکن ہونے کا ثبوت۔ جب ایک شے حرکت کرتی ہے تو حرکت کے دوران میں ہر ایک مقام پر اس جگہ
سے لیکر جہاں سے حرکت کا آغاز ہوتا ہے اس مقام تک جہاں پر اختتام پذیر ہوتی ہے یہ ساکن ہوتی ہے۔ زینو کا قیاس ذو الجہتین
اس بات کو واضح کر دیگا۔
(۱) اگر ایک جسم متحرک ہے تو یا وہ وہاں حرکت کرتا ہے جہاں وہ ہے۔ یا وہاں حرکت کرتا ہے جہاں وہ نہیں۔
(۲) ایک جسم اس جگہ متحرک نہیں رہ سکتا جہاں وہ ہے اور وہاں بھی متحرک نہیں رہ سکتا جہاں یہ نہیں۔
(۳) لہذا یہ کسی جگہ بھی متحرک نہیں۔ اس لئے حرکت ناممکن ہے۔



مثال کے طور پر کتاب کا ایک صفحہ لیں اس پر ایک مکھی نقطہ ا سے چلکر نقطہ ب تک پہنچی ہے۔
فرض کریں کہ نقطہ ا سے نقطہ ب تک جتنے اجزا سے یہ گزر کر آئی ہے ان کی مجموعی تعداد ۹۰۰۰ ہے۔ لازمی
طور پر جب یہ پرواز کرتی ہے ہر ایک پر اس کا قیام تھا۔ اور اس طرح یہ تمام اجزا پر ٹھہری ہے۔ تو بتایئے اس نے حرکت

کہاں کی۔

اگر ہم حرکت کو کثرت السکون الآ ان تسلیم کریں تو جب بھی حرکت کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا عدم وجود ہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ کثرت السکون سے اس کی متضاد چیز پیدا نہ ہوگی۔ بلکہ سکون ہی پیدا ہوگا۔

میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ جہاں مجھے ناظرین کی طرف سے اعتراض کا احتمال ہو وہاں اس کا جواب بھی دیتا جاؤں۔ آپ دل میں ضرور کہہ رہے ہونگے کہ پہلے تو میں نے اپنے مضمون میں متباین باتیں لکھنی شروع کردیں۔ پھر اس میں مزاحیہ رنگ پیدا کیا۔ اور پھر حکیمانہ بحث شروع کردی۔ اور فلسفیوں کے اقوال نقل کرنے لگا۔ لیکن اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے غور کریں تو معلوم ہو جائیگا۔ میرے مضمون میں مذاح کسی جگہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اب تک میں نے جتنی باتیں لکھی ہیں تمام سنجیدہ تھیں۔ وہ چیز جسے آپ مزاح سمجھ رہے ہیں مزاح ہے بھی۔ اور نہیں بھی۔ مذاح اسلئے کہ آپ نے بھی اسے مذاح سمجھا۔ میرا بھی یہی خیال ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ مگر یہ بات اس لئے خلاف حقیقت ہے کہ مذاحیہ مضمون یا عبارت لکھنے سے مقالہ نگار کا مقصد پڑھنے والوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے۔ مگر کیا وہ عبارت جسے آپ مذاحیہ خیال کرتے ہیں۔ پڑھکر آپ ہنسے یا آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میرے خیال میں ہرگز نہیں۔ اور اگر آپ ہنسے یا آپ نے تبسم فرمایا تو اپنی غلطی پر ہنسے۔ اور میں آپ سے یہ توقع نہیں رکھتا۔ کیونکہ آپ نے مجھ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ میں اپنے مضمون میں متضاد باتیں لکھ رہا ہوں۔ اور میں نے آپ پر آپ کی غلطی کو واضح کیا۔ اور غلطی کے احساس کے بعد انسان کو کسی قدر افسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ خوشی بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ ہرگز متانت یا سنجیدگی کے دائرہ سے باہر نہیں جاتی۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم حرکت کے وجود کا اقرار کریں یا نہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام انسان حرکت کے وجود کو مانتے چلے آئے ہیں۔ مانتے ہیں اور مانیں گے۔ اور زینو بھی ضرور اس کے وجود کا قائل ہوگا جس نے سب سے پہلے اسے ناممکن ثابت کیا۔ اور میں بھی اس کے وجود کا اقرار کرتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب عقل حرکت کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تو میں کیوں اس کے وجود کو تسلیم کرنے والوں کا مؤید ہوں۔ اسی کے جواب میں عرض کرونگا کہ مجھے میرا وجدان اس کے انکار کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں دریا میں ایک بار سے زیادہ داخل ہونے کو تو درست خیال نہیں کرتا۔ اور حرکت کے وجود کا قائل ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی ایک چیز یہاں ہے۔ اور پھر وہاں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ابھی تو میرا قلم کاغذ کے ابتدائی حصہ میں تھا اور اب یہ لکھتے لکھتے اس کے درمیانی حصہ تک آ پہنچا ہے۔ غرض انتقال من المکان الی المکان ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس حالت میں حرکت کے وجود سے انکار کرنا غلطی ہے۔

قارئین کرام نے جان لیا ہوگا کہ جب میرے دماغ میں حرکت کا خیال آیا تو ساتھ ہی خدا کا خیال کیوں آیا۔ اس کی وجہ محض معاشت افکار ہے۔ چونکہ حرکت کا ثبوت بھی وجدانی ہے۔ اور اللہ میاں کی ذات کا بہترین ثبوت بھی وجدانی ہے۔ لہٰذا میرے دماغ میں جب حرکت کا خیال آیا تو ساتھ ہی خداوند تعالےٰ کا خیال بھی آیا۔

جیسے میں عرض کر چکا ہوں۔ دنیا میں چند چیزیں ایسی ہیں۔ جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ مگر لوگ انھیں مانتے ہیں۔ ان میں سے

میں نے آپ کی خدمت میں دو پیش کیں جن میں سے موخر الذکر کے وجود کے تسلیم کرنے میں تو وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن اول الذکر کو تسلیم کرنا سراسر غلطی ہے۔ اسی طرح دنیا میں ایک ہستی اور چند چیزیں ایسی ہیں جن کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مگر اکثر لوگ انھیں تسلیم نہیں کرتے۔ قارئین کو اسجگہ دھوکا نہ ہو کہ جس طرح میں نے پہلی چیزوں کے وجود کا انکار کیا اور پھر ان میں سے ایک کے وجود کو تسلیم کیا۔ اب بھی ان آخری چیزوں کے وجود کا اقرار کر کے ان میں سے مذکورہ ہستی کے وجود کا اقرار کرونگا۔ اور دوسری چیز کے وجود سے انکار یا دونوں کو تسلیم نہ کرونگا۔ چونکہ یہاں میں چیز اور جس ہستی پر میں بحث کرونگا ان کا وجود درحقیقت ہے۔ لہذا مجھے ان کے وجود کے انکار کی مجال نہیں۔ یہ بات میں نے اس لئے لکھدی کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ آپ کا میرے متعلق خیال ہے کہ میں جو بات کہتا یا لکھتا ہوں آخر میں ضرور اسکی تردید کرتا ہوں۔

لیجیے حضرات اب میں آپ کو وہ بات اور وہ ہستی بتاتا ہوں جن کو تسلیم کرنا سب کے لئے ضروری ہے۔ مگر بہت کم لوگ انھیں تسلیم کرتے ہیں۔

وہ بات یہ ہے کہ "دنیا میں سچ نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سچ ہے اور وہ ہستی جس کا میں نے ذکر کیا ہے اللہ میاں کی ہستی ہے۔ مجھے یہاں اس سوال کے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کہ مجھے اللہ میاں کی ہستی کے خیال کے ساتھ اس بات کا خیال کیوں آگیا۔ ایسے ہی ایک سوال کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔ اب مجھے اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ یہ کہنا کہ دنیا میں سچ نہیں بہ الفاظ دیگر یہ کہنا ہے کہ دنیا میں سچ ہے۔ مندرجہ ذیل قیاس ذوالحدین سے اس بات کی سچائی ثابت ہو جاتی۔

(۱) اگر یہ بات غلط ہے کہ دنیا میں سچ نہیں تو دنیا میں سچ ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو جب بھی دنیا میں سچ ہے (کیونکہ جب یہ بات بھی صحیح ہے تو دنیا میں سچ ہے)

(۲) یہ بات یا تو غلط ہے یا صحیح۔

(۳) دنیا میں بہرحال سچ موجود ہے۔

اب اللہ میاں کی ہستی کو لیجیے۔ عام طور پر اس کے متعلق یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ ایک میز کو لیجیے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ اس کا بنانے والا بڑھئی ہے۔ تو ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ بڑھئی کا بنانے والا بھی ضرور کوئی ہے۔ اس دلیل پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک ہستی کا خالق ہے۔ تو اللہ میاں کا خالق کون ٹھہرا۔ اگر ہم خدا کی ہستی کے متعلق اس دلیل کو تسلیم کریں تو ہمیں ایک تضاد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ دلیل دینے والا یہ کہیگا کہ چونکہ تسلسل ناممکن ہے۔ لہذا اس اعتراض سے اللہ میاں کا عدم وجود ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ ہم اللہ میاں کو قدیم تسلیم کر کے تسلسل کا اقرار کرتے ہیں۔ لہذا یہ جواب صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

"اگر خدا کا وجود نہ ہو تو سلسلۂ غیر متناہی کا وجود لازم آئیگا۔ لیکن غیر متناہی کے محال ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔" شاید یہ کہا جائے کہ غیر متناہی کا خیال انسان کی عقل سے بالاتر ہے اور یہی اس کے محال ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن خدا کو جس طرح قدیم اور اولی مانا جاتا ہے وہ بھی غیر متناہی کی ایک دوسری صورت ہے۔ ایک خدا جو ازل سے موجود ہے اور جس کی کوئی انتہا نہیں کیا ایک سلسلۂ غیر متناہی کے تسلیم کرنے

کچھ کم عجیب ہے۔" (الکلام حصہ دوم صفحہ ۲۴ و ۲۵ مصنفہ حجۃ الملۃ والدین حضرت علامہ مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ) جس قدر استدلال میں نے اللہ تبارک وتعالی کی ہستی کے متعلق پڑھے اور سنے ہیں ان میں اللہ میاں کا اپنا استدلال اور طریقۂ استدلال بہترین اور قلب انسانی کو مطمئن کر دینے والا ہے۔ اور یہ استدلال اگرچہ بالکل وجدانی ہے۔ مگر منطق اور عقل سے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ خداوند عالم قرآن پاک میں فرماتا ہے اَمْ خُلِقُوا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ۝

ترجمہ:۔ کیا یہ بغیر کسی کے (پیدا کرنے کے) پیدا ہو گئے ہیں۔ یا یہی پیدا کرنے والے ہیں۔ یا انھوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں کرتے۔ اس استدلال کے متعلق اکثر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اس استدلال کو وہی استدلال کی طرح خیال کرتے ہیں۔ جو میں ابھی لکھ چکا ہوں۔ مگر اس استدلال اور پہلے استدلال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ انسان کے اعلی وجدانات سے اپیل ہے۔ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ کیا انسان خود ہی پیدا ہو گیا؟ کیا یہ خود اپنا خالق ہے؟ کیا یہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے؟ یہ کلام کی طرز ہی سے ظاہر ہے کہ ہر ایک سوال کے ساتھ جواب بھی نفی میں موجود ہے۔ کیونکہ قرآن کا دعوی ہے کہ تمام موجودات کا خالق اللہ تعالی ہے۔ اور یہ دعوی اس آیت میں بھی نظر آ رہا ہے۔ دعوئے قرآنی اور اللہ میاں کے استدلال سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اللہ میاں کا استدلال مندرجہ ذیل رنگ میں ہے۔

جو لوگ اللہ میاں کا ثبوت مانگتے ہیں وہ اس کے عدم وجود کا ثبوت دیں۔ کیونکہ اللہ میاں کی ہستی سے انکار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی۔ لہذا خدا کی ہستی کا انکار صرف ایک ہستی کی نفی ہی نہیں بلکہ ایک دعوی ہے اور اس دعوی کی سچائی کا ثابت کرنا منکر خدا کا فرض ہے۔

یا تو یہ بات صحیح ہے کہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی۔ یا اس کا کوئی خالق ہے۔

"فلسفۂ حال نے تحقیقات علمیہ کا سب سے پہلا اصول جو قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک کسی شئے کے وجود کی قطعی شہادت موجود نہ ہو ہم کو اس کا وجود تسلیم نہ کرنا چاہئیے۔ کانٹ اور بیکن نے اپنے فلسفہ کا سنگ بنیاد اسی مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ اور اسی مسئلہ کی بدولت ارسطو کے طلسم فلسفہ کے تمام ارکان متزلزل ہو کر قطعیات اور یقینیات کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ (الکلام حصہ دوم صفحہ ۲۴)

مگر چونکہ مندرجہ بالا دو صورتوں میں سے ایک ضرور صحیح ہے اس لئے ہم کو ان میں سے ایک کا صحیح ہونا تسلیم کرنا پڑیگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں ان میں سے کونسی صورت از روئے عقل قابل تسلیم ہے۔ چونکہ ایک غیر ذی حس۔ غیر ذی عقل۔ اور غیر ذی حیات چیز کا آپ اپنی علت ہونا بمقابلہ ایک ذوالعقل وذی حیات شخصیت کا اس کی علت ہونے کے قابل قبول نہیں۔ لہذا آخری صورت کا قبول کرنا یقیناً صحیح ہے۔ کیونکہ ہمارے وجدانات اس کو قبول کرتے ہیں۔ جب ہم دلائل میں تمیز کرتے ہیں اور ہم صحیح دلائل کو قبول اور غلط دلائل کو مسترد کرتے ہیں۔ تو اپنے وجدان ہی کے حکم کے ماتحت کرتے ہیں۔ لہذا اس دلیل کا قبول نہ کرنا سخت غلطی ہے۔ حرکت کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے تو ہمارے پاس صرف وہی دلیل ہے۔ کہ ہمارے وجدانات ہم کو اس کے ماننے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تو ہمارے پاس ایک ایسا ثبوت ہے۔ جو بالکل ناقابل تردید ہے۔ اس دلیل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو اپنے ارادے سے پیدا کیا۔ علاوہ ازیں اللہ نے اپنے اور اسماء رب۔ رحیم۔ اور حکیم وغیرہا جو قرآن پاک میں ہمیں بتائے ہیں۔ تو ان میں سے بھی اس کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھتے ہیں۔ "کیا ان کا وجدان باور کر سکتا ہے۔ کہ نظام ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے۔ اور کوئی ارادہ۔ کوئی قدرت۔ کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک ابھری ہوئی کارسازی موجود ہو۔ مگر کوئی پروردگار کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ اندھی بہری فطرت۔ بے جان مادہ۔ اور بے حس ایکیٹروں کے خواص ہیں جن سے پروردگاری اور کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے۔ اور زندگی اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں۔ پروردگاری موجود ہے مگر پروردگار موجود نہیں۔ کارسازی موجود ہے مگر کوئی کارساز موجود نہیں۔ رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم موجود نہیں۔ حکمت موجود ہے مگر کوئی حکیم موجود نہیں۔ سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں۔ عمل بغیر کسی عامل کے۔ نظم بغیر کسی ناظم کے۔ قیام بغیر کسی قیوم کے۔ عمارت بغیر کسی معمار کے سب کچھ بغیر کسی موجود کے نہیں۔ انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے۔ کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس کی فطرت بناوٹ ہی میں ایک ایسا سانچہ لیکر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک اور انکار کی گنجائش نہیں۔" (ترجمان القرآن صفحہ ۲۸)

ان دلائل سے جو میں نے اور مولانا نے قرآن سے اخذ کئے ہیں خدا کی ہستی ناقابل تردید طریق سے ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے خالق کے سامنے سر عبودیت خم کر دینا چاہئے۔ اس کے سامنے سر عبودیت خم کرنے کا یہی مطلب نہیں کہ ہم صرف اس کی ہستی کا اقرار کریں بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اسکی ہستی کا اقرار کریں۔ اس عظیم الشان کتاب پر ایمان لائیں جو اس نے اپنے آخری اور سب نبیوں سے پیارے اور برگزیدہ نبی حضرت محمد رحمۃ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ) کو دی ہے۔ اور اس کو اللہ کے اپنے کلام سے اور اس کے رسول کے کلام سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور اس پر عمل کریں۔ اور اس کے بعد اللہ کے محبوب کے ارشادات کو سر آنکھوں پر رکھیں۔ اور جو بات انؐ کے مطابق ہو اسے مانیں۔ یاد رہے کہ کلام اللہ کو کلام اللہ اور کلام الرسول سے سمجھنے کے لئے تدبر اور غور ضروری امر ہے۔

یہاں میں اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے "سفیر سخن" جیسے رسالہ کو جس میں ہمیشہ ادبی مضامین نظمیں اور غزلیات شائع ہوتی ہیں ایسا مضمون کیوں دیا ہے۔ جس کا تعلق مذہب اور فلسفہ سے ہے۔ عرض یہ ہے کہ آپ نے کالجوں کے طلباء کو دیکھا ہوگا کہ وہ باوجود ہندوستانی ہونے کے انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ ملاقات کے وقت اسلام علیکم۔ نمستے، یاست سری اکال کی جگہ گڈ مارننگ اور گڈ نائیٹ وغیرہ کہتے ہیں صبح ہاتھ منہ چائے پینے کے بعد دھوتے ہیں۔ باوجود ہندو یا مسلمان ہونے کے شکسپیر اور برنارڈ شا کے ڈراموں پر غور کرتے رہیں گے۔ اور ویدوں اور قرآن کی حکیمانہ تعلیم پر تو کبھی بھول کر بھی تدبر نہ کرینگے۔ اپنے اسلاف کے احوال سے تو مطلقاً بے خبر ہونگے۔ اور جارڈین اور لارڈ ڈ کے نظریۃ الرجل پر بحث و مباحثہ کرتے نظر

آئیں گے۔ جب فلسفہ کے طلباء دیوان چند کی منطق کی لال جلد والی کتاب پڑھ چکتے ہیں۔ توکبھی تو اپنے سر کے انگریزی فیشن کے بالوں کو پکڑ کر سر کو جھکاتے ہیں۔ اور اس طرح کی شکل و صورت بنا لیتے ہیں کہ گویا بحر افکار میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ اور کوئی حضرات اکثر اپنا ہاتھ اٹھا اپنے سر پر بڑے زور سے دے مارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تہذیب مغربی کے دلدادہ ہیں۔ نئی طرز تمدن سے واقف ہیں۔ اور سقراط۔ ارسطو۔ ابن رشدؒ اور کانٹ کے استاد ہیں۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اگر ہم آپ پر یہ ظاہر کریں کہ ہم فلسفہ جانتے اور دینیات سے واقفیت رکھتے ہیں تو کونسے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر آپ منصف مزاج ہیں تو یقیناً مجھے سفیر سخن کو ایسا مضمون لکھ بغرض اشاعت دینے میں حق بجانب خیال فرماوینگے۔

رباعی

ساقی مجھے آب زندگانی دیدے
پیاسا ہوں شراب ارغوانی دیدے
جھوما کروں مستی میں جوانوں کی طرح!
بھر بھر کے پیالوں میں جوانی دیدے

حسن کی کرشمہ سازیاں

(از جناب بابو ملک رام بی-اے - حسرتی)

حسن کیا ہے؟ اور اسکی کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ یہ ایک عنوان ہے جو صدہا برس سے تعلیم یافتہ سوسائیٹیوں اور علمی مجالس میں زیر بحث ہے۔ لیکن ہنوز روز اول ہے۔

درحقیقت "حسن" ایک سحر ہے۔ جو انسان کی عقل و فہم کو جذب کر لیتا ہے۔ ایک کشش ہے جو مضبوط سے مضبوط دل کو اپنی طرف کھینچنے میں ہر وقت کامیاب ہے۔ —— اب رہا یہ سوال کہ اگر واقعی حسن میں یہ قوت ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ شخص جو ایک حسین چیز کو دیکھتا ہے یکساں متاثر نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح قدرت نے نوع انسان میں تفاوت رکھنا مناسب خیال فرمایا ہے۔ کہ ہر شخص اپنی یکتا شکل و شباہت لے کر آتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کی عقل، عادت اور مزاج میں بھی فرق رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک چیز کا تمام بنی نوع انسان پر یکساں اثر نہیں ہوتا۔ ایک شخص ہے۔ کہ اس کو اسی غذا کا ذائقہ بہت مرغوب ہے دوسرا ہے کہ اس کو زبان پر بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ ایک ہے کہ کسی صورت کا والا و شیدا ہے۔ دوسرا ہے کہ اسی صورت سے بیزار ہے۔ نظر بھر کو دیکھنے میں بھی تکلف ہے۔ لیکن اتنا اختلاف بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ حسن سے انسان کیوں متاثر ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اور اس کا حل میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ حسن ایک لطیف منظر ہے۔ ایک خاموش کشش ہے۔ جس کو مادی کثافت سے کوئی تعلق نہیں۔

ارباب عقل کا یہ فیصلہ ہے کہ حسن ایک لطیف چیز ہے۔ اور اس کا اگر کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ تو صرف لطافت سے۔ انسان کے خزانے میں حسن کے علاوہ کیا چیز لطیف ملتی ہے "وہ روح" ہے۔ اور حسن جب قبضہ کرتا ہے تو روح پر۔ اور روح جسم پر قادر ہے۔ روح کے ماتحت تمام بدن کی مشینیں چلتی ہیں۔ روح ہی عقل اور جذبات پر اثر رکھتی ہے۔ اور جب روح جلوۂ حسن سے مرعوب ہو گئی تو پھر کیا رہ گیا؟ کچھ بھی نہیں۔

پس حقیقت میں حسن، دل کی دنیا پر بادشاہت کرتا ہے۔ اس کی نظر میں امیر و غریب سب ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے جلوہ کی صرف ایک شعاع سخت سے سخت دل کو موم کر دیتی ہے۔ اس سرپر غرور کو حسن کی لغت میں خم ہونا ایک لفظ بے معنی ہے۔ ایک لمحہ میں زمین بوس کر دینے میں بالکل قادر ہے۔ جس پر لطف التفات کی وہ نشہ خود فراموشی میں مست ہوا۔ اب اسے نہ دنیا و مافیہا کی خبر رہی۔ نہ آخرت کی فکر۔ اس کی امید و یاس کی دنیا اسی ایک جلوہ میں بستی ہے۔ اسی ایک نظر پر اس کا حشر و نشر ہے۔ یہی ایک بہار چمن لیلےٰ پر رونما ہو کر حضرت قیس کو مجنوں بنا دیتی ہے۔ اسی چاشنی کا ذائقہ جب حضرت فرہاد محسوس کرتے ہیں۔ تو انجام کار جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ وہی ایک تجلی نور جہاں بنکر جہانگیر پر حکومت کرتی ہے۔ اور وہی ایک کشش اسکندر کو کشاں کشاں مصر کے میدانوں میں لے پہنچتی ہے۔ وہی جمال منظور نظر ہو کر مصر کی بادشاہت کرتا ہے۔ اور وہی جلوہ "کسی" سے زبیدہ کی پرستش کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ایسے صدہا کرشمے ہیں جو حضرت حسن دنیا کو دکھا چکے ہیں۔ اور ابھی آپ کی فہرست میں خدا جانے کیا کچھ لا رہا تی ہے۔

محبت کی کسوٹی یا تہذیب نو

(جناب محمد اسلم اشرف صاحب سہ جدی)

شاکر حسین صاحب قزلباش خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جو عرصہ سے ایران چھوڑ کر لاہور مستقل طور پر اقامت گزیں ہو چکے تھے۔ ظہور حسین آپ کا اکلوتا اور چاہیتا بیٹا تھا۔ اس لئے بڑے نازو نعم میں اس کی پرورش ہوئی۔ اسے کھیلنے اور سیر کرانے کے لئے خاص ماما رکھی گئی۔ اور ظہور حسین کو ہر طرح کا آرام پہنچانے کے لئے کوئی کسر باقی نہ رکھی گئی۔ شروع ہی سے انگریزی دلائی گئی تعلیم دلوائی گئی۔ اب ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ اور بی۔ اے ہو چکے تھے۔ والدین نے میاں ظہور حسین کی شادی کسی اچھے گھرانے سے کرانی چاہی۔ چنانچہ بڑی سوچ و بچار کے بعد معراج الدین صاحب کے ہاں سے شادی کرنے کا فیصلہ ہوا۔ دونوں طرف شاندار طریقے سے تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور دو تین ماہ بعد ظہور حسین کی شادی معراج الدین صاحب کی اکلوتی بیٹی حمیدہ سے بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال سے عمل میں لائی گئی۔ کئی دن مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ اور ہر دو گھروں میں خوشی منائی جاتی رہی۔ جب ظہور حسین کے والد نے اپنے فرزند ارجمند کی شادی کی خوشی اپنی آخری زندگی میں ہی دیکھ لی تو ایک سال کے بعد یزدی نے انھیں اس جہان فانی سے اٹھا لیا۔ ظہور حسین اب بالکل آزاد تھا۔ چونکہ مغربی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لئے مغربی ہی تہذیب میں رنگ چکا تھا۔ حمیدہ بھی میٹرکولیٹ تھی۔ مگر اس نے ساتھ ہی ساتھ دینوی تعلیم بھی حاصل کی ہوئی تھی۔ اس لئے اس پر مغربیت کا ذرہ بھر اثر نہ ہوا تھا۔ وہ ایک مجسمۂ حیا و شرافت تھی۔ خاوند کی خدمت وہ اپنا فرض اولین خیال کرتی تھی۔ گھر کے کام کو سلیقہ و خوش اسلوبی سے کرتی تھی۔ ظہور کی خوشی ہی میں اس کی خوشی تھی۔ خدا اور اس کے برگزیدہ رسول کے بعد وہ ظہور ہی کو اپنا دیوتا جانتی تھی۔ مگر ظہور نے کچھ نرالی طبع پائی تھی۔ کبھی دوستوں کے ساتھ کلب روانہ ہو جاتے۔ کبھی سینما چلے جاتے اور کافی رات گئے واپس لوٹتے۔ حمیدہ بیچاری دن بھی رات کو انتظار کرتی۔ اور ان کے بغیر خود بھی ایک لقمہ تک نہ لیتی۔ مگر جب ظہور صاحب آتے تو بولتے بھی نہ تھے۔ اور اپنے کمرے میں جا بستر پر دراز ہو جاتے تھے۔ حمیدہ سمجھتی کہ شاید خفا ہوں۔ اور ہر طرح سے خوش کرتی اور معافی مانگتی۔ مگر وہ حمیدہ کی باتوں پر کان بھی نہ دھرتے تھے۔

ظہور حسین کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ والد کی جمع کردہ مایا کو کافی خیال کیا جاتا تھا اس لئے خوب بے دریغ اڑاتا تھا۔ دوستوں کو سینما لے جانا اور کبھی کلب میں ناچ گانے میں حصہ لینا ان کا معمول ہو چکا تھا۔ حمیدہ نے کئی بار باتوں باتوں میں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ظہور کو حمیدہ کی باتیں کڑوی و بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں۔ وہ حمیدہ کے مشوروں پر [illegible] سمجھتا تھا۔ حمیدہ اس کی اس فضول خرچی کو دیکھ کر کڑھتی تھی۔ مگر اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ وہ بالکل [illegible] بھی خریدی تھی۔ جو ہر وقت ان کے دوستوں ہی کو ادھر ادھر لیجانے میں رہتی تھی۔ پانچ دس [illegible]

مگر ظہور کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ مہینہ میں دو تین بار تمام دوستوں کو انگریزی ہوٹل میں دعوت دی جاتی تھی۔ جس پر کافی روپیہ خرچ کر دیا جاتا تھا۔ اس عیش و عشرت کی زندگی اور مفت خورے دوستوں کی رفاقت سے شراب پینے کی عادت بھی پڑ گئی۔ حمیدہ سے آخر نہ رہا گیا۔ اور ایک دن بہت سمجھایا مگر ظہور پر اس کا الٹا اثر ہوا حمیدہ کو سخت سست کہا۔ اور خفا ہو گئے۔ حمیدہ نے منت و سماجت کی اور معافی مانگی۔ دل پر صبر و تحمل کا پتھر رکھکر خاموش ہو گئی۔

ظہور اب لاہور میں رہ رہ کر تنگ آ چکا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے مشہور شہروں کی سیر کا ارادہ کیا۔ حمیدہ کو کہا کہ چند دن کے لئے دہلی ایک ضروری کام پر جا رہا ہوں اور ساتھ دس بارہ ہزار روپیہ لیکر دہلی روانہ ہو گیا۔ وہاں ایک دو ہفتہ مقیم رہا۔ اور خوب سیر کی۔ پھر آگرہ۔ بنارس۔ کلکتہ دیکھکر جنوبی ہند کو روانہ ہو گیا۔ مدراس۔ اوٹا کمنڈ۔ اورحیدرآباد (دکن) کی سیر کرتے ہوئے بمبئی پہنچا۔ بمبئی کے دلفریب مناظر نے اس پر بہت اثر کیا۔ شام کے وقت وہ سمندر کے کنارے جا کر سمندر کی بڑھتی ہوئی موجوں کا لطف حاصل کیا کرتا تھا۔ اب وہاں سے واپس لوٹنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر روز حسب معمول سیر کے لئے شام کو سمندر کی طرف نکل جاتا تھا۔ ایک دن سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس کی نظر ایک پارسی دوشیزہ پر پڑ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے سیمیں بدن پر ارغوانی رنگ کی ساڑی تھی جس سے وہ گل لالہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن۔ کتابی چہرہ اور چشم آہو نے ظہور پر جادو کا اثر کیا۔ اور پہلی ہی دید میں وہ "دیوتائے عشق" کا شکار ہو گیا۔ اب تو وہ ہر روز بلا ناغہ اپنے دل کی مالکہ کو دیکھنے سمندر کی طرف جاتا تھا۔ اور گھنٹوں ادھر ادھر ٹہلتا رہتا تھا۔ اگر کسی دن اسے نہ دیکھ پاتا تو رات دن مغموم و پریشان رہتا۔ ظہور عرصہ تک اس کھوج میں لگا رہا کہ وہ ماہ جبیں کس گھر کا چراغ ہے۔ آخر اس کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کاؤس جی مالک ایشیاٹک انٹرنیشنل ٹاکیز بمبئی کی اکلوتی اور چاہتی بیٹی ہے۔ اور بی۔ اے میں تعلیم پا رہی ہے۔ ظہور کا زخم عشق روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اسے اپنے خویش و اقارب اہل و عیال کا مطلق خیال نہ رہا۔ اب گھر سے نکلے اسے چھ ماہ کے قریب ہو چکے تھے۔ مگر اس نے اب تک گھر خط لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ اب وہ بمبئی کا ہی ہو چکا تھا۔ اسے رات دن یہی خیالی ستاتے رہتے کہ وہ اپنی محبوبہ کو کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ آخر ایک دن اسے سوجھا جھٹ کمپنی مذکورہ کے دفتر میں پہنچا۔ کاؤس جی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب ملاقات ہوئی تو ظہور نے کمپنی میں ملازم ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ساتھ ہی اپنی تعلیم اور خاندانی حالت بتا دی۔ کاؤس جی پہلے تو حیران ہوئے۔ مگر ایک بی۔ اے کو پاکر بہت خوش ہوئے۔ فوراً ایم۔ اے کاردار کو بلا بھیجا۔ جب وہ حاضر ہوا۔ تو اس سے پوچھا کہ کیا ظہور ان کی تیار ہونے والی فلم "آزادی افغانستان" میں ہیرو کے پارٹ کے لئے موزوں ہوگا۔ ڈائرکٹر نے کہا اگر ظہور فارسی جانتا ہو تو فوراً ان کو ملازمت میں لے لیا جائے۔ چونکہ ظہور قزلباش خاندان سے تھا۔ اس لئے فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ چنانچہ کاؤس جی نے اسی وقت ملازم رکھ لیا۔ اور ڈائرکٹر کو کہا کہ ظہور کو ابھی سے اس کا کام سپرد کر دے۔

یہ فروری کا مہینہ تھا۔ اور جنوری میں کمپنی ہذا کو حکومت افغانستان کی طرف سے فرمائش ہوئی تھی۔ کہ وہ افغانستان کے "جشن آزادی" کے لئے جو وسط اگست میں منایا جاتا ہے ایک فلم بنام "آزادی افغانستان" تیار کر کے جولائی کے آخر تک حکومت

افغانستان کے حوالے کردے۔ فلم مذکور کا مسودہ حکومت افغانستان ہی نے ارسال کیا تھا۔ کاوس جی کو عرصہ سے اس فلم کے لئے ایک موزوں ہیرو کی ضرورت تھی۔ ہیروئن کے پارٹ کے لئے اس نے اپنی بیٹی زہرہ بائی کو موزوں سمجھا۔ چنانچہ جب ظہور کو یہ پتہ چلا کہ اس کی حقیقی محبوبہ بھی فلم میں اس کے ساتھ محبوبہ کا پارٹ ادا کریگی۔ تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب فلم کی تیاری شروع ہوئی تو ظہور نے نہایت محنت، جانفشانی اور شوق سے کام کرنا شروع کیا۔ فلم ایم۔ اے کاردار ہی کی ڈائرکشن میں تیار ہونا تھا۔ اس لئے وہ خاص طور سے اس فلم میں محنت سے کام لے رہے تھے۔ ظہور اور زہرہ بائی کو اچھی طرح سے اداکاری سکھائی۔ کاوس جی نے اپنی تمام توجہ اس فلم کی تیاری کی طرف مبذول کر رکھی تھی۔ غرض ڈائرکٹر، فوٹوگرافر، ساؤنڈ انجنیر سب جانفشانی اور محنت سے کام کرتے تھے۔ ہر ایک اپنے پارٹ کو اچھی طرح نبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ ظہور اور زہرہ کی اداکاری میں حقیقت پائی جاتی تھی۔ بناوٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جس سے زہرہ کو بھی ظہور سے حقیقی محبت ہوگئی۔ پھر کیا تھا ان کی اداکاری بجائے خود اصلیت اور حقیقت پر مبنی تھی۔ دو تین ماہ کی تیاریوں کے بعد فلم سازی شروع ہوگئی۔ فلم میں مہاراجہ بڑودہ اور اس کی فوج۔ خان قلات کی سپاہ اور حکومت انگلشیہ کی فوج سے بھی کام لیا گیا۔ فلم کا بیشتر حصہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے پہاڑوں میں لیا گیا جس پر زرِ کثیر خرچ کیا گیا۔ جولائی کے پہلے ہی ہفتہ میں فلم قریب الاختتام ہوگئی۔ اب صرف باقی دو تین سین لینے باقی رہ گئے تھے جس کے لئے شاندار تیاریاں کی گئیں۔ اور تمام اداکاروں کو آرام حاصل کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی چھٹی دی گئی۔ جب ایک ہفتہ پورا ہوا اور ڈائرکٹر نے آکر ظہور کو تیار ہونے کے لئے کہا تو اس نے اپنا پارٹ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈائرکٹر بڑا سٹ پٹایا۔ کاوس جی کو اطلاع دی وہ خود ظہور کے پاس آیا۔ اور ظہور سے کام کرنے کو کہا مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کاوس جی یہ خلاف امید جواب پاکر سٹپٹا گئے۔ فلم تقریباً ختم ہوچکی تھی صرف دو تین سین باقی تھے۔ وعدہ کا وقت قریب آچکا تھا۔ اور وقت پر فلم تیار نہ ہونے سے کاوس جی کو نقصان عظیم اٹھانا پڑتا تھا۔ کاوس جی بڑے تذبذب میں تھا کہ کیا کیا جائے۔ ظہور کی منت سماجت بھی کی۔ دھمکی بھی دی۔ اور آخر لالچ بھی دی مگر ظہور پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اور وہ مکر رانکار کئے جاتا تھا۔ آخر کاوس جی نے اس کی وجہ پوچھی۔ اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کے بس میں ہوئی تو وہ اس کو پورا کریگا۔ ظہور نے کہا کہ وہ یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ فلم کے ایک سین کی خاطر تو زہرہ اور اس کی بناوٹی شادی کی جائے۔ مگر اس کے بعد زہرہ اس کی نہ ہو۔ اسلئے اگر یہ آخری سین لینے سے زہرہ کی شادی حقیقی معنوں میں اس سے ہوجائے۔ تو وہ فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہے۔ کاوس جی یہ کشمکش شنکر سر پکڑ کے بیٹھ گئے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ بہت سوچا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر ظہور سے کہا کہ میں یہودی ہوں اور تم مسلمان ہو اس لئے ہمارا مذہب اور تمہارا مذہب اس شادی کو کسی صورت میں بھی جائز نہیں گردانتا۔ مگر ظہور نے کہا کہ اسے اس بات کی ذرہ بھر پروا نہیں۔ اس کے لئے مذہب چنداں اہم چیز نہیں ہے۔ کاوس جی نے جب یہ جواب پایا تو غصہ سے تھرتھر کانپنے لگا۔ اور اسی خیال میں ڈوبا رہا۔ ایک طرف غیر مذہب سے شادی کا سوال تھا۔ اور دوسری طرف دو تین لاکھ کے نقصان کا سوال تھا۔ آخر قومی روایات کے مطابق کاوس جی سے اتنا نقصان عظیم برداشت کرنا نہ چاہا۔ اور دوسرے دن ظہور کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دیدی۔ ظہور یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا۔ تھا وہ جس کی خواہش مند تھی۔ وہ اب اسے ملنے والی تھی۔ چنانچہ دو دن بعد خاموشی سے مغربی تہذیب کے مطابق زہرہ اور ظہور کی شادی ہوچکی۔

کاؤس جی نے اپنا ایک مکان ان کو رہائش کے لئے دیدیا۔

اب فلم کے باقی ماندہ مناظر کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ان میں ظہور اور زہرہ ہر دو نے کمال خوبی اور محنت سے اداکاری کی۔ جس سے تمام فلم ایک قابل یادگار فلم ہو گئی تھی۔ فلم کے ختم ہونے کے بعد کاؤس جی مع ظہور۔ زہرہ اور ایم۔ اے کاردار کے افغانستان گئے۔ وہ جشن شروع ہونے سے دو دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ اور وہاں شاہی مہمان تھے۔ جس دن جشن آزادی شروع ہوا اس رات دار الامان کے تیاتر شاہی میں "آزادی افغانستان" کا فلم دکھایا گیا۔ اس دن صرف شاہی افراد۔ بیرونی ممالک کے سفیر اور مہمان حکومت کی طرف سے وہاں بلائے گئے۔ فلم شروع ہونے سے پہلے کاؤس جی ظہور۔ زہرہ اور کاردار بذات خود سٹیج پر گئے۔ اور وزیر خارجہ حکومت افغانستان نے ان سب کا تعارف حاضرین سے کرایا۔ اور فلم کی غرض و غایت اور خلاصہ حاضرین کے سامنے بیان کیا۔ بعد میں فلم شروع ہوا۔ شاہ افغانستان نے اور دیگر امرا و سب نے ظہور اور زہرہ کی اداکاری کو بہت ہی پسند کیا۔ چنانچہ فلم کے اختتام پر وزیر خارجہ نے بادشاہ کی طرف سے اعلان کیا کہ اعلیحضرت کو فلم بہت پسند آیا ہے۔ اس لئے انہوں نے کاؤس جی کو فلم کی قیمت کے علاوہ دس ہزار روپیہ انعام دینا منظور فرمایا ہے۔ نیز ظہور اور زہرہ کو ان کی عمدہ اداکاری پر پانچ پانچ ہزار روپیہ بطور انعام بھی دیا جائیگا۔ جشن کے اختتام تک کاؤس جی وہیں شاہی مہمان رہے۔ اور ختم ہونے پر اپنے انعامات حاصل کر کے بمبئی پہنچے۔ ایک ماہ قیام کرنے کے بعد ظہور نے کاؤس جی سے لاہور آنے کی خواہش ظاہر کی۔ کاؤس جی نے اجازت دیدی۔ ظہور کو گھر سے نکلے ہوئے اب ڈیڑھ سال کے قریب ہو چکا تھا۔ حمیدہ اتنا عرصہ ظہور کا انتظار کرتی رہی۔ ظہور کے سفر کے انتظار میں حمیدہ نے اپنی آنکھیں سفید کر دیں۔ وہ ہر وقت مغموم و اداس رہتی تھی۔ ظہور کے جانے کے ایک ماہ بعد اس کے ایک بیٹا تولد ہوا جس کا نام حمیدہ نے منظور حسین رکھا تھا۔ اب وہ ڈیڑھ سال کے قریب ہو چکا تھا۔ اگرچہ حمیدہ کے لئے منظور تسکین و تشفی کا باعث تھا۔ مگر پھر بھی ظہور کے غم نے اس کی حالت ناگفتہ بہ بنادی تھی۔ گھر کے کام کاج میں اب اسے کسی قسم کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہر وقت منظور کو گود میں لئے مغموم و اداس بیٹھی رہتی کھانا پکانے کا اسے کچھ غم نہ تھا۔ خادمہ گھر کا تمام کام کرتی۔ کھانا پکاتی اور حمیدہ کے سامنے کھانا رکھ دیتی۔ مگر اشتہا ہوتی تو حمیدہ تھوڑا بہت کھا لیتی ورنہ کئی دن کھانا بھی نہ کھاتی جس کی وجہ سے بہت لاغر و کمزور ہو گئی تھی۔

ایک دن صبح سویرے اچانک گھر کے دروازے کے سامنے موٹر کے کھڑے ہونے کی آواز آئی حمیدہ نے خادمہ کو بھیجا کہ دیکھے کون ہے۔ خادمہ فوراً دوڑی دوڑی آئی۔ اور کہا میاں جی تشریف لائے ہیں۔ حمیدہ کی جان میں جان آگئی۔ دوڑ کر دروازے پر آئی۔ اور ظہور و زہرہ کا استقبال کیا۔ زہرہ کو دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی۔ مگر خاموش رہی۔ اسے بھی پیار سے ملی۔ حمیدہ کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کی مسرت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس پر عجب کیفیت طاری تھی۔ ظہور جب اندر آیا تو پلنگ پر منظور کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اسے ہاتھوں پر اٹھا کر دیر تک پیار و محبت کرتا رہا۔ ظہور نے باتوں باتوں میں حمیدہ کو اشارۃً سمجھا دیا تھا کہ زہرہ بھی گھر کی مالک ہے۔ اور تاکید کی کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ حمیدہ پر زہرہ کے بھی گھر کی مالک ہونے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ پھر بھی خفگی یا ملال ظاہر نہ کیا۔ ہر صبح منہ ہاتھ دھونے کا پانی جا کر دیتی۔ چائے خود جا کر سامنے رکھتی۔ اور ہر طرح اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی۔

مگر قانون قدرت اٹل ہے۔ دو بیویاں ایک گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ جیسے "دو پادشاہ در اقلیمے نگنجند"۔ ایک کو دوسرے سے قدرتاً بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حمیدہ ایسی باتوں کے پاس سے بھی پھٹکنے نہیں پاتی تھی مگر زہرہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے یہ کمزوری رکھتی تھی۔ زہرہ کو خدا واسطے کی منظور سے عداوت ہو گئی۔ اسے منظور گھر میں کھیلتا کودتا حمیدہ اور ظہور سے محبت کرتے نہیں بھاتا تھا۔ اس کا یہ عناد روز بروز بڑھتا گیا۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات تراش کر ظہور کا دل حمیدہ سے بدظن کرتی رہتی تھی۔ ظہور کچھ تو پہلے ہی سے مغربیت کا دلدادہ تھا۔ مگر زہرہ کے ساتھ ملنے سے تو وہ مجسمۂ تہذیب مغرب بن گیا تھا۔ حمیدہ سے جو پرانی ایشیائی تہذیب کی دلدادہ تھی اب اس کا دل اٹھتا گیا۔ حمیدہ سے اس کو روز بروز نفرت و حقارت پیدا ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر حمیدہ کو سخت سست کہتا۔ مگر وہ یہ سب برداشت کرتی رہی۔ وہ ہر ایک کام اپنی طرف سے بخوبی کرتی تھی۔ ظہور اور زہرہ کی خادمہ کی طرح خدمت کرتی مگر ظہور اب زیادہ بگڑتا جاتا تھا۔ اسے اب حمیدہ گھر میں پھرتے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ غرض چھ سات ماہ اسی حال میں گزر گئے۔ اور اچانک ظہور پر تپ دق کا حملہ ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حالت خراب ہو گئی۔ حمیدہ رات دن ظہور کے بستر کے پاس بیٹھی رہتی۔ ادویات پلاتی۔ اور ہر ایک قسم کا آرام پہنچاتی تھی۔ ڈاکٹر کو بلوانا۔ بازار سے ادویات منگوانا۔ اشیاء خورد و نوش پکوانا سب اس کے سپرد تھا۔ اور زہرہ سارا دن اپنے کمرہ میں بیٹھی مطالعۂ کتب میں مشغول رہتی کسی وقت آکر ظہور کو دیکھ جاتی۔ اور بناوٹی محبت و غم کا اظہار کرتی۔ مگر اس کا چہرہ صاف بتا دیتا تھا۔ کہ ظہور کی بیماری سے اسے کوئی تشویش یا غم نہیں ہے۔ زہرہ حسب معمول شام کو سیر کے لئے باہر جاتی کبھی کبھی سینما اور کلب میں بھی چلی جاتی۔ اور گھر کافی رات گئے واپس آتی۔ آخر ظہور نے اس بات کو محسوس کیا اور ایک دن زہرہ سے اس کی اس بے التفاتی کا سبب پوچھا۔ زہرہ اس پر سیخ پا ہو گئی۔ دوسرے دن گھر جانے کی تیاری کی۔ اور ظہور کو بغیر پوچھے چلی گئی۔ ظہور کی حالت ابھی تک بدستور خراب تھی۔ اس لئے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے اگر کشمیر تبدیلئ آب و ہوا کے لئے لیجایا جائے تو صحت اچھی ہو جائیگی۔ حمیدہ نے اپنے لخت جگر کو نانا کے پاس چھوڑا اور خود ایک نوکر اور ایک خادمہ لیکر ظہور کو پہلگام لے کر گئی۔ رات دن ظہور کی خدمت کرتی رہتی۔ اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتی۔ کشمیر کی آب و ہوا کا اثر ظہور پر ہوا اور ایک ہی ماہ کے بعد وہ صحت یاب ہونے لگا۔ چنانچہ دو ماہ گزرنے پر وہ اتنا تندرست ہو چکا تھا کہ وہ کر چل پھر سکے۔ ظہور کی صحت اچھی ہونے سے اس کا حمیدہ پر بھی بڑا اچھا اثر ہوا۔ اس کی جان میں بھی جان پڑ گئی۔ تین چار ماہ کے گزرنے پر ظہور مکمل طور پر صحت یاب و تندرست ہو چکا تھا۔ چنانچہ لاہور واپس آیا۔ خویش و اقارب اسے تندرست پاکر از حد خوش ہوئے۔ اور گھر میں ویسی ہی پُر از مسرت زندگی گزرنے لگی۔ جو شادی کے بعد گزری تھی۔ ظہور نے کئی بار زہرہ کو واپس آنے کا خط لکھا مگر ایک کا بھی جواب نہ آیا۔ اب ظہور کی آنکھیں کھلیں۔ اب اسے اچھے اور برے میں تمیز و محبت اور بناوٹ میں فرق معلوم ہوا۔ اب اسے پتہ چلا کہ حقیقی محبت اور بناوٹی محبت کیسے پرکھی جا سکتی ہے۔ اب اس پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ اس سے اس پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اب اسے حمیدہ سے از حد محبت پیدا ہو گئی۔ وہ سوچتا تھا کہ زہرہ جو پہلے اس سے گہری محبت کا اظہار کرتی تھی اب کیوں اس نے منہ پھیر لیا۔ حمیدہ اب پہلے سے بھی زیادہ محبت کرتی تھی۔ دونوں طرف اب برابر آتش محبت شعلہ زن تھی۔ اب وہ حمیدہ کی از حد قدر و منزلت کرتا تھا۔ ہر ایک کام میں اس کا بھی مشورہ لیتا تھا۔ ظہور سمجھتا تھا کہ اب وہ سمجھدار ہو چکا تھا۔ سینما اور کلب جانا اب اس نے

متروک کر دیا تھا۔ حمیدہ کو اب ظہور اپنی جان سے عزیز اور محسن و مسیحا مانتا تھا۔ کیونکہ خدا کے فضل و کرم اور حمیدہ ہی کی وجہ سے وہ تپ دق جیسی موذی مرض سے بچ گیا تھا۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ منظور بھی اب سیانا ہو گیا تھا۔ ظہور کو اس سے از حد محبت ہو گئی تھی۔ ظہور نے کوشش کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی جس سے گھر میں ہر ایک قسم کا آرام و فارغ البالی تھی۔ اور ظہور و حمیدہ کا وقت منظور کے ساتھ خوشی و مسرت میں گزرتا تھا۔

غزل

(جناب سید شریف حسین شاکر ہاشمی سرحدی تلمیذ حضرت بیخود دہلوی یادگار حضرت داغ دہلوی مرحوم مغفور)

زمینِ کوئے جاناں لامکاں ہے — بہت نیچا وہاں سے آسماں ہے
جو اے واعظ مکینِ آسماں ہے — وہ میرے خانۂ دل میں نہاں ہے
وہ بولے یا نہ بولے دیکھ تو لے — مرا دل تو اسی میں شادماں ہے
ہمیشہ آنکھ سے رہتا ہے پنہاں — جو میرے خانۂ دل میں نہاں ہے
جھپٹ ہو گی مری واعظ سے آئے — ذرا دیکھو تو یہ جاتا کہاں ہے
زمانے میں ہیں جتنے اہل باطن — ادا سے اس کی ہر اک نیم جاں ہے
خدا کے واسطے سن لے مری بات — ابھی آیا ابھی جاتا کہاں ہے
نہیں موقوف کچھ مجھ پر ہی یارو — کہ مرتا اس پہ اب سارا جہاں ہے
نہ کیوں سجدے کروں میں در پہ اسکے — یہ کعبہ ہے خدا کا آستاں ہے

مصیبت ایسی کیا شاکر پہ گذری
کہ رود اشک آنکھوں سے رواں ہے

خواب

(جلال الدین خان بی۔ اے سرحدی)

خواب کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا دلچسپ سوال ہے جس پر زمانۂ قدیم اور زمانۂ جدید کے بہترین فلسفی دماغ سوزی کر چکے ہیں۔ طرح طرح کے نظریئے اور تھیوریاں قائم ہو چکی ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور فلسفہ و علم الابدان کی مدد سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر خواب کی حقیقت پھر بھی غیر واضح ہے۔ غالباً اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خواب کا زیادہ تر تعلق روح کے ساتھ ہے۔ اور جس وقت تک ہمارا علم روح کے متعلق غیر واضح ہے اس وقت تک خواب کی حقیقت بھی غیر واضح رہے گی۔

عام طور پر تو خواب ان تجربات یا مشاہدات کو کہتے ہیں جو ہم کو نیند میں یا نیم بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بیداری کے عالم میں بھی انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و موجودات سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور دماغ غیر مادی اشیاء اور خیالات کی دنیا میں محو تماشہ ہو جاتا ہے۔ نیند میں ہمارے سارے اعضاء و قویٰ بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور صرف دماغ معمول کے مطابق مستعد رہتا ہے۔ عام طور پر ہماری یادبھی بیکار ہو جاتی ہے۔ اور ہم عالم بیداری کے تجربات کو نیند میں اور نیند کے مشاہدات کو عالم بیداری میں نہیں دہرا سکتے۔ مگر بعض حالات میں یادبھی باقاعدہ مستعدی سے کام کرتی رہتی ہے۔ اور ہم نیند کے تجربات کو من وعن بیداری میں دہرا سکتے ہیں۔ بعض دفعہ بالکل بھولے ہوئے واقعات نیند میں یاد آجاتے ہیں۔ اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ مشی فی النوم کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ نیند میں بھی حسب عادت بیداری کے کام کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے پرنسپل مسٹر آر۔ ایل ہولڈ زورتھ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایام طالب علمی میں ایک رات وہ بستر سے اٹھے۔ پانی سے ہاتھوں کو دھویا۔ اور پھر ایک جگہ چند تولئے پڑے ہوئے تھے وہاں سے خاص اپنا تولیہ اٹھایا اور ہاتھ خشک کر کے پھر وہیں رکھدیا اور جاکر بستر پر سو گئے۔ ان کے ساتھیوں نے دیکھا کہ آپ اس تمام عرصہ میں گہری نیند میں تھے۔ شکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامہ میکبتھ میں لیڈی میکبتھ کا نیند میں چلنا پھرنا بھی اسی قسم کی ایک اور مثال ہے۔

ڈیموکریٹس جو ایک مشہور یونانی حکیم گذرا ہے کا خیال ہے کہ فضا میں ایک قسم کے عکس اور شکلیں اڑتی پھرتی ہیں۔ اور ہم ان کو عالت بیداری میں نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ نیند کی حالت میں وہ روح پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں کہ خواب کا موجب بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ کوئی زیادہ تسلی بخش معلوم نہیں ہوتا۔ ارسطو جیسا حکیم زمانہ بھی اس سے زیادہ کچھ نہ بتلا سکا۔ کہ انسان جو کچھ بیداری کی حالت میں دیکھتا ہے سوچتا ہے یا تصور کرتا ہے وہ دماغ کے کسی خاص حصہ میں محفوظ رہتا ہے۔ اور نیند میں خواب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ انسان کو سو فیصدی مکمل نیند بہت ہی کم اور شاذ ہی آتی ہے۔ گہری سے گہری نیند میں بھی دماغ کچھ نیم بیداری کی حالت میں ہوتا ہے۔ اور یہی نیم بیداری کی وجہ ہوتی ہے۔ خواب روح اور جگر کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ خواب کی حقیقت کو سمجھنا عقل انسانی

کیلئے بڑا مشکل کام ہے۔ ایک اور فلاسفر بھی افلاطون کے نظریے کی تائید کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ سارے کے سارے خواب دماغ کی نیم بیداری کا نتیجہ نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ بعض خواب آسمانی یعنی خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور وحی یا الہام کا درجہ رکھتے ہیں۔ پیغمبر یا نبی چونکہ ہر وقت خدا کا تصور باندھے رہتے ہیں۔ اور اس کا خیال اس قدر ان کے دل میں بس جاتا ہے کہ وہ ہر وقت خواہ خواب میں ہوں یا بیداری میں خدا کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔ اور اسکو وحی کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق گویا خدا کے متعلق انسانی تصور کی آخری انتہا تکمیل اور بلند ی وحی ہے۔ صوفیا کے نزدیک بھی خواب ایک قسم کا الہام ہوتے ہیں۔ اور خدا اور بندوں کے درمیان ایک قسم کے توسط کا ذریعہ۔ ایک اسلامی فلاسفر عبدالرحمان نامی نے بھی اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی ہے۔ اور اس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک دوسرے یونانی حکیم کا قول ہے کہ خواب صرف نیند کی حالت تک مخصوص نہیں ہوتے بلکہ انسان ہر وقت اور ہر لمحہ خواب دیکھتا رہتا ہے۔ خواہ وہ نیند میں ہو یا بیداری میں۔ مگر چونکہ بیداری میں دوسرے قویٰ مصروف عمل ہوتے ہیں۔ اسلئے خواب کو محسوس نہیں کر سکتے۔ لیکن جب سو جاتے ہیں اور ہمارے قویٰ بیکار و معطل ہو جاتے ہیں۔ تو خواب ظاہر و واضح ہونے لگتے ہیں۔ اطباء کے نزدیک خواب دماغ میں کسی نقص کی موجودگی سے آتے ہیں۔ اس نظریے کے لحاظ سے مکمل ترین نیند موت کی طرح گہری ہونی چاہیے۔ چنانچہ بخار کی حالت میں زیادہ اور بڑے ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ لیکن تندرستی کی حالت میں جب انسان کو بہت میٹھی نیند آئی ہو تو خواب مقابلتاً کم آتے ہیں۔ یا نہایت دلکش اور شیریں خواب آتے ہیں۔

فلسفہ جدید میں بھی خواب کے متعلق بہت سے نظریے موجود ہیں۔ ڈیکارٹ سولھویں صدی کا سب سے بڑا فرینچ فلاسفر گذرا ہے۔ اور اس کو فلسفہ جدید کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا قول تھا کہ دنیا درحقیقت کچھ نہیں۔ یہ صرف ہمارا خیال یا وہم ہے۔ ورنہ سوائے خیال کے دنیا کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ ایک بہت طویل اور نہایت دلچسپ مسئلہ ہے۔ اور اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس نظریے کے مطابق چونکہ انسان ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت خواب دیکھتا رہتا ہے۔ مشہور جرمن فلاسفر کانٹ اور سر ڈبلیو ہملٹن بھی اسی خیال کے حامی تھے۔

سترھویں صدی عیسوی کے ایک انگریز فلاسفر کا خیال ہے کہ انسانی روح حیرت انگیز طاقتیں رکھتی ہے اور خواب دراصل کچھ نہیں صرف ان عجیب و غریب طاقتوں کا ایک کرشمہ ہے۔ اسیطرح اٹھارہویں صدی کے مشہور جرمن فلاسفر شوپن ہار کا خیال ہے کہ نیند کی حالت میں انسانی اعصاب حد درجہ اثر قبول کرنیکی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور ہر چیز ہر خیال اور ہر آواز و حرکت کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ اور وہ اثر دماغ کیطرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ وہاں پہنچکر یہ مشاہدات حقیقت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور انہی کو ہم خواب کہتے ہیں۔

اسی طرح بچوں اور حیوانات مثلاً کتا۔ بلی گھوڑا وغیرہ کے خواب دیکھنے کے متعلق مختلف نظریے موجود ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ بچے خواب نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ انسان پیدائش کے وقت سے خواب دیکھ سکتا ہے۔ غرض اس پر کوئی متفقہ فیصلہ موجود نہیں اور یہ مسئلہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

مشرقی شعراء کا حُسنِ انتخاب

(مقبول الٰہی داؤدی رکن ادارہ سیاست لاہور)

ایک شاعر کی تکمیل شاعری کے لئے جام شراب میخانہ اور بتکدہ ضروری لوازمات سے ہیں۔ لیکن ان سے بھی اہم چیز جو شاعری کے لئے لابدی اور لازمی ہے وہ کسی معشوق دلنواز کا انتخاب ہے۔ کیونکہ یہی شعراء کی شاعری کا جزو اعظم ہوتا ہے۔

کسی عورت پر عاشق ہونا ایک فطری جذبہ ہے کیونکہ شاعر کا منتہائے مقصود وصال محبوب ہی ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس مشرقی شعراء کا معشوق ایک خوبصورت لڑکا ہوتا ہے۔ جو ایک غیر فطری چیز ہے۔ اس معشوق کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس کی ایک خیالی تصویر اس کی لوح دل پر مرتسم ہوتی ہے۔ وہ دیکھے بغیر اس کے عشق میں قیس کی صحرا نوردی اور فرہاد کے جوئے شیر بہانے کے واقعات کو حقیر سمجھکر چار قدم اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر ان مشرقی شعراء کے کلام کو جمع کر کے ان کے خیالی معشوق کا سراپا کھینچا جائے تو وہ یقیناً ایک ہیبت کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ مثلاً مژگاں نیزے۔ آنکھیں ہرن کی مانند۔ ابرو خنجر، ناک تلوار، رخسارے سیب کی طرح۔ آتش دہاں مثبہ نقطہ نقطہ، دانت سلک گوہر۔ گردن صراحی دار۔ کمر بال سی باریک۔

ع　سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں

انگلیاں شاخ بید مجنوں کی طرح لرزاں۔ رفتار میں شاید اس لئے قیامت ڈھاتا ہے۔ کہ اس ہیئت کذائی سے اسے چلنا دشوار ہے۔ جب وہ باہر نکل کر صلائے دیدار عام دیتا ہے۔ تو عاشق مزاجوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اس کو دیکھنے کے لئے لگ جاتے ہیں۔ بادی النظر میں تو وہ شاعر کا نازک اندام معشوق ہوتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی "عجیب الخلقتی" کو دیکھکر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی شعراء نے ایک خوبصورت لڑکے کو اپنا معشوق کیوں قرار دیا ہے اور وہ کن حالات میں اس غیر فطری چیز کی طرف راغب ہوئے۔ کونسی چیز تھی جو انسان کو صنفِ لطیف کے حریم ناز سے نکالکر بتکدے میں لے آئی۔ اور اللہ اللہ کرنے کی بجائے انھوں نے کسی طفل برہمن کے عشق میں زنار گلے میں ڈالا اور اس کے نام کی مالا جپنی شروع کردی۔ یا کسی صنمکدہ میں جاکر سجدہ ریز ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ اردو شاعری پر فارسی شاعری کا اثر غالب ہے۔ اور یہ اس کی گود میں پرورش پاکر جوان ہوئی ہے۔ نیز یہ تمام چیزیں ایران سے آئی ہیں۔ اور اس کی ابتدا بھی ایران سے ہوئی ہے۔ اس لئے اردو شاعری

بھی اسی سے اثر پذیر ہوئی۔ یہی باعث ہے کہ اس امرد پرستی کو عجمی مذاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک واقعات و حقائق کا تعلق ہے یہ درست نہیں ہے۔ بظاہر تو یہ انکشاف نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب عربی شاعری کے کرشمے ہیں کیونکہ سب سے پہلے عرب شعراء نے ہی صنف نازک کے رشتہ الفت و محبت کو توڑ کر دیر و کنشت کے خوبصورت لڑکوں سے دل لگایا۔ اور ان کی شان معشوقیت کے افسانے اشعار میں قلمبند کئے۔ چونکہ عربی تہذیب کا اثر ایران والوں پر ہوا تھا۔ لہٰذا ان شعراء نے بھی عربی شعراء کی تقلید کی۔ اور کسی خوبصورت لڑکے کو ہی اپنا معشوق منتخب کیا۔ علی ہٰذا القیاس اس تخیل کا اثر اردو شاعری پر ہوا۔ لیکن یہ ایک ایسا چیز ہے۔ کہ جب تک تاریخی حیثیت سے اس پر روشنی نہ ڈالی جائیگی۔ آسانی سے عوام کے ذہن میں نہ آسکے گی۔ اس لئے ذیل میں عربی شاعری سے اردو شاعری تک کے مختلف دوائر پر مختصراً تنقید کی جاتی ہے۔

عربی شاعری

قبل از ظہور اسلام۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں عربی شاعری بام عروج پر جلوہ گر تھی۔ اس زمانہ کے شعراء کے کلام میں جو فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ اس کی مثال زمانۂ اسلام میں کم ملتی ہے۔ لیکن عربوں کی شاعری کا یہ طرہ امتیاز رہا۔ کہ ان کا عشق ہمیشہ فطری رہا۔ یہ چیز کبھی ان کے تخیل میں بھی نہ آئی ہوگی۔ کہ کسی خوبصورت لڑکے سے بھی عشق کیا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری اور ان کا عشق کسی عورت کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اور وہ بھی عموماً بنت عم (چچا کی لڑکی) یا وہ لڑکی جن سے ان کی شادی کے امکانات موجود ہوتے۔ ایسے بہت کم واقعات ہیں کہ کسی عربی شاعر نے غیر قبیلہ کی دوشیزہ سے اظہار محبت کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ صحرائی ملک ہونے کے باعث عرب کے لوگ اپنے اپنے قبیلوں کو لیکر ایسے مقام پر جا بستے۔ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا۔ کیونکہ یہی مقامات ہوتے۔ جہاں وہ اپنی معاش کی کوئی سبیل نکال سکتے تھے۔ دوسرا زرخیز علاقہ اس سے کوسوں دور ہوتا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنی شاعری کا مرکز قبیلہ کی کسی لڑکی کو ہی مقرر کرکے اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتے۔ کسی خودرو جھاڑی کی اوٹ میں اس سے پیار و محبت کی باتیں ہوتیں۔ نہایت پاکیزہ الفاظ میں اس سے اظہار محبت کرتے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی بہادری، سخاوت، شجاعت اور حسب و نسب کے قصے بیان کئے جاتے۔ اگر ان دونوں کی شادی ہو جاتی۔ تو وہ بلا تکلف اشعار میں اس کے نام کو بھی لکھتے۔ معشوق کے خاندان کی بہادری، سخاوت اور مہمان نوازی کے قصے سناتے۔ لیکن اگر ان کی محبوبہ کسی وجہ سے دوسرے قبیلے میں چلی جاتی یا ان کی آپس میں شادی نہ ہوتی تو اس کے فراق میں اپنی جان ہلکان کر دیتے۔ اپنی سابقہ حسین ملاقاتوں کو اشعار میں قلمبند کرکے اپنی حالت زار کا نقشہ کھینچتے۔ اور اگر موقع ملتا تو رات کی تاریکی

میں اس کے خیمے میں گھس جاتے اور اس کو بیدار کر کے باہر لے آتے۔ رات کی ٹھنڈی اور مست کن فضاؤں میں اس سے اظہارِ عشق کرتے۔ اپنی وفاؤں اور اس کی جفاؤں کا تذکرہ ہوتا۔ شاعر اپنے قبیلہ کے لوگوں کی جنگجوئی کا قصہ سناتے جس پر عربی محبوبہ وقار نسوانیت میں تن جاتی۔ اور اسے کہتی ہے کہ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے سدھارو۔ اگر میرے باپ۔ بھائی یا قبیلہ کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو وہ تمہاری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ تمہارے قبیلہ کو تہ تیغ کر دیں گے۔ تم جانتے نہیں کہ میرے قبیلہ کے لوگ کون ہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں ہوتا جب شادی کے تمام امکانات ختم ہو جاتے۔ عرب کا مشہور شاعر امراء القیس لکھتا ہے ؎

اے امراء القیس! یہ تیرا رونا پیٹنا اور اظہارِ اندوہ فراق کب تک جاری رہے گا۔ آخر تجھ کو ایسے ایام بھی تو نصیب ہوئے جن میں تو وصالِ محبوب سے حسب دلخواہ شاد کام ہوا"

لیکن اگر شادی ہو جاتی تو وہ اس کے دست نازک سے جام شراب طلب کرتے۔ اس کے حسن وجمال کی تعریف کرتے۔ اور اپنے نصیبے پر فخر و ناز کرتے۔ باوجود ان چیزوں کے ان کے خیالات واحساسات نہایت پاکیزہ ہوتے۔ غیرت وخودداری عاشق ومحبوبہ کا ہمیشہ طرہ امتیاز رہی۔ چنانچہ ایک عرب شاعر لکھتا ہے ؎

"جب اس محبوبہ سے وحشت دلانے والی باتیں ظاہر ہوئیں تو میں نے خوددار اور شریف الشان کی طرح اس سے علیحدگی اختیار کر لی:

فارسی اور اردو شعراء کی طرح وہ ذلیل نہ ہوتے تھے۔ وہ کوچہ محبوب کا کتا بننا پسند نہ کرتے تھے۔ جس طرح ایک اصفہانی شاعر لکھتا ہے ؎

میانِ ماوٗ سگِ یار فرق بسیار است ✤ چرا کہ ما سگِ اوئیم و او سگ یار است

اسی طرح ایک اور ایرانی شاعر لکھتا ہے ؎

چو با سگت نتوانم کہ عرضِ حال کنم
بخویش گویم و خود را سگت خیال کنم

عجمی معشوق میں دغا بازی، فریب کاری، مکاری، بازاری پن، رقیب نوازی، ستمگری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کے برعکس عرب کی محبوبہ باحیا اور سیم گو ہوتی ہے شاعر اس کی تعریف کرتا ہے۔ کہ

" نازک بدن ہے جب اس سے بہت باتیں کی جاتی ہیں۔ تو وہ حیا کی چاردیواری میں پناہ لیتی ہے۔ اور اگر گفتگو کرتی ہے تو نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم۔

اب مشرقی معشوق کی تعریف بھی سن لیجئے ؎

صفت ہے دوست کی جلاد و ظالم و غدار ✤ ستم شعار، دل آزار، بے وفا، مکار

عرب میں شاعری کا مذاق صرف مردوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ وہاں کی عورتیں بھی باکمال شاعرہ ہو گذری ہیں۔ لیکن زمانہ جاہلیت میں ان کی شاعری محض اس حد تک تھی کہ وہ اپنے خاندان یا اپنے قبیلے کی بہادری و شجاعت کے واقعات نظم کریں جنگ کے موقع پر وہ رجزیہ اشعار پڑھ کر اپنے مردوں کو شرم و غیرت دلائیں اپنی بزرگوں کے کارنامے سنا کر کٹ مرنے پر آمادہ کرتیں۔ یا زیادہ سے زیادہ اپنے بھائیوں یا کسی عزیز کی موت پر مراثی لکھتیں اور نوحہ خوانی کرتیں۔ زمانہ جاہلیت کی شیوا بیان شاعرہ ہند اپنے ایک عزیز عبداللہ کا اس طرح ماتم کرتی ہے:

عبداللہ کا ماتم کرتی ہوں وہ صبح کے وقت مارا گیا
وہ خود بھوکا رہتا لیکن مہمانوں کو کھانا کھلاتا
وہ بخیل نہیں تھا اور اسے بزرگی و شرف حاصل تھا۔

اس زمانہ کی ایک اور شاعرہ کبشیہ اپنے ایک عزیز کے قتل ہو جانے پر اپنی قوم کو یوں شرمندہ کرتی ہے۔

اب تم لوگوں سے بجز اس کے اور کچھ نہیں کہتی
کہ ہم نے اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا اگر تم لڑتے
تو وہ بچ جاتا۔ کاش
میں اپنے جوانمرگ کی خبر سنتی ہوں۔ کہ نہیں
نکلا آفتاب اس پر مگر یہ کہ اس نے نفع پہنچایا
(دوست کو) یا ضرر پہنچایا دشمن کو)

عرب شاعرات کے تذکرہ کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں آگے چلکر ان کے مقابلہ میں فارسی اور اردو شاعرات کے مذاق سخن کا بھی مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

عربی شاعری کا دوسرا دور

ظہور اسلام کے بعد بھی قریباً دو سو سال تک مردوں کی شاعری کا یہی رنگ رہا۔ لیکن عورتوں کی شاعری میں یک لخت تبدیلی آگئی۔ تاہم ان کی یہ تبدیلی ایسی نہ تھی کہ انھوں نے اپنی سابقہ روش کو ترک کر دیا ہو۔ بلکہ اب وہ اپنے جنا تی عشاق کے بیتابانہ جوش و خروش کا جواب اپنے پرسوز اشعار میں دینے لگیں۔ اور۔ ان کے عشق کی قدر کرنے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ کی شاعرات بھی اپنے عشاق شعراء کے ساتھ ساتھ شہرت کے آسمان پر چمکنے لگیں چنانچہ ام الکرام اپنے عاشق کی شان میں لکھتی ہے۔

"اے لوگو تعجب کرو۔ محبت کی آگ کیا ظلم کرتی ہے۔
اگر وہ نہ ہوتا تو چودھویں کے چاند پر افق سے تاریکی نہ پڑتی"

میرے لئے وہ جسے میں چاہتی ہوں۔ کافی ہے اگر وہ مجھ سے جدا ہو جائے
تو میرا دل بھی اس کے پیچھے ہو جائے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ عربی شاعری میں نعت شریف کا اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بدعت بھی بڑھی کہ بعض شریف زادیاں اس خواہش کا اظہار بھی کرنے لگیں کہ کوئی شاعر ان پر عاشق ہو۔ اور ان کے حسن و جمال کی تعریف کرے۔ یا اگر کسی غریب لڑکی کی تعریف کی جاتی۔ تو اس کی فی الفور شادی ہو جاتی۔ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں ایک عرب شاعر جس نے سب سے پہلے آنحضرت صلعم کی نعت لکھی تھی۔ تین ایسی بہنوں کی تعریف لکھی۔ جن کی شادی نہیں ہوتی تھی لیکن اشعار لکھنے کے فوراً بعد۔ شادی کے لئے درخواستیں آنی شروع ہو گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ وصف جو عشاق اور شعرائے عرب میں تھا۔ وہ یہ تھا کہ ان کا چال چلن نہایت اچھا ہوتا تھا۔

تیسرا دور

عربی شاعری کی قومی خصوصیات اسی وقت تک قائم رہ سکیں جب تک انھوں نے عرب سے باہر قدم نہ نکالا۔ لیکن جب اسلام کی فوج ظفر موج عربی راہواروں پر سوار ہو کر اپنے ملک سے باہر نکلی تو ان بادیہ نشینوں نے دنیا کو ایک عجیب رنگ میں دیکھا۔ کچھ عرصہ تک تو ان کے قبیلوں کی عورتیں بھی اکثر جنگلوں میں مردوں کے دوش بدوش رہیں۔ جب وہ ذرا آگے بڑھے تو بنت عم (چچا کی بیٹی) پیچھے ہی رہ گئی۔ لیکن شاعری کے لئے یہ نہایت ضروری تھا۔ کہ شاعری کا مرکز کوئی قبول صورت حسین ہو۔

عرب سے نکلتے ہی ان کی مڈبھیڑ عیسائیوں سے ہوئی۔ ان ایام میں روم شام اور عراق میں تثلیث پرستوں کے صدہا گرجے اور خانقاہیں تھیں۔ جن میں جبہ پوش راہبوں کے علاوہ نوخیز اور حسین لڑکے سادہ لیکن جاذب نظر لباس میں روحانی تعلیم حاصل کرتے۔ اور نفس کشی کے لئے چلے کاٹتے۔ ان کی سادگی اور معصومیت ان کے حسن میں ایسا عجیب بانکپن پیدا کر دیتی تھی۔ کہ عاشق مزاج پہلی ملاقات میں ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتے۔ ان گرجوں اور خانقاہوں کے متعلق مشہور تھا۔ کہ اگر حسینوں کے مجمع دیکھنے ہوں تو ان گرجوں میں چلے جاؤ۔ اس ارزانی حسن کا نتیجہ ظاہر تھا۔ عرب کے شاعر جو ازل سے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ ان خوبرو لونڈوں پر ریجھ گئے۔ آخر بیچارے کرتے بھی کیا۔ بنت عم تو اب ان سے چھوٹ چکی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امین الرشید اور ابونواس کے زمانے میں امرد پرستی عربی شاعری کا ایک ضروری جزو بن گئی۔ آہستہ آہستہ یہ مذاق ترقی کرتا گیا۔

حرم کے بسنے والے اب دیر میں کسی مسیحی لڑکے کی تلاش کرنے لگے۔ جس کے سینے پر صلیب لگی ہوئی ہو۔ اس زمانے میں عربوں نے علم و فضل میں بہت ترقی کر لی تھی۔ اس زمانے کے ایک مشہور اور زبردست شاعر ادیب اور عالم ملا

مدرک بن علی شیبانی کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ کہ ملا مدرک نوجوان طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک عیسائی لڑکا عمرو بن یوحنا بھی آپ کے درس میں شریک ہوگیا۔ لڑکا نہایت خوبصورت تھا جسے دیکھتے ہی مولانا غنیمت مرحوم کے شعر کے مصداق سے

بمکتب آمدہ طفل پری زاد
مبارکباد مرگِ تو بہ اُستاد

ملا صاحب دل دے بیٹھے کچھ عرصہ تو جبر کرکے اپنے جذبات کو چھپایا آخر ایک دن نہ رہا گیا۔ تو ایک رقعہ لڑکے کی طرف پھینکا۔ جس میں اظہار محبت و عشق کیا گیا تھا۔ اس زمانے کے لڑکے بھی آجکل کے کالجی نازنینوں کی طرح نہ تھے۔ رقعہ پڑھ کر عمرو نے انتہائی شرم محسوس کی اور اگلے دن سے مدرسہ میں آنا بند کر دیا۔ آخر جب ملا صاحب کو عشق نے زیادہ تنگ کیا۔ تو معشوق کی زیارت کے لئے گرجے کا طواف کرنے لگے۔ لیکن لڑکے نے کچھ توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملا صاحب بیمار ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں جنونی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب سوائے ع

دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

کوئی چارہ نہ تھا۔ جب حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ تو بعض لوگ بڑی منت وسماجت سے اس لڑکے کو ملا صاحب کے بسترِ مرگ پر لائے۔ آپ نے محبوب دلنواز کی صورت دیکھتے ہی چند اشعار حسب حال پڑھے۔ اور ایک آہ کے ساتھ جان دیدی۔ مرد پرستی کا یہ ایک ایسا واقعہ تھا۔ جس نے عوام کے قلوب پر گہرا اثر کیا۔ اب لوگ ایک جیّد عالم کی تقلید میں اس کو غیر معیوب خیال کرتے ہوئے اس طرف متوجہ ہوئے۔ ملا صاحب کی اپنی تمام شاعری عیسائی معشوق کے ہجر و فراق کی داستان کا المناک مرقع ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

میرا گناہ صرف یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن میرے افعال نے اسلام کو ناقص کر دیا ہے۔ کاش میں صلیب ہوتا۔ کہ وہ اسے چومتا۔ کرتہ ہوتا کہ اس کے سینے کے ساتھ لگ رہتا۔ زنار ہوتا کہ اس کی کمر کے ساتھ لپٹا رہتا۔

اس کے بعد تمام عیسائی بزرگوں کا واسطہ دیکر التجا کی گئی ہے۔ کہ "او ظالم میری حالت پر رحم کھا" اس طرح ایک مشہور عباسی شاعر دیر کے معشوق کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"گرجوں اور طیوں کے سایہ دار نشیمن پر خوب گھنگھور گھٹا برسی۔ نور کے تڑکے ابھی چڑیاں اپنے نشیمن سے بھی نہ نکلی تھیں۔ کہ راہبان دیر نے کھڑیال بجا بجا کر مجھے صبوحی پینے کے لئے بیدار کر دیا۔ وہ راہب جو سیاہ لباس پہنتے ہیں۔ ان میں اکثر خوبصورت ہیں۔ جن کی آنکھوں میں سحر کا سرمہ لگا ہوا ہے۔ پلکیں آنکھوں پر اپنی چلمنیں ڈالے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو محبت بھری نظروں سے راضی کرکے ملاقات کا وعدہ لیا۔ وہ رات کے لمبے کرتے میں

بدن چرائے ڈرتا ڈرتا آیا۔ میں نے شوق استقبال میں عاجزی کے ساتھ اپنے رخسارے بچھا دئے۔ وہ اس طرح دامنوں کو زمین پر کھینچتا ہوا چلا۔ کہ اس کے نقشِ قدم مٹتے چلے جا رہے تھے ہلال آسمان پر جلوہ گر ہو کر تمام عالم کو منور کر رہا تھا۔ اور خوف معلوم ہوتا تھا۔ کہ کہیں یہ ہمیں رسوا نہ کر دے۔ ہلال ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کا ناخن کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔ اس کے بعد جو ہوا میں اس کا ذکر نہ کرونگا۔ بس نہ بدگمانی کر اور نہ پوچھ۔"

لیکن یہ بھی نہیں ہوا کہ شعرائے عرب نے بنت عم کو کلیتہً بھلا دیا ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ان کی محبت عورت اور لڑکے کے عشق سے مخلوط ہو گئی۔ جب وہ کسی عورت سے اظہار تعشق کرتے تو وہ عموماً ان کے چچا کی بیٹی ہی ہوتی۔ لیکن جب وہ کسی خوبصورت لڑکے پر فریفتہ ہو کر اس کے حسن وجمال کی تعریف کرتے۔ تو وہ انھیں یہ کسی خانقاہ یا گرجے کے پائیں باغ میں بوٹوں کو پانی سے سیراب کرتا ملتا۔

فارسی شاعری پر اثر

ملحقہ عیسائی ممالک کو فتح کرنے کے بعد عربوں نے اپنی عنان توجہ ایران کی طرف موڑی۔ عربوں سے قبل ایران میں فارسی شاعری کا نشان نہیں ملتا۔ بفرضِ محال اگر تھی بھی تو آج اس کا نشان معدوم ہے عرب سے اتنی دور پہنچنے کے بعد چچا کی بیٹی کا خیال ہمیشہ کیلئے محو ہو گیا۔ اگرچہ یہاں گرجے اور خانقاہیں نہ تھیں جہاں وہ نوخیز عیسائی لڑکوں کو دیکھتے۔ لہٰذا انھیں اپنی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے آتش پرستوں کے معابد میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ شراب جو بغداد و شام میں عیسائی لڑکوں سے ملتی تھی یہاں آتش پرست حسینوں سے ملنے لگی۔ اور یہ پارسی ہوتے تھے۔ پارسی حسن آج بھی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا یہ بات مشہور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دولت اور حسن پارسیوں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ انھیں بتانِ پارسی کے متعلق کسی کا ایک شعر ہے۔ کہ ؎

از عجم آوردہ ام ایں داستانِ پارسی
ارمغانِ پارسی بہر بتانِ پارسی

بس پھر کیا تھا۔ عرب کے عاشق مزاجوں نے جب ان حسینوں کو دیکھا اور ان کے خرابات میں جان حسن نظر آئے۔ تو وہ چیز جسے وہ شام کے دیر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ زیادہ جڑ پکڑ گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ "امرد پرستی" شاعری کا ضروری جزو بن گئی۔ اور یہیں سے فارسی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمیشہ فاتح قوم کی تہذیب و تمدن اور اخلاق کا اثر مفتوح قوم پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کا معشوق ابتدا سے لڑکا ہی قرار پایا۔ جس پر شعرائے عجم نے خوب طبع آزمائی کی۔ غرضیکہ گرجا۔ خانقاہ۔ کنشت اور مدرسہ جہاں بھی انھیں خوبصورت لڑکا نظر آیا۔ یہ مر مٹے۔ جامیؒ لکھتے ہیں۔

ساکن خانقہ و مدرسہ ای باش کہ نیست ٭ کنج میخانہ نہ ماجز وطن بے وطناں

معشوق مدرسہ میں ہوا۔ تو سر راہ کھڑے رہے تاکہ وہ نکلے تو اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں ؎

یارمن در مکتب و من بر سر راہ منتظر
منتظر بارے کہ یارم با کتاب آید بروں

حافظ علیہ الرحمتہ کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ آپ کسی لڑکی پر عاشق تھے۔ جس کا نام شاخ نبات تھا۔ لیکن سارے دیوان میں عورت کی طرف اشارہ تک نہیں۔ بلکہ وہ تو اپنے معشوق کے ایک خال پر سمرقند و بخارا تک بخش دیتے ہیں لکھتے ہیں ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

غرضیکہ فارسی کے تمام شعراء کا معشوق متفقہ طور پر لڑکا ہی رہا۔

اس زمانہ میں ایران کی خواتین نے بھی میدان شاعری میں اپنی جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ چونکہ معشوق ایک لڑکا قرار پا چکا تھا۔ اس لئے ان عورتوں کی شاعری میں بھی یہی رنگ غالب رہا۔ وہ بالکل یہ بھول گئیں۔ کہ ہم عورتیں ہیں۔ اشعار میں وہ اپنے آپ کو بھی مردانہ ظاہر کرتیں۔ اور اپنے معشوق کو بھی مرد بناتیں۔ اور وہی تشبیہات و استعارات استعمال کئے جو مردوں کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ چنانچہ ایران کی ایک شیوا بیان شاعرہ زنانہ کی لکھتی ہے ؎

ناصحا چند کنی منع من از عشق بتاں
من ز استاد ازل ایں قدر آموختہ ام
تا کہ پری بہر طواف حرم کوئے کسے
صبح خیزی ز نسیم سحر آموختہ ام

اس ازلی سبق یاد کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہزار بار کہنے پر بھی وہ خود بخود سوئے صنم جانے لگیں۔ چنانچہ ایک شاعرہ لکھتی ہے ؎

من میدوم سوئے حرم دل میکشد سوئے صنم
من می روم جائے وگر دل می رود جائے دگر

ہندوستان میں اردو شاعری

مسلمانان ایران جب ایک فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ تو گذشتہ کے لڑکوں کی یاد تازہ شاعری کا اثر لیکر آئے یہاں آکر ان کی آتش عشق اور بھڑکی۔ کیونکہ دیر اور خانقاہ کے خوبصورت لڑکوں کی

جو تعریف عرب شعراء نے کی تھی۔ یا انھوں نے پارسی لڑکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ انہیں یہاں کے مندروں کے اندر طفل برہمن کی صورت میں نظر آئے۔

بنارس ہندوؤں کا ایک متبرک تیرتھ ہے۔ جہاں طول و عرض ہند سے ہزارہا یاتری جاتے ہیں۔ چونکہ ہندو قوم کے تمام مذہبی مراسم پنڈت کے سوا کوئی دوسرا آدمی ادا نہیں کر سکتا۔ اسی باعث بنارس میں برہمنوں کی بہت زیادہ تعداد ہے۔ ان شعراء کو جب برہمن زادوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ تو وہیں کے ہو رہے۔ شیخ علی حزیں وہاں پہنچے۔ تو بے اختیار کہہ اُٹھے ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

اور شاید یہی باعث ہے کہ آپ کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ اور مرنے کے بعد بھی بنارس میں ہی رہے۔ ابتدا میں تو فارسی اشعار میں برہمن زادوں اور مندروں کی تعریف ہوتی رہی۔ اس کے بعد اردو شاعری نے جنم لیا۔ چونکہ اس زبان نے فارسی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے اس پر فارسیت کا رنگ غالب رہا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شعراء نے بھی فارسی والوں کی تقلید کی۔ انہوں نے کوئی نیا معشوق تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور فارسی شعراء سے ہی دیر و کنشت کے معشوق عاریتاً لے لئے۔ لیکن اس کے ساتھ اتنا اضافہ ضرور کیا کہ ہندوؤں کے بتکدوں کی بھی سیر کرنے لگے۔ اور معشوق کو ایک بت بنا دیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پجاریوں کے لڑکوں اور برہمن زادوں پر تو شعراء کی رال ٹپک پڑی اور انہیں بت بنا کر پوجا کے لئے جھکے۔ لیکن مندروں میں جو اصل خوفناک بت نصب تھے ان کی طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شاید اس لئے کہ ان کے پُر ہیبت اور خوفناک چہرے اور کئی کئی سر دیکھ کر ان کے اپنے حواس بجا نہیں رہے ہوں گے۔ اگرچہ ان مندروں میں دیویوں کی خوبصورت مورتیاں بھی تھیں۔ لیکن فارسیت کے غالب اثر نے ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی مہلت نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان بت خانوں میں اپنے خیالی (معشوق) کی پوجا کرتے رہے۔ گلے میں زنار ڈالا۔ ماتھے پر سیندور کا قشقہ لگایا۔ اور ؎

حرم کو چھوڑ کے دائرہ قیام کر لیں گے
خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

کا ورد کرنے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ کبھی کبھی عالم خیال میں دیر و کنشت کی سیر کو چلے جاتے تھے۔ حضرت سراج الدین ظفر کا ایک شعر ہے ؎

لگا کے آگ محبت کی سینہ و دل میں ؛ تمہاری یاد میں بیٹھے ہیں آ بتان کنشت

اشعار کی تفصیلات میں پڑ کر میں اپنے مضمون کو طویل کر کے قارئین کے لئے باعث زحمت نہیں بنانا چاہتا۔ کیونکہ اردو شاعری کی "امرد پرستی" سے ہر کہ و مہ واقف ہے۔ انہیں تو کبھی بھول کر بھی بنت عم کیا کسی عورت تک کا خیال نہیں آیا۔ صرف یہاں میں میر تقی کا ایک شعر درج کرتا ہوں۔ آپ لکھتے ہیں ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اب میں صرف یہاں ہندوستان کی بعض اردو شاعرات کے شعر نقل کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح ایرانی شاعرات نے اپنا معشوق ایک لڑکے کو قرار دیا تھا۔ وہی اثر ہندوستان کی عورتوں پر ہوا۔ اور انہوں نے بھی ایک مرد معشوق کے ہجر و فراق میں شب کی کٹھن گھڑیاں گذارنی شروع کیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی بھی تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو عورت ظاہر کیا۔ چنانچہ وہی ایک شاعرہ ذلیل لکھتی ہے ؎

نہ سے اللہ رکھے اپنی اماں میں تم کو
ہم سی پریوں کو بھی دیوانہ بنا لیتے ہو

اسی طرح ایک اور شاعرہ جمعیت جو پورشٹین نسل کی تھی لکھتی ہے ؎

رو رہا ہے ہمارا جو وہ دلبر کسی دن سے
اس واسطے رہتی ہوں میں منتظر ہر دن سے

لیکن ان خواتین کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس کے برعکس دوسری عورتوں کی شاعری بالکل مردوں جیسی ہے الہ آباد کی منی بائی حجاب کا ایک شعر ہے ؎

کھونگا داور محشر کے آگے حشر میں یہ بھی
کہ عمر بھر اسی کافر کو میں نے پیار کیا

امیر بیگم اسیر دہلوی کا ایک شعر ہے ؎

خاک میں مل گئے ہو جب اسیر
ان کے دل میں غبار ہے اپنا

متذکرہ بالا ہر دو اشعار میں "اگر کہونگا" کی بجائے "کہونگی" اور "مل گئے" کی بجائے "مل گئی" ہوتا تو حقیقت واضح ہو جاتی کہ یہ کسی عورت کے شعر ہیں۔ اس پر لطف یہ ہے کہ اگرچہ ان کا معشوق ایک مرد ہی ہوتا ہے اور خود جنس لطیف۔ لیکن شاعری میں اس کی نزاکت کی وہ تعریف کرتی ہیں کہ کسی نازک سے نازک عورت میں کم ملے گی۔ رام پور کی ایک مشہور شاعرہ ہو بیگم لکھتی ہے ؎

شب بزم ملاقات میں ہرچند یہ چاہا
آنکھیں تو لڑاؤں ذرا اس رشک قمر سے
پر خوف میرے دل میں یہی آیا کہ ہے ہے
نازک ہے نہ دب جائے کہیں بار نظر سے

لیکن اردو کی موجودہ شاعری بہت کچھ ترقی کر گئی ہے۔ نئے نئے شعرا اس میں جدتیں پیدا کر رہے ہیں۔ جدید تعلیم نے ہر مدرسہ اور کالج کو دیر و کنشت کا ہم پلّہ بنا دیا ہے۔ گر بتکدہ کے متعلق کوئی شعر لکھتے بھی ہیں۔ تو صرف ایک خیالی معشوق کی تعریف کرتے ہیں۔ جنہیں انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور بزرگوں سے انھیں ورثہ ملا ہے۔ البتہ آجکل کالجوں کے حسینوں پر جو شاعری ہوتی ہے وہ اپنے اندر کچھ حقیقت رکھتی ہے۔ بتخانوں کو اب صرف تشبیہہ اور استعارہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پنجاب کے نوجوان شاعر حضرت سراج الدین صاحب ظفر بی۔ اے نوجوان طبقہ میں ایک ملند پایہ رکھتے ہیں۔ آپ نے حال ہی میں ایک نظم یوئینگ ہال کے نام سے ہمایوں کے افسانہ نمبر میں شایع کرائی ہے۔ یوئینگ ہال ایف۔ سی کالج لاہور کا ایک ہوسٹل ہے۔ جس میں طلبہ رہتے ہیں۔ حضرت ظفر کا شاہکار اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ اپنے بزرگوں کی روش پر چلیں۔ خیر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ؎

یہ ایوئینگ ہال یہ انوار کا پر کیف کاشانہ
یہ میخانے کا میخانہ یہ بتخانے کا بتخانہ
تجلی خانہ یہ بانکے سجیلے نوجوانوں کا!
امیں حسن و محبت کی منوہر داستانوں کا
یہ ہے کاشانہ حسن و دلبری کے شاہزادوں کا
یہاں رہتا ہے مجمع پریم پیاسے نامرادوں کا
یہ ہے تیر تہ بتوں کی مدھ بھری نیچی نگاہوں کا
یہاں چڑھتا ہے نذرانہ قیامت خیز آہوں کا
یہاں برسات کا موسم ہو یا موسم ہو جاڑے کا
نظر کے سامنے منظر ہے اندر کے اکھاڑے کا
یہاں کی صبح کو صبح بنارس بر ملا کہئے!
یہاں کی شام کو شام اودھ کا آئینہ کہئے!

نگاہوں سے چلائیں تیر اگر یہ تند خو ہو کر
گرے ارجن کے ہاتھوں سے کماں بے آبرو ہو کر

سرِ شام ان دریچوں میں دیے یوں جھلملاتے ہیں
برہمن جس طرح بت خانے میں چندن جلاتے ہیں
یہاں کے رہنے والے دل کی ناؤ کے کھویا ہیں
اگر گوکل کا بن اس کو کہیں تو یہ کنہیا ہیں

یہ موجودہ زمانہ کے شعراء کی ذہنیت کا ایک مختصر خاکہ ہے اور دراصل یہ بزرگوں کی تقلید میں ہے۔ جو بالکل غیر فطری چیز ہے۔ کسی شاعر کا ایک شعر ہے ؎

خدا جو پوچھے گا کیوں جان دی جوانی میں
تجھے دکھا کے کہونگا کہ اس جواں کے لئے

خیال فرمائیے کہ کس قدر غیر فطری شاعری ہے۔ ایک آدمی کا یہ کہنا کہ میں نے اس "جوان" کے لئے جان دی ہے مضحکہ خیز ہے۔ اگر صیغہ تذکیر کو تانیث سے بدل دیا جاتا تو پھر بھی کوئی بات بن سکتی تھی یعنی ؎

خدا جو پوچھے گا کیوں جان دی جوانی میں
تجھے دکھا کے کہوں گی کہ اس جواں کے لئے

لیکن یہ امر باعث غنیمت ہے کہ امرد پرستی کے اس بے پناہ سیلاب سے بچکر حضرت اختر شیرانی نے اردو شاعری کی کایا پلٹ دی ہے۔ آپ کی تمام شاعری میں صرف عورت کو خطاب کیا گیا ہے۔ آپ کے اشعار کے مطالعہ سے عرب کی پہلی شاعری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ حضرت اختر کی محبوبہ سلمیٰ اور عذرا ہیں چنانچہ آپ لکھتے ہیں ؎

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرش گل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بس کرو او میری مدہوش والی آنکھو بس کرو
اب تو اپنے جور پر وہ بھی پشیماں ہو گئیں

اس کی شاعری کا مخاطب مذکر نہیں۔ بلکہ مؤنث ہے۔ یہ محض ضمائر کی فریب دہی نہیں بلکہ یہ محبوب مخاطب واقعی ایک پردہ نشین ہستی ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل شعر میں باوجود ضمیر مذکور کے صاف طور پر اشارہ ہے

آنکھوں نے ذرے ذرے پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا مرا پردہ نشیں کہاں

"چلی گئیں" کے عنوان سے ایک نظم جو لاہور کی کسی خاص مجلسی انجمن "سبھا" کی رنگینیوں کے اثرات کا نتیجہ ہے اور جسے اودھ پنچ نے اپنی تنقیدی روایات کے ماتحت سرفراز تعریف بھی فرمایا تھا۔ اس کے ایک دو شعر

یونان کے شوخ و شنگ کماندار کی طرح
ننھا سا ایک تیر چلا کر چلی گئیں
جادو کر رہی تھیں نشیلی نگاہ سے
ساری "سبھا" کو اپنا بنا کر چلی گئیں

ادائے پردہ کتنی دلنشیں معلوم ہوتی ہے
پسِ پردہ کوئی ناز آفریں معلوم ہوتی ہے

ایک دفعہ انجمن ارباب علم کی ایک مجلس مباحثہ میں جب یہ تذکرہ چھڑا۔ کہ شعراء کا معشوق کون ہے؟ تو سر عبد القادر صاحب نے فرمایا تھا۔ کہ اس تذکیر کے پردہ میں دراصل کوئی پردہ نشین ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں اختر صاحب نے فرمایا۔ کہ غالب کا شعر ہے

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مشرقی شعراء کا معشوق درحقیقت لڑکا ہی ہوتا ہے۔ کسی عورت کے لئے سبزہ خط کوئی نہیں لکھتا۔ تاہم یہ امر باغنیمت ہے کہ حضرت اختر نے دنیائے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے اکثر شاگرد آپ کے نقشِ قدم پہ چل رہے ہیں۔ باوجود انتہائی اختصار سے کام لینے کے مضمون کافی طویل ہو گیا ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ مضمون نہایت دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

فلسفۂ علم

محترمہ عابدہ بیگم فاطمہ بیگم پریسیڈنٹ و سیکرٹری انجمن خواتین موہن گوالیار سٹیٹ

علم کے معنی جاننا خواہ کوئی زبان ہو یا کوئی حکمت ہو یا علم ہو اور دنیا میں بے انتہا علوم اور زبانیں اور حکمتیں ہیں اور تمام علوم اور زبانیں اور حکمتیں ایک آدمی نہیں سیکھ سکتا۔ لہٰذا انسان اپنی ضروریات و لوازم زندگی کے لئے جو لائن پسند کرتا ہو اس کو اختیار کرے۔ اور اس کی تمام حکمتیں و حقائق سے واقف و تجربہ کار ہونا چاہیئے۔ اور جو علم یا زبان اس کے لئے سیکھنا ضروری ہو۔ وہ حاصل کرے۔ تاکہ اس میں پختہ کار و استعداد مانا جاسکے۔ لیکن انسان کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ دنیا کی چیز کا علم بھی مانند دریائے بے پایاں کے ہے۔ اور اس کو عبور کرنے کے لئے انسان کی زندگی مستعار بالکل ناکافی ہے اس لئے بقدر استطاعت خوب کوشش کرے۔ اسی طرح عورت جو کہ امور خانہ داری۔ تربیت اطفال کے لئے مخصوص و مسلم ہے تا وقتیکہ وہ تمام محاسن نسوانی کا علم حاصل کرے قابل وقعت نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ کتنی ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو۔ اگر محاسن نسوانی نہ رکھتی ہو تو اس کی ڈگریاں بی۔ اے۔ ایم۔ اے اس کو دنیا میں ہرگز سرفراز نہیں کر سکتیں لہٰذا ہر ایک عورت کو سب سے پہلے امور خانہ داری اور تربیت اطفال سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اکثر بیشتر ہمارے کم فہم بھائی بہنیں زبان انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ اردو جان کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہفت زباندان قابل تعریف و صد ستائش ہیں۔ کیونکہ ہمارا علم نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم نہایت قابل اور بہت لائق فائق ہیں۔ بے شک یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے جو شخص وہ نکتہ جانتا ہو۔ وہ ضرور قابلیت والا ہے ورنہ صرف کسی زبان کا جاننا ہی دلیل قابلیت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس ذکر سے میری غرض یہ ہے۔ کہ دنیا کی تمام زبانیں جاننے والوں میں اکثر احمق اور بے وقوف ملیں گے۔ کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ دنیا کے زبان دان اور علم والے سب کے سب عقلمند و فرزانہ ہوں۔ پس نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر زبان دان خواہ وہ کئی زبانوں کا جاننے والا ہو۔ عقلمند اور دوربین ہی ہوگا۔ پس یہی نکتہ ہے۔ کہ ہر زبان کچھ نہ کچھ جوہر علم کی سرمایہ دار ہوا کرتی ہے

پس ہر زبان کے جوہر علم کو اپنے سینے کے خزینہ میں بھر لیا جائے۔ تو ہر زبان کا جاننا قابل فخر و ناز ہے ورنہ صرف زبان کا جاننا کیا فائدہ رکھتا ہے۔ پختگی علم یہی ہے۔ کہ جوہر علم سے جیب و دامن بھرے جائیں۔ دنیا میں بہت سے ایم۔ اے۔ بی اے احمق ملیں گے بہت عالم فاضل نرے بیوقوف نظر آئیں گے۔ یہ کیا ہے۔ یہی بات ہے۔ کہ خالی از جوہر علم ہونا۔ برعکس اس کے آپ نے بہت سے جاہلوں کو مدبر اور عقلمند دیکھا ہوگا۔ وہ کیا ہے وہ یہ ہے

کہ وہ علم تو نہیں جانتے۔ لیکن علماء کی خدمت میں بیٹھ اٹھکر جوھر علم حاصل کر لیتے ہیں۔ حقیقتاً علم کیا ہے۔ جوہر علم ہی ایک چیز ہے۔ اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے۔ کہ اول تو وہ ان باتوں کا علم حاصل کرے۔ جو اس کے لوازم زندگی کے لئے درکار ہوں۔ دوئم جو زبان سیکھے اس کے جوہر پر برابر نظر رکھے۔ بیکار باتوں کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے لایعنی ہے۔ دنیا کا کوئی علم بیکار نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کہ دنیا کے اندر جو شخص اپنے آپ کو جس کام کے لئے مخصوص کرلے۔ اس کے لئے اسی کا علم ضروری ہے۔ ورنہ سب بیکار۔ کیونکہ دوسری باتوں کا علم حاصل کرنے میں جتنا وقت انسان گذارے گا۔ گویا وہ اپنے عرصۂ زندگی کو اپنے اوپر تنگ کرے گا۔ اور اپنے کام کو خام کیونکہ ایام زندگی میں افزونی کا ہونا ناممکنات سے ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ مذہب انسان کا سب سے پہلا لازمہ زندگی ہے۔ اس لئے امور مذہبی کا علم ہر مرد اور ہر عورت کے لئے سب سے پہلا علم ہے۔

فلسفۂ عمل

اس بات کو ہر شخص سمجھتا ہے۔ کہ دنیا میں جتنے کام ہیں اور جتنی باتیں ہیں۔ سب کے اندر خاص ترکیب اور راز ہوتا ہے علم کے لئے جوہر علم درکار ہے اور عمل کے لئے بظاہر تو حوصلہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک پوشیدہ ترکیب بھی ہے غور کرنے کا مقام ہے کہ جتنا علم اور زبانیں اس زمانہ میں لوگ حاصل کر رہے ہیں۔ اتنی افزونی علم زمانہ گذشتہ میں نہ تھی۔ اور نہ ایسی درسگاہیں اور نہ یونیورسٹیاں اور کالج اگلے زمانہ میں تھے اس زمانہ کے مقابلے میں دیکھا جائے۔ تو اگلے زمانے کے لوگ دوسری زبان بھی اس قدر نہ جانتے تھے۔ جتنی کہ اب جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں متقدمین نے جو جو تجربے اور حکمتیں حاصل کی تھیں انہیں کتابوں میں محفوظ کر کے ہم تک پہنچا دی ہیں۔ اور اس کے علاوہ اب جو ہم نے دوسری زبانیں سیکھی ہیں۔ ان زبان والوں کی حکمتیں اور تجربے بھی ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ نیز اتنا علم حاصل کرنے کی بدولت ہمارے دماغ بھی روشن اور منور ہو گئے ہیں اور بچہ بچہ کی زبان پر اکثر وہ مقولے چڑھے ہوئے ہیں۔ جو بڑے بڑے عقلاد و فضلا، ارسطو۔ افلاطون کیلئے مخصوص تھے پھر کیا وجہ ہے۔ کہ آج دنیا کا تمام نظام پلٹا ہوا ہے آجکل کے پڑھے ہوئے جن کسی سے ہارے نہیں اترتے ہر گھر میں چھوٹوں بڑوں کے استاد نظر آتے ہیں۔ اور واقعی بات بھی معقول کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی تنزل میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا جو سبب ہے۔ بہت غور کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ اس زمانہ میں علم بے عمل حاصل کیا جا رہا ہے، فلسفۂ علم کے متعلق میں پہلے بحث کر چکی ہوں۔ کہ علم بجائے خود کچھ نہیں جوہر علم ہی ایک چیز ہے جس نے علم کی ضرورت پیش کی۔ اسیطرح جوہر علم بے عمل بیکار ہے۔ اس میں ہمارے بھائی اور بہنوں کی صرف اتنی غلطی ہے۔ کہ انہوں نے فلسفۂ عمل پر آجتک غور نہیں کیا۔ ورنہ اتنا علم حاصل کرنے کے بعد تو نہ معلوم انسان کیا شے ہو جاتے۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے زمانے میں جوہر علم سینہ بسینہ رہتا تھا۔ اور آجکل کے زمانہ میں جوہر علم کتاب در کتاب چلتا ہے

اگلے زمانے میں اگر علم کی قیمت ایک کروڑ تھی۔ تو اب ایک کوڑی ہی رہ گئی ہے۔ اسلیئے کہ جو شخص پہلے اپنے استاد کی خدمت برسوں کرتا تھا تب اُسے کچھ علم حاصل ہوتا تھا۔ وُہ بھی جب کہ شاگرد استاد کے پیچھے تباہ ہوئے علم کا عامل ہو جائے اور اس کا عادی ہو جائے۔ تب کہیں دوسری بات اسکو بتائی جاتی تھی۔ اس طرح پر شاگرد کی عمر کا نصف حصہ بلکہ اکثر نصف سے بھی زائد حصہ صرف حصول علم و عمل ہو جاتا تھا۔ تب جا کر وہ بجائے خود ایک افلاطون ہوتا تھا۔ اور اسکی صحبت میں بیٹھنے والے بھی عقلمند اور ذہین ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ میں استاد کی عظمت بھی والدین کے برابر تھی۔ اس زمانہ کیطرح استاد کالجوں میں شاگردوں کے ہاتھوں سے دھڑا دھڑ نہ پٹتے تھے۔ اسلیئے کہ لڑکے سمجھتے ہیں کہ استاد کو مار کر نکال دینگے تو ہمارا کیا نقصان ہوگا۔ اس کی جگہ دس اور آجائینگے۔ اور اگلے زمانہ میں یہ بات بھلا کہاں میسر تھی۔ کیونکہ استادی عام پیشہ نہ تھا۔ بمشکل اُستاد نصیب ہوتا تھا۔ پھر وُہ استاد اپنے اسی شاگرد کو علم زیادہ بتاتا تھا۔ جو زیادہ سعادتمند اور ...... ہوتا تھا؛

پس اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ انسان کو تمام مقولات خردمندی سے اپنے کان بہرے کر لینے چاہیئں اور صرف ایک مقولے پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور جب اس کا عمل ہو جائے۔ تو پھر حسب ضرورت حسب پسند دوسرے پر عمل کرنا شروع کرے۔ یہی ہے وُہ ترکیب جسے فلسفۂ عمل کہا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح عمل کرتے کرتے انسان ایکدن بہت بڑا آدمی بن سکے گا۔ اور اس کا ایک ایک مشورہ لاکھوں روپے کا ہوگا۔ آجکل کی زیادہ تر کتابیں جواہر ریزوں سے مزیّن ہیں انسان اُن پر حریصانہ نگاہیں ڈالتا ہے اکثر ان کو اپنے ذہن نشین کرتا ہے اور اکثر ان کا عامل بننا چاہتا ہے لیکن اسی اثنا میں دوسرے جواہر ریزوں کی چمک اس کی نگاہ کو خیرہ کر دیتی ہے۔ وُہ انہیں چھوڑ کر ان دوسرے جواہر ریزوں پر لپکتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اب بھی دنیا میں معدودے چند عقلمند نظر آتے ہیں۔ کہ وہ ہمیشہ اپنے اصول کے پابند ہوتے ہیں۔ اور ان کا علم باعمل ہوتا ہے۔ اور علم باعمل جب ہی ہوتا ہے۔ کہ جب انسان جتنا علم حاصل کرے اس کا ساتھ ہی ساتھ عامل بھی ہوتا جائے۔ ورنہ دیوانوں کی طرح بازار علم و عمل میں دھکے کھاتے پھرنا اور خالی ہاتھ رہنا چہ معنی دارد۔

پس

میری بہنوں اور میرے بھائیو لازم آیا۔ کہ تم پہلے مذہبی علم حاصل کرو۔ اور پھر تمہارا دوسرا قدم اس علم کے لیئے اُٹھنا چاہیئے۔ جو تمہارے لوازم زندگی سے ہو۔ اس کے بعد اس کے جوہر پر پہلے نظر کرو اور پھر جوہر مسلم کے ساتھ ہی ساتھ عامل بنو۔ ورنہ یہ کل تمہاری ترقیاں کھوکھلی اور معکوس متصور ہوں گی؛

بر رسولاں بلاغ باشد و بس



سعادتمندی

Durga Art Press Anarkali Lahore

افسانہ

احساس ندامت

(از جناب سید مبارک حسین شاہ صاحب۔ عاجزؔ سرحدی)

شب ماہ کا حصہ اولین تھا۔ مرزا اشرف بیگ رئیس کی وسیع سفید پتھروں سے بنی ہوئی خوبصورت آراستہ اور شاندار کوٹھی میں مختلف الانواع برقی روشنیاں ریاض خلد کی رنگینیوں کا جلوہ پیدا کر رہی تھیں۔ وسط میں ایک حوض کا نیلگوں پانی ہوا کے لطیف جھونکوں سے مستانہ روشرابی کی طرح ہچکولے کھاتا ہوا کوئی آبی نغمہ الاپ رہا تھا۔ ستارے چھٹک رہے تھے۔ ہوا نمناک اور فرحت بخش تھی۔ نیرنگ فطرت کی اس [illegible] کیفیت تمام میں مرزا اشرف بیگ کے بڑے بیٹے مرزا سکندر بیگ کی منگنی کی تقریب کی وجہ سے کوٹھی میں غیر [illegible] رونق اور چہل پہل تھی۔ بینڈ بجر ہے بجتے۔ بربط مترنم کے سحر پاش نغمے سامعہ نوازی میں مصروف تھے۔ موسیقی کی دلکش تانیں، شعر و سخن کا [illegible] اور اتحاد و گھونگروں کی جھنکاریں اور طبلوں کی تھاپ کی آوازیں فضا میں دور تک موسیقی کی لہریں پھیلا رہی تھیں۔ خوش و خرم مہمانوں کے اجتماع میں بے تکلف اور ہم عمر احباب کے آزاد قہقہے دور تک سنائی دے رہے تھے۔ عیش و مسرت کی اس رنگین محفل میں لذت روح کے تمام سامان مہیا تھے۔ مگر اس کے باوجود ایسی فراوانئ تنعم سے لبریز انجمن میں مرزا سکندر بیگ کچھ پریشان خاطر اور بے چین سا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے سے مسرت کا [illegible]۔ وہ بناوٹی مسرت اور زیر خندی کے تصنع سے رسمی طور پر میزبانی کے فرائض بجا لا رہا تھا۔ مگر درحقیقت وہ کسی قلبی الجھن میں مبتلا تھا۔ انتظار کی پریشانی اس کے حرکات و اشارات سے نمایاں تھی۔ اس کی مشوش و تجسس آمیز نگاہیں بار بار کوٹھی کے پھاٹک کی جانب اٹھتی تھیں۔ اور وہ یکسر پیکر تلاش معلوم ہوتا تھا۔ موجودہ سامان نشاط اس کی بیتاب و متلاشی نگاہوں میں کسی انوکھی چیز کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے قطعاً اس اجتماع سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ مہمانوں کے اس کثیر مجمع کے مرخص ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یکے بعد دیگرے مہمان رخصت ہوتے گئے۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ سکندر مرزا کی قلبی الجھنوں کو تسکین و اطمینان میں مبدل کرنے والی ایک موٹر برقی نگاہوں سے نور پاشی کرتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ چشم اسید کی تمام مایوسیاں شادمانیوں میں بدل گئیں۔ مسرت کی ایک بسیط لہر سکندر کے چہرے پر دوڑ گئی۔ فرط انبساط سے سکندر کی منتظر آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک پیدا ہوگئی۔ یہ سہراب جی مرحوم کی نور نظر، مستی و شباب کی حسین و جمیل پیکر ناز آفریں اداؤں سے متین۔ نگاہوں سے شوخ، گفتار اور تہذیب سے سنجیدہ۔ متبسم لبوں سے بجلیاں گراتی ہوئی۔ پوڈر سینٹ اور مست کن خوشبویات میں بسی ہوئی۔ بیش قیمت ریشمی ملبوسات پہنے اپنے مخصوص انداز دلربائی اور مسحور کن خرامان رفتاری سے سبزہ کو پامال کرتی ہوئی کوٹھی کے ہال میں داخل ہوئی۔ کوٹھی کی تمام آرائش از سر نو [illegible]

بڑھ گئی۔

ہیلو مس کملا۔ آپ نے تو آج بہت دیر کر دی مسکندر نے کہا۔

بیشک مسٹر سکندر۔ معاف فرمایئے۔ میں تنہائی میں ہی ملنا چاہتی تھی + کملا ایسی بدنصیب کے محبوب کی مبارکبادی کی ضرورت مجھے مجبوراً یہاں تک کھینچ لائی۔ ورنہ اور یہاں اس کے لئے کونسا سامان مسرت موجود تھا۔ جو وہ ایسے موقع پر خواہ مخواہ مخل ہو کر باعث تکلیف ہوتی۔ افسوس لاعلمی اور ظاہر داریاں کتنی خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ مجھ سے پیار و الفت کے دعوے۔ اور در پردہ............منگنی.........

مگر مس کملا۔ اس غلط فہمی کو دور کرانے کے لئے یقیناً میرے پاس معقول وجوہات ہیں۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ کل صبح تک اس نئے ہونیوالے واقعات سے میں اتنا ہی لاعلم تھا۔ جتنا کہ آپ۔ اور مجھے کل دوپہر کو ہی معلوم ہوا کہ شیخ محسن احمد ریٹائرڈ سب جج کی دختر جمیلہ خاتون مجھ سے وابستہ کی جانے والی ہیں۔ میں نے ہر چند بغیر سوچے سمجھے اس رشتہ کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر موجودہ رسومات کی فولادی زنجیریں مجھے آزاد نہ دیکھ سکیں۔ اور میں نے مس کملا کو صورت حالات سے آگاہ کرنے کیلئے کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

سکندر، وڈیر۔ ان زنجیروں کی موجودگی میں گرفتار الفت کملا کے پاس کوئی ایسا دوسرا اوزار نہیں جو انہیں توڑ کر تجھے اپنے دام الفت میں پھنسا سکے۔ یہ دائمی اور مستقل رشتہ اس عارضی اور خام تعلقات کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ قوی ہے۔ پھر تمہاری بے لوث محبت کا دم بھرنیوالی وہ کملا جس کے بے خبر و معصوم دلکو تجھ ایسے دھوکے باز مکار ساحر نے ایک ہی نگاہ میں مجروح و مقید کر لیا ہو۔ اور جس کو تمہارے تا بہ لب گور محبت کرنے کے سنہری وعدوں اور تمہاری مخلصانہ طرز محبت کی تسخیر کن جادوگری نے اپنی تمام قوم میں اعتراضات و طعن و تشنیع کا نشانہ بنا رکھا ہو۔ وہ تمہاری اس ستمگرانہ بے اعتنائی اور وعدہ شکنی پر اپنے تمام مٹے ہوئے ارمانوں۔ مسمار شدہ تمناؤں اور شکستہ امیدوں کی کیوں نہ قیمت طلب کرے۔

کملا۔ اس قدر یاس انگیز کلمات سننے کی تاب سکندر کے پُر آزرد اور لبریز محبت دل میں نہیں۔ میری دماغی قوتیں تیری لطف فرمائیوں کو کبھی نہیں بھول سکیتں۔ محبت کی وہ مخمور کن مے جو تیری رسیلی آنکھوں سے چھلک کر میری رگ رگ میں حلاوت انگیز خمار پیدا کر رہی ہے۔ اس کا سرور پرور نظارہ تیرے میخانے کو نہیں بھول سکتا ہے۔ زمانہ کا کوئی انقلاب تجھے میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتا۔ یہ رسمی اور نمائشی زنجیریں صرف تیری خفیف تبسم کی ادنیٰ حرکت سے ٹوٹ سکتی ہیں۔ محبت کے ان خوشگوار لمحات کے لئے جو تیری محبت میں گذر جاتے ہیں۔ اور میرے ولولہائے شوق میں خلش پیہم کی تخم ریزی کر جاتے ہیں۔ اگر مجھے اپنی زندگی کی بہاریں بھی قربان کر دینی پڑیں تو بھی سکندر محبت پرستی کے حقوق فراموش نہ کریگا۔ عزیز ترین کملا۔ میں تمہارا ہوں۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ محبت ہے۔ میں تمہارے احساس کا احترام کرتا ہوں۔

مجھے تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ اس قدر دل شکستہ ہونیکا کیا سبب ہے۔

سکندر تو کیا تم ان اصولی زنجیروں کو توڑ کر تم مجھ سے اس رشتۂ الفت کو استوار رکھ سکو گے۔ کملا نے سکندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا۔

یقیناً یقیناً۔ ضرور پیاری کملا ضرور۔ دونوں جانب تبادلۂ نگاہ سے ایک بجلی چمک کر دل کی گہرائیوں میں کوندگئی نگاہوں نے کوئی خفیہ راز آپس میں بانٹ لیا۔ دونوں کے دل وفورِ شوق وکشمکش جذبات و رونق سے متحرک ہوگئے۔ دونوں کے چہروں پر کوئی معنی خیز تغیر پیدا ہوگیا۔ اور سکندر کی آغوش کملا پر تنگ ہوگئی۔ محبت کی ایک الوداعی مہر ثبت ہوگئی۔ اور ہوٹل ہوا سے ٹکراتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ برقی لیمپ بجھا دئے گئے۔ اور چمن کی خوشنما فضا مغموم ہوگئی۔

(۲)

شیخ محسن احمد ریٹائرڈ سب جج کی کوٹھی میں بھی آج خوب رونق ہے۔ جمیلہ خاتون اپنی ناز آفرین سہیلیوں اور ہمعمر ہجولیوں کے جگمٹ میں گھری ہوئی خاموش بیٹھی ہے۔ ہر چیز پر مسرت برس رہی ہے۔ دن بھی مسکرا رہا ہے۔ مگر جمیلہ متفکر و پریشان۔ منگنی کی خوشی کی بجائے حزن و ملال کی تصویر۔ غم والم کی پتلی بنی بیٹھی ہے۔ مایوسیوں اور پریشانیوں کی ہیک نے اس کے چہرے کو بے کیف سا بنا رکھا ہے۔ خاموش اور سرنگوں نگاہیں قلبی صدمات کو آشکارا کر رہی ہیں۔ سہیلیوں سے نگاہیں بچاکر وہ اپنے کمرے میں آئی۔ ضبط الم سے نڈھال ہوکر دبے ہوئے جوش کو قابو میں نہ رکھتے ہوئے وہ اپنی پیاری سہیلی انجم کا دامن تھامکر کہنے لگی۔

پیاری بہن۔ خدارا میری مدد کرو۔ مجھے اصغر سے محبت ہے۔ میرا چچا زاد [illegible] اصغر [illegible] دل کا مالک ہے۔ اس کی موجودگی میں [illegible] آوارہ [illegible] عیاش [illegible] مجھے [illegible] کیا جا رہا ہے۔ جو ہزار ہا عیوب کا مالک ہے۔ جو خود پسند۔ خودسر [illegible] نکھٹو نوجوان ہے۔ پیارا اصغر بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ اور عنقریب اسے کوئی معقول ملازمت بھی ملجائے گی۔ پیاری انجم للہ! میری والدہ کو سمجھاؤ۔ کہ وہ میری شادی خانہ بربادی سکندر سے نہ کریں۔ اصغر مجھ پر فدا ہے۔ وہ محبت پرست اور میرا حقیقی قدردان ہے۔ میں نے خفیہ طور پر اس سے ہی شادی کرنے کی قسم کھائی تھی۔ آہ میں کیسے اپنا سینہ چیر کر دکھاؤں۔

جمیلہ جمیلہ۔ انجم نے حیرت وگھبراہٹ سے کہا۔ برائے خدا آہستہ بولو۔ کنواری لڑکی ہوکر [illegible] قدر دیدہ دلیری [illegible] لڑکیوں کو یہ بیباکیاں زیب نہیں دیتیں۔ نہ شرافت کا خیال نہ عزت کا پاس۔ ایسی عریاں و بے حجاب لفظوں پر پیچھے زمانہ کیا کہے گا۔ تم تعلیمیافتہ ہوکر ایسی طفلانہ باتیں نہ کرو۔ سکندر سے تمہاری منگنی ہوچکی۔ [illegible] وہ [illegible] تمہارا ہونیوالا [illegible] اگر اس نے ایسی [illegible] ۔۔۔ اصغر کی رٹ سن لی۔ تو غضب ہو جائیگا۔ خاندان [illegible] ۔

بہن انجم! کچھ تو میرے ٹوٹے ہوئے دل کا بھی خیال کرو۔ افسوس سوسائٹی کے ان خود ساختہ اصولوں [illegible]

وصنعاں میں مبتلا ہو کر مجھے زمانہ زبان سے حرف تمنا کے اظہار پر نفریں کرتا ہے۔ جس شخص سے میری تمام امیدیں اور تمنائیں وابستہ ہیں۔ اس کا نام لینے پر مجھے بدنامیوں اور رسوائیوں کا عنوان دیا جائیگا۔ جس سے مجھے صحرا کی طرح الفت ہے۔ اس کی بجائے مجھے ایسے ظالم کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ جس سے مجھے ذرہ بھر بھی الفت نہیں۔ بہن میں اپنا نیک و بد بخوبی سوچ سمجھ سکتی ہوں۔ دیکھو میرے لبریز محبت جذبات کا ناحق ظلم و ستم کی چھری سے خون بہایا جا رہا ہے۔ زندگی میں نے ہی نبھانی ہے نہ کہ میرے والدین نے۔ اچھی انجم میں منت کرتی ہوں۔ التجا کرتی ہوں۔ پاؤں پڑتی ہوں۔ خدا کے لئے کوئی ایسی تدبیر کرو کہ میری نسبت یہاں سے چھوٹ جائے۔ میں ممنون ہونگی۔ تم ایسا کرنے سے میری زندگی کو خرید لوگی۔ اور میں اس احسان کا بدلہ تا قیامت ادا نہ کر سکونگی۔

بہن جمیلہ۔ خدارا ذرا سوچو۔ تمہارے والد ایک ذی عزت اور صاحب رسوخ متمول پنشنر ہیں۔ تمہاری تعلیم و تربیت پرورش اور ناز برداریوں کے لئے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ تمہیں اپنی جان سے عزیز تر جانتے ہیں۔ اپنی اولاد سے کوئی بھی دشمنی نہیں کیا کرتا۔ اپنے خیال اور دانست میں تو انھوں نے تمہارے لئے ایک حسین اور جمیل خوشرو۔ روشن خیال متمول اور تعلیم یافتہ رئیس زادے کا انتخاب کیا ہے۔ پھر مردانہ عزت اپنے الفاظ کی قدر و قیمت کا احترام بھی خوب جانتی ہے۔ یہ گڑیوں کا کھیل نہیں۔ کہ آج منگنی کی اور کل توڑ دی۔ انھیں تمہاری ایسے محبت پرستانہ رویے اور عشق بازیوں کی کیا خبر [illegible] جمیلہ جوش محبت میں تم اس وقت اندھی ہو چکی ہو۔ مگر چشم عبرت سے اس کے نتائج فی زمانہ دیکھ لوگی۔ یہ دیوانگی اور [illegible] زمانہ کا منہ بند کرانے کو کافی نہیں۔ تم نا سمجھ ہو۔ بھلا تمہارے جذبات کا احترام کون کریگا؟ تم اپنا دل لئے [illegible] کسے دکھاتی پھروگی؟ اور تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کون ضرورت محسوس کریگا؟ یاد رکھو ایسی [illegible] میں لعنت۔ دھتکار۔ طعن و رسوائی کے سوا تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرو۔ [illegible] کوشش کرو۔ ورنہ تمہارا مستقبل خدانخواستہ خراب ہو جائے گا۔ اور تمہارے والدین ندامت سے دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

میری بگڑی ہوئی قسمت کی طرح بگڑی ہوئی ہمراز سہیلی انجم۔ خدارا۔ اس پند و نصائح کے سلسلہ کو بند کردو۔ میں [illegible] تعلیم یافتہ ہوں اور تعلیم [illegible] فائدہ اٹھانا جانتی ہوں اگر مجھے صرف خوف زمانہ کی وجہ سے خواہ مخواہ پابند سلاسل کیا جا رہا ہے۔ اور صرف دنیا کی چہ میگوئیوں سے بچنے کے لئے مجھے قہراً و جبراً جہنم کے سرخ انگاروں پر ڈال دیا جا رہا ہے۔ تو میں بھی اپنی ضد کو پورا کر کے چھوڑونگی۔ میں اپنے مقدر کی باگ ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتی۔ میں اپنی لازوال محبت کی خاطر باغی بنکر و بے شرم اور بے حجاب بنکر اپنا سینہ چاک کر کے سارے جہان [illegible] رکھدونگی۔ اور اپنا دلی مقصد والدین کے سامنے صاف صاف بیان کردونگی کیونکہ عورت کی محبت مضبوط چٹان [illegible] طرح ہوتی ہے۔ اور جب اس کے جذبات کو تشدد کے پتھروں سے پامال کیا جاتا ہے۔ تو پھر وہ خونی بھیڑیے کی طرح خطرناک

بجاتی ہے۔ میں استقلال سے جملہ مصائب کا مقابلہ کرونگی۔ مگر اصغر میرا ہوگا اور میں اس کی۔ اگر اس پر بھی رسم و رواج کی پابندیاں۔ والدین کا اصرار۔ اور زمانے کی مجبوریاں متفقہ طور پر ایذا رسانی پر کمربستہ ہوئیں۔ تو پھر اس انگوٹھی کے چمکدار ہیرے سے محبت کی قربانگاہ پر نثار ہو جاؤں گی۔ اور سنگدل دنیا کو میرے خون کے ہر اس قطرے کی قیمت دینی پڑیگی جو اس بے انصافی اور جبر و تشدد کی چھری سے بہایا جائیگا۔ غم و غصے کے مایوسی بھرے خیالات نے اس کے کرب و الم میں جوش پیدا کر دیا۔ اور وہ ناقابل برداشت جذبات کے زیر اثر میز پر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے اور اسی حالت میں وہ اصغر کو خط لکھنے لگی ۔۔۔۔۔۔۔

جان جمیلہ۔ سلام و شوق۔

تمہاری مجبور ستم رسیدہ جمیلہ چند ناقابل عبور مشکلات و ناروا مراسم کی پابندیوں میں گھر چکی ہے۔ اور جگہ جگہ تنہائی کا خوف ہر قدم پر دامنگیر ہے۔ عزیز ترین محبوب گونا گوں پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کی وجہ سے میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ اپنے مستقبل کے لئے کیا لکھوں۔ مختصر یہ ہے کہ میں عنقریب ہی مجبوراً سکندر کی زوجیت میں دھکیلی جا رہی ہوں۔ میرے خیالات میں بسنے والے اصغر دنیا ان عناصر کو نظر انداز کر رہی ہے جو دو دلوں میں باہمی ملاقاتوں سے اور یکجا رہنے سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ سر دست تو میرے لئے ایک مستقل خلش کا سامان مہیا کیا جا رہا ہے۔ گو میں اس وقت ایک بیوفا اور مجرمانہ حیثیت سے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ مگر میری مجبوریوں سے تم ناواقف نہیں ہو [illegible] دلکو جو بہار رنگین آرزوؤں کا مسکن ہے جبر و تشدد سے چھوڑ کر بسنے کی [illegible] کے مجبور کن و ظالمانہ طور ان میری کشت امید کو برباد کرنے کو تلے ہوئے ہیں۔ [illegible]

.... سی روز کی طرح ٹھیک اسی وقت ملنا۔ چند نہایت ضروری بحث طلب امور بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ میرے پیارے اصغر اس فراق نصیب و مشتاق و بیمار جمیلہ کی محبت صرف تیری ذات تک محدود رہیگی۔ مایوس نہ ہونا۔ ہر طرح سے مجبور ہوں۔ وقت تیز رفتار ہے۔ اور غم طویل۔

فقط " تیری جمیلہ "

جمیلہ فرط الم سے رو رہی تھی۔ اور کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی:۔

بہن انجم۔ میرا یہ آخری فیصلہ میرے والدین تک پہنچا دینا۔ اور نصیحتاً میری طرف سے صاف صاف کہہ دینا کہ میرا شوہر سوائے اصغر کے کوئی نہیں بن سکتا۔

حسن اتفاق سے شیخ محسن اللہ کسی ضروری کام کی وجہ سے برآمدے میں پڑی ہوئی میز کی دراز میں ٹٹول رہے تھے۔ جمیلہ کے منہ سے نکلے ہوئے فصیح الفاظ کو ان کی قوت سامعہ نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ اچانک اور خلاف عادت جمیلہ کے کمرے میں گھس گئے۔ دروازے کے ساتھ ہی لکھا ہوا خط میز پر پڑا تھا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی

جمیلہ کی اشکباری اور کمرے کا بدلا ہوا منظر اور کھلا ہوا خط دیکھ کر متحیرانہ انداز سے مضمون خط کی حقیقت کی آگاہی کیلئے خط کو اٹھا کر پڑھنے لگے۔ جمیلہ بت کی طرح خاموش ہوگئی۔ وہ ان کے دفعتاً گھسنے کی طرف سے سکتہ میں آگئی۔ اس کا حلق خشک تھا۔ اور بدن کے تمام اعضا میں رعشہ۔ خط پڑھتے پڑھتے شیخ صاحب کی حالت میں تغیر ہوتا گیا۔ جوش اور غصے سے اس کا تنفس گرم اور تیز ہوتا گیا۔ رگوں کے خون نے متحرک ہو کر سارے جسم میں ایک تھرتھراہٹ پیدا کر دی۔ آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہو کر تمتما اٹھیں۔ خط کا ہر ایک لفظ آنکھوں کو چیرتا ہوا کلیجہ تک کو برما رہا تھا۔ وفور اشتعال سے وہ کانپنے لگا۔ حقیقت طشت از بام ہو چکی تھی۔ جمیلہ۔۔۔۔ جمیلہ تنفس کے اتار چڑھاؤ میں ان کی زبان سے نکلا۔ کمینی۔۔۔۔ بے حیا۔۔۔۔۔۔ بے غیرت۔۔۔۔۔۔ تعلیم۔۔۔۔۔۔ آزادی اور بیجا نازبرداریوں کا یہ انجام۔ میں نے تجھے اسی دن کے لئے تعلیم دلوا کر جوان کیا تھا؟ افسوس میری غفلت یہ رنگ لائی۔ میری شفقتوں کا یہ جواب۔ ننگ خاندان بڑھتے ہوئے جوش سے بے قابو ہو کر وہ دانت پیستا ہوا شیر کی طرح جمیلہ پر جھپٹا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اور وہ بیہوش پڑی تھی۔

تمام شب متلاطم خیالات کی طوفانی جنبشوں میں گذارنے کے بعد بھی شیخ صاحب مجروح پرند کی طرح بے چینی سے تڑپ رہے تھے۔ اس فوری اور اچانک واقعہ نے اس کی روحانی تکلیف میں اضافہ کر دیا تھا۔ جذبہ الم سے بے اختیارانہ اس کے لبوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ لعنت ہے ایسی رسوائے عالم اولاد پر۔ تف ہے ایسی ناشدنی ذہن پر۔ مصلحت وقت نے انہیں زود تر شادی کر دینے کے سوا اور کچھ سمجھنے نہ دیا۔

(۳)

سکندر کو کملا کی پرکیف آنکھوں کی ادائے شوق اور محبت میں ڈوبی ہوئی خفیف متبسم سادہ اداؤں نے لذت مجروحی سے آگاہ کر دیا تھا۔ کملا اور سکندر کے تعلقات روز بروز مضبوط ہوتے گئے۔ ہر روز نیم عریاں کملا بلوریں شانوں پر بال پھیلائے ہوئے اپنے حسن جہاں آشوب کی فراوانیوں کے ساتھ بن سنور کر سکندر کے ساتھ چائے نوشی میں شمولیت کیا کرتی اور اب اس کی تمام قوتوں پر حاوی ہو چکی تھی۔ کوئی غالب کشش امنگوں بھرے دلوں میں بڑھ رہی تھی۔ دونوں کا دلچسپ مشغلہ ایک دوسرے کے ساتھ سیر و سیاحت، میل ملاقات اور چائے نوشی رہ گیا تھا۔ دونوں کی طبیعتوں میں عاشقانہ جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ مگر مذہب کا ناقابل حل عقدہ ابھی تک حل نہ ہوا تھا۔ سکندر مسلمان تھا۔ اور وہ پارسی لڑکی تھی۔ ان کا بیشتر حصہ کسی خفیہ سرگرمیوں میں گزرتا رہا۔ اور کسی اہم مسئلہ کی پیچیدہ گتھی باہمی تبادلہ خیالات سے پوشیدہ طور سلجھ چکی تھی جس کو دونوں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ ادھر پارسی قوم کے متمول و حسین ترین نوجوان کملا کی محبت کا دم بھرتے۔ مگر کملا نے ان سب کی محبت آمیزانہ انکسار کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر ان کے دلوں میں حسد و جوش کی آگ بھڑکا دی۔ اب وہ وقت تھا کہ کملا کی ملاقاتوں پر نگرانی اور

پابندیاں عاید کردی گئیں۔ اور سکندر کی ملاقاتیں بھی غیر محفوظ ہوگئیں۔ اب وہ خفیہ خفیہ ملتے تھے۔ مگر نامہ و پیغام کا سلسلہ جاری تھا۔ اور ایک خوشگوار رات میں جبکہ ماہتاب بے شمار ستاروں کی معیت میں جلوہ فرما تھا۔ کملا نے گھر سے فرار ہونے کی مکمل تیاریاں کردی تھیں۔ تمام جہان کو معروف خواب چھوڑکر سکندر سہراب جی کی کوٹھی کے عقب والی سڑک پر موٹر لیکر آیا۔ جیب سے ٹارچ نکالی۔ اور کوئی خفیہ اشارہ کرکے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کملا ایک بیگ لئے ہوئے موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر سنسان خاموشی کو توڑتی ہوئی شہر سے ۱۲ میل دور ایک سرسبز باغ میں داخل ہوئی۔ مجوزہ مقام پر بوڑھا رازدار ملازم گاجی مضطربانہ ٹہل رہا تھا۔ باغ کا پھاٹک بند کردیا گیا۔ سکندر اور کملا کوٹھی کے ہال میں داخل ہوئے۔ بڑی مدت کے بعد شوق اور آرزوؤں کی فراوانیوں نے دوری کو قرب سے بدل کر حسن کو عشق سے ہمکنار کردیا تھا۔

دوسری صبح شاہ خاور بیدار ہوچکا تھا۔ روشندانوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنیں دوہم آغوش طالب و مطلوب کے بکھرے ہوئے گیسوؤں اور رخساروں سے چھیڑ خانی کررہی تھیں۔ ۸ بج چکے تھے۔ کہ بوڑھا گاجی کھنستا ہوا آیا اور دروازے پر دستک دیکر پکارا۔ جناب ...... جناب۔ اُٹھئے۔ جناب۔ خاصا دن نکل چکا ہے۔ احتیاطی تدابیر لازمی ہیں۔ متوالے نیند کے دیوانے اور لذت آشنائے شباب بیدار ہوگئے تھے۔ اور دن کے دس بجے کملا اور سکندر عدالت کے دروازے پر حاضر تھے۔ مجرم الفت کملا مجسٹریٹ صاحب کے روبرو یہ بیان دے رہی تھی......

"جناب میں درستی ہوش و حواس و برضا و رغبت خود التماس کرتی ہوں۔ کہ میں مسٹر سہراب جی پارسی مرحوم کی اکلوتی بیٹی ہوں اور مطابق سرٹیفکیٹ ڈاکٹری میں ۱۹ برس کی بالغہ ہوں۔ چونکہ مجھے مسٹر سکندر سے دلی انس ہے۔ اور انھیں بھی مجھ سے عشق و محبت ہے۔ لہٰذا میں حسب منشائے خود اپنی زندگی کو ان سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں روبرو حضور والا اپنی خواہش اور مرضی سے اسلام قبول کرتی ہوں اور ان کی زوجیت میں باامن رہنے کے لئے عدالت سے ملتجی ہوں کہ میرا شرعی نکاح یہیں کروایا جائے۔ اور میرے اور ان کے تحفظ جان کے لئے سرکار عالیہ بندوبست کرے میں ممنون ہوں گی.......".

سب مراحل بآسانی طے ہونے کے بعد دونوں محبت کی پینگیں جھولتے ہوئے تمام مجوزہ مقام پر واپس آگئے۔ اور واپس آتے ہی کملا نے اپنی ماں کو یہ خط لکھا۔ ——— ڈیر ماما۔

اس قسم کی گستاخانہ حرکت کا مجھے افسوس ہے۔ اور یقیناً آپ کو اس سے صدمہ ہوا ہوگا۔ مگر پیاری ماما میں بالکل محفوظ اور

کہ آپ لوگوں کا رویہ اور طرز عمل تشدد آمیز ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں نے کئی مرتبہ اپنی محبت
عافیت ہوں۔ اس فراری کی وجوہات یہ ہیں
و مسٹر سکندر سے شادی کیلئے آپ کو کہا۔ مگر آپ نے ہمیشہ اس کا جواب دھمکیوں سے دیکر میرے ارمانوں کو مضمحل کر دیا۔ آپ
کی مزید اطلاع کے لئے اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں اب میں نے برضا و رغبت خود اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور میں جائز طریقہ
سے مسز سکندر ہوں۔ میں نے محبت کے پاکیزہ جذبات سے متاثر ہو کر خود کو ہمیشہ کیلئے اس کی آغوش میں ڈال دیا ہے۔ امید ہے
کہ آپ میں سے کوئی بھی میرے یا ان کے خلاف کسی ناز یبا یا انتقامی کارروائی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔ وگرنہ کملا کو زندہ نہ
پائیں گے۔

فقط آپ کی کملا۔

کملا کی فراری کی داستان زبان زد خلق ہو چکی تھی۔ کملا کے خط بھیجنے سے پہلے سہراب جی کی کوٹھی میں موٹروں بگھیوں
اور سائیکلوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ پارسی قوم کے رؤسا۔ صاحب اقتدار ذی اثر اکابرین جمع ہو چکے تھے۔ غم و غصے کی لہریں ہر ایک
کے سینہ میں موجزن تھیں۔ ایک منچلا نوجوان جوش سے بیتاب ہو کر پکارا۔ صاحبو! کیا پارسی قوم مردہ ہو چکی ہے؟ کیا آپ لوگوں میں
عزت حمیت اور پاس مذہب کچھ بھی نہیں رہا۔ ایک ناپاک۔ نجس اور بے ایمان مسلمان کا ہاتھ ہماری قوم کی بہو بیٹیوں کو چھو جائے۔
اور ہم زندہ رہیں۔ شرم ہے۔ شرم ہے۔ ایسی باتونی قوم کے لئے ڈوب کر مرجانا بہتر ہے۔ وقت گنوانے سے کیا فائدہ ہے۔
اس شریر النفس مسلمان کو اس کی بدکرداری کی پاداش میں فوراً قتل کیا جائے۔ ایسی تحریریں ہمارے لئے باعث ذلت ہیں ہم میں
اس کی برداشت کی تاب نہیں ہے۔

مگر بھائیو! کسی حالت میں استقلال اور تحمل کو کھونا عقلمندی نہیں ہوتی۔ ایک معمر پارسی نے جواب دیا۔ انصافانہ نگاہ
ڈالئے اور اس خط کو بغور مطالعہ سے تمام قصور اس ننگ قوم۔ رسوا اور بے حیا لڑکی کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جس نے قوم کے
بدھا حسین و متمول ترین نوجوانوں کو ٹھکرا کر ایک نجس مسلمان سے رشتہ الفت جوڑا۔ وہ ہم اگر قتل و خون سے انتقام لیا جائے
تو ممکن ہے کہ فرقہ وارانہ پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔ اور پھر ایک گمراہ ہستی کے ذلیل کارنامے کیوجہ سے قوم کی قوم کو خمیازہ بھگتنا
پڑیگا۔ لہٰذا اس کمبخت کو ذلت کے اسی گڑھے میں چھوڑ کر سردست قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ تو بہتر ہوگا.... مختلف گفت
و شنید کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔ اور کملا کا گھر ایک ماتم کدہ بن گیا۔

(۴)

جمیلہ اور سکندر کی جبریہ شادی کو ایک ماہ گذر چکا ہے۔ مگر سکندر مرزا دن میں چند دفعہ کے سوا گھر میں قدم نہیں رکھتا۔
اور وہ عموماً شاہ منزل میں ہی رہتا تھا۔ سکندر اور کملا کی پوشیدہ شادی مع تفصیلات کے طشت از بام ہو چکی تھی۔
مرزا اشرف بیگ کو بھی سکندر کی دورنگی مکر و فریب اور عیاشیوں کا علم ہو گیا۔ اور نو عروس جمیلہ بھی اس سے بے خبر نہ رہی۔
ایک تو پہلے ہی سے وہ سکندر کے نام سے بیزار تھی۔ دوسرے ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی

اضطراب و خستگی کی الجھن میں وہ پہروں آنسو بہاتی رہتی۔ اور آخرکار اس نے ایک کامیاب بندوبست کرکے اصغر کے کارندوں کو بلوالیا۔ اصغر خود کسی مجوزہ سٹیشن پر ٹھہر گیا۔ اور اس کے کارندے نئی دلہن کو میکے لیجانے کے لئے آ پہنچے۔ سکندر کے اعتنا اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اور نئی دلہن میکے روانہ ہوگئی۔۔۔۔۔ میکے والوں کے متواتر خطوط دلہن کی طلبی اور دریافت خیریت کے موصول ہونے پر دلہن کی تلاش کی گئی۔ مگر بعد مدت اخبارات سے اس قدر معلوم ہوسکا کہ اصغر و جمیلہ کسی دور دراز۔ یاست میں سکونت پذیر ہوکر عیسائی بن چکے ہیں۔ اور انھوں نے آپس میں شادی کرلی ہے۔

محبت کی رنگینیوں میں مستغرق سکندر نے جمیلہ کی فراری کو امداد غیبی اور (خس کم جہاں پاک) سمجھکر اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اسے ایک بھولا ہوا عنوان سمجھکر روز افزوں کملا کے دریائے محبت کی بے پناہ لہروں پہ بہتا ہو۔ اس ساحل کو بھول چکا تھا۔ کملا کی خمار آلود آنکھوں کا نشہ بیدار۔ اس کے ابروہائے دراز کی جنبش۔ اس کے لب لعلیں کا سحر پاش تبسم سحر تکلم کی قیامت خیزیاں سکندر کی دل نشین معنی کی گہرائیوں کا طلسم بن چکا تھا۔ بے جا اصراف۔ سیر سیاحت۔ سامان عیش کی فراوانیوں سے اس کی زندگی سراپا ایک انقلاب بن گئی تھی۔ مرزا اشرف بیگ سمجھاتے سمجھاتے عاجز ہوچکے تھے۔

اب سکندر کی چیرہ دستیاں زوروں پر تھیں۔ اس کی ۰۰ ایک خواہش کی تعمیل نہ ہونے پر وہ آگ کا شعلہ بن جاتا۔ لڑائی جھگڑے مار پیٹ سے مرعوب کرکے وہ اپنی من مانی مرادیں پوری کرانیکا عادی ہوتا گیا۔ اس کی بیجا ناز برداریاں شوریدہ سری میں مبدل ہوگئیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے اپنی تمام جائیداد۔ زمین اور دکانات فروخت کر ڈالے۔

مرزا اشرف بیگ کو ایک طرف نوعروس بہنو کی فراری۔ دوسری طرف سکندر کے ناقابل برداشت مظالم اور آئے دن کے صدمات نے بری طرح مجروح کردیا۔ انھوں نے سکندر کے اس ناقابل اعتراض چال چلن میں اصلاح کی کوئی صورت نہ دیکھکر حفظ ماتقدم کے لئے اپنی بقایا جائیداد و روپیہ اپنے خورد سال تین بچوں نعیم، کریم اور حلیم کے نام کردی۔ اور سکندر کو اپنی کل جائیداد سے محروم کرکے خود عازم حج ہوگئے۔

سکندر کے پاس سوائے اس کوٹھی کے جس میں وہ مع کملا کے رہائش کرتا تھا۔ اور کوئی چیز باقی نہ رہی۔ یہ کوٹھی بھی اصل میں اس کی سوتیلی ماں کے حصہ میں تھی مگر سکندر نے کملا کو حاصل کرنے کے بعد اس میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔ اب وہ وقت تھا جب کہ اس کے پاس ضرورت زندگی کے لئے کچھ بھی باقی نہ تھا۔

شراب پینے کے بغیر اس کی زندگی محال تھی۔ خویش و اقارب سے وہ خود ہی کنارہ کشی کئے ہوئے تھا۔ احباب بھی اس کی خود پسندی و سینہ زوریوں سے قطع تعلق کرچکے تھے۔ عیش و عشرت کا پروانہ اب روپیہ بٹورنے کیلئے سوتیلی ماں پر ناروا مظالم ڈھانے لگا۔ مگر قانونی چارہ جوئیوں نے اسے وہاں سے بھی مجبور کردیا۔ سوتیلی ماں سے تنازعات۔ یاروں سے عداوت۔ شیخ محسن احمد سے دشمنی۔ قرض میں ڈوبا ہوا۔ پیسہ کی کمی۔ اخراجات میں اضافہ۔ احباب سے قطع تعلق۔ اور خاندان بھر سے بگاڑ پیدا کرکے اب اسے چار طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا۔ ایک [illegible]

خرد پر جہالت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چائے پی رہا تھا جبکہ اسے سوتیلی ماں کی طرف سے ایک ہفتہ کے اندر اندر مکان خالی کر دینے کا نوٹس ملا۔ اخبارات میں بھی اس نوٹس کی نقل شایع کر دی گئی۔ اور ہر کس و ناکس سکندر کو ظالم اور غاصب سمجھکر نفرین کرنے لگا۔

نوٹس پڑھتے ہی وہ زخمی شیر کی طرح تڑپ اُٹھا۔ اس کی خونبار آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ اس کا دماغ بھٹی کی طرح تپ اُٹھا۔ غم و غصہ کی فراوانی سے اس کے منہ میں جھاگ آگئی۔ کرب و اضطراب کی حالت میں اس کا تمام خون کھولنے لگا۔ نوٹس ایک آگ کا شرارہ تھا۔ جس نے سکندر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ غیض و غضب کا مجسمہ بنکر ہانپنے لگا۔ واقعات نے نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ سکندر کے نازک دل میں اب اسقدر صبر کی تاب کہاں تھی۔ بڑبڑاتا ہوا وہ کملا کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

کملا! اس سے زیادہ تذلیل۔ اس سے زیادہ توہین۔ اور بے عزتی برداشت کرنا میرے لئے ظلم ہے۔ میرے آرام کو آلام سے بدلنے والے سفاک لوگ مجھے رسوائے عالم کرنے کے بعد بھی باز نہیں آئے۔ اس قدر ناقابل برداشت مظالم کے بعد بھی ان کے ستم کا سلسلہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ میرے مشاغل حیات کو اندوہ مصائب میں بدلنے والا باپ دیدہ و دانستہ میرے حق میں یہ زہریلے خار بو گیا ہے۔

مجھ سے انہیں نفرت ہے۔ میری محبوبہ سے انھیں عداوت ہے۔ میری رسوائی اور تذلیل ان کے لئے باعث مسرت ہے۔ میری تکالیف سے انھیں آرام ملتا ہے۔ میری پُر محبت مصروفیتیں انہیں ناگوار خاطر ہیں۔ یہ محبت کے اس سرسبز پودے کو مرجھا کر خاک کر دینا چاہتے ہیں جس کو کملا اور سکندر کی لازوال محبت نے خون جگر سے سینچ سینچ کر جوان کیا ہے۔ مگر کیا ان کے مظالم کی کوئی حد بھی ہوگی؟ کیا یہ بدخصلت اب یہ چاہتے ہیں کہ دست سوال سوتیلی ماں کے آگے دراز کر کے بھیک مانگکر گذر اوقات کروں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جب تک سکندر جوان ہے غیرت اور احساس رکھتا ہے ایسا ہرگز نہ ہو سکیگا۔ میں بھی ان کے متکبرانہ طرز عمل کو اگر عاجزی اور انکساری سے نہ بدل دوں تو سکندر نہیں۔ اب میں اس غم و الم کی دنیا کو زور اور زبردستی بدل دونگا۔ عرصہ دراز سے کاوشوں میں مبتلا رہنے کے بعد اب مجھ میں تاب صبر نہیں رہی۔ میری راہ میں مشکلات پیدا کرنے والے شاید میرے جوش انتقام سے ناواقف ہیں۔ مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر کے بھی یہ آرام و اطمینان چین کی نیند نہیں سو سکینگے۔

اب صبر و تحمل کی انتہا ہو چکی۔ میرا غصہ اب جنون کی وحشیانہ صورت اختیار کر رہا ہے۔ میرا جوش غضب اب انھیں خون کے آنسو رلائیگا۔ اب سکندر بدل جائیگا۔ وہ آتش ریز پہاڑ کی طرح آگ برسائیگا۔ جوش اضطراب سے اس کا تنفس تیز تر ہوتا گیا۔ اور ناقابل ضبط جھنجھلاہٹ سے دانت پیستے ہوئے بولا۔ کملا۔ کوئی گرم گرم چیز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح جوش کھا کر مجھے بیتاب کر رہی ہے۔ اگر وقت نے اسباب مہیا کر دئے۔ تو کل ہی میرا انتقام عملی جامہ پہن لیگا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ سکندر کو اس قدر مغلوب الغضب دیکھکر۔ کملا حیرت۔ تعجب اور خوف سے ملی ہوئی گھبراہٹ سے

سکندر کی طرف دیکھکر کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

کملا کی جان و دل کے مالک۔ واقعات کی رفتار سخت پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے۔ گردش آسمان کی بے ڈھب طرز روش ہمارے درپے ایذا ہے۔ ہر طرف ذلت۔ اور ندامت منہ پھاڑے ہمیں گھیر چکی ہیں۔ ذرا سی لغزش بھی اس وقت بُرے نتایج پیدا کر دیگی۔ للہ! اسقدر پریشان خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ صبر اور استقلال سے سنجیدگی سے معاملات پر غور کرو۔

کملا۔ میری غمگسار کملا! میری تاصحا بنکر مجھے بزدل نہ بناؤ۔ میں جو کچھ کہتا ہوں کر کے دکھاتا ہوں۔ سنو سنو۔ نعیم اور کریم دونوں کو کل بلا کر کوئی نشیلی مٹھائی کھلا دونگا۔ رات کو ان دونوں کا گلا گھونٹ کر ان کی لاشوں کو صندوق میں بند کر دونگا۔ پھر دونوں صندوق رات کی گاڑی میں رکھوا دیے جائیں گے۔ سفر کے اختتام پر معاملہ طشت از بام ہو جائیگا۔ مگر اس واقع کو تین چار روز گذر چکے ہونگے ہم کچھ تجارتی اشیاء لیکر کراچی چلے جائیں گے۔ پولیس سر مارے گی۔ سوتیلی ماں سر دُھنے گی۔

خوف سے لرزتی ہوئی کملا نے جواب دیا۔ سکندر۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھائیوں کا خون کرو گے؟ دو معصوم آٹھ اور دس برس کے پھول سے معصوم بچوں کا خون۔ بے گناہ خوبصورت نعیم اور کریم کا خون۔ ناحق۔ ایسی خوفناک جفا۔ سکندر۔ معصوم بچوں سے انتقام لینا عین بزدلی اور انتہائی رذالت ہے۔ دو چہچہاتے ہوئے بلبلوں کو خاموش کر دوگے۔ سکندر۔ دنیا جاگ پڑے گی۔ زمانہ سنیگا۔ لوگ سنیں گے۔ اُف اُف کتنی بھیانک اور ڈراونی فضا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کتنی ہیبتناک سفاکی انتہائی ظلم کی پہلی مثال ہوگی۔ سکندر۔ خدا کے لئے سوچو۔ سکندر تم کیا کہہ رہے ہو۔ بیگناہ بچوں کا خون۔

اب اس دل میں رحم باقی نہیں رہا۔ تم ان پر کھار رہے ہو جو تم پر ظلم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اب اس سینے میں ایک پتھر ہے۔ اب میں انتقام لونگا۔ ایسا سخت انتقام جو اپنی مثال آپ ہوگا۔

دو روز اور بھی گذر گئے۔ مگر جنون کی دنیا کا باشندہ سکندر ماہی بے آب کی طرح کسی مجرمانہ عمل کو تصور میں دیکھکر اس کی خامیوں کی اصلاح اور اپنے بچاؤ کی صورت کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ اور جذبۂ بے اختیاری سے وہ خود بخود بڑبڑا رہا تھا۔

(۷)

رات نصف کے قریب گذر چکی تھی۔ آسمان نے ارضی بستیوں کی خونخوارانہ سیاہ کاریوں کی پردہ پوشیوں کے لئے جہان کو سیاہی کے پردوں میں سمیٹ لیا تھا۔ دو کمسن معصوم بھولے بھالے بچے نعیم اور کریم کسی نشیلی مٹھائی کے زیر اثر نرم کوچ پر بیہوش پڑے تھے۔ بیدرد سکندر نشے میں جھومتا ہوا خونی بھیڑیے کی طرح اپنے شکار کو دیکھکر

ہنس رہا تھا۔ کملا یہ ہیں۔ یہ ہیں میرے شکار۔ عالمِ دیوانگی میں اس کے فولادی ہاتھ معصوم گلوں کو دبا رہے تھے۔ موت کا سفاک سپاہی دو نوخیز ٹہنیوں کو توڑ کر پاؤں کے نیچے روند رہا تھا۔ دو نوشگفتہ پھول شجرِ حیات سے توڑ کر مسل دئے جا رہے تھے۔ پیسہ۔ حرص۔ لالچ اور ہوس کی ریشمی ڈوری انجام کار دو معصوموں کے گلوں کا پھندا بن رہی تھی۔ بادل دو مظلوموں کی بے گناہی پر المناک نوحہ الاپ کر گڑگڑا رہا تھا۔ بجلی اس ستم انگیز حادثہ پر کڑک کر دنیاوی ہوس پرستوں پر ہنس رہی تھی۔ دو معصوم ہلکی ہلکی چیخیں فضا میں گونج کر تاریکی میں غائب ہوگئیں۔ دو بیگناہ اور گرفتارِ مصیبت بچوں کی شمعِ حیات موت کے زہر آلود پھونکوں سے بجھ دی گئی۔ دستِ ستم کی سنگدلانہ بربریت ڈھیلی پڑ گئی۔ دونوں کی رسیلی آنکھوں کی گھنی پلکوں میں خون کے آنسو منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ بے گناہی کا سفید تبسم ان کے چہروں پر رقص کر رہا تھا۔ ان خاموش آنکھوں میں منجمد آنسو آئینہ بنکر سکندر کی آنکھوں کے مقابل چمکنے لگے۔ سکندر کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ قتل کی سنگدلانہ واردات کے بعد ان آنسوؤں کی چمک میں اسے نہ معلوم کیا نظر آیا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس کے اعضا بے حس ہو گئے۔ اس نے باری باری مقتول نعیم اور کریم کو دیکھا۔ اس کے افسردہ پژمردہ چہرے پر نامراد تاثرات قلبی کے آثار نمودار ہوتے گئے۔ معصوم منجمد آنسوؤں کی چمک حزن و بیقراری بنکر اس کی رگ رگ میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ گھبرا کر ایک ایک کے لاشے سے چمٹ چمٹ کر رونے لگا۔ مگر [illegible] موت کی گنہگار آنکھوں سے انہیں ملا نہ سکتی تھیں۔ وہ بہت نزدیک ہو سکتی تھی۔ بہت دور پہنچ چکے تھے۔ ان کے مٹے ہوئے زرد تر پیار اور شفقت ابھی باقی تھی۔ ان کی خاموشی کے راز کو توڑنا اب سکندر کی طاقت سے باہر تھا۔ [illegible] اور خوفناک [illegible] لاشوں پر ماتم کر رہی تھی۔ کملا اور سکندر دونوں غائب ہو چکے تھے۔

تیسرے روز تلاش بسیار کے بعد دو بیگناہوں کی لاشیں برآمد ہوگئیں۔ تحقیقاتی و قانونی کاروائی کے بعد شہیدانِ ستم نعیم و کریم کا شاندار جنازہ آہ و بکا کے فلک شگاف و جگر گداز نالہ و شیون کی صداؤں میں سپردِ خاک کیا گیا۔ سکندر کی گمشدگی ثبوتِ جرم کے لئے کافی دلیل تھی۔ اس سنگدلانہ ستمگری پر ہر طرف سے قاتل کو نفرین کیا جا رہا تھا۔ ملزم کی تلاش جاری تھی۔

چاند دائمی مریض کی طرح اپنی اندوہناک اور بے نور سی روشنی ڈال رہا تھا ساکن آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ قاتل سکندر اور کملا کراچی شہر کے ساحلِ سمندر کے نزدیکی علاقہ میں ایک شکستہ مکان میں روپوش تھے۔ سکندر کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ معصوم بھوری بھوری پلکوں کے منجمد چمکتے ہوئے آنسو۔ وہ ہلکی ہلکی نازک چیخوں کی صدائیں اس کے منفعل ضمیر پر اثر انداز ہو چکی تھیں۔ اور قوتِ سامعہ کسی طور انہیں فراموش نہ کر سکتی تھی۔ نفسِ امارہ کے کذب آمیز فریب و حرص کے سلسلے زنجیرِ ملامت بنکر اس کے گلے سے لپٹ رہے تھے۔ لغزشِ عمل کی سیاہ کاریاں اس کی دامنِ زیست پر نمودار تھیں۔ ظالمانہ خونریزی کے چھینٹے اس کے پردہ

دماغ سے نہ ہٹتے تھے۔ برے اعمال کی فتنہ سامانیاں بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار تھیں۔ اور ارتکاب جرم کے بعد جوش شباب کی تمام سرمستیاں اور بے باکیاں متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ احساس ذلت اور ندامت عمل اسے خودکشی پر آمادہ کر رہے تھے۔ ناکامی، بربادی اور شکست کے شرمگین خطرات سے اس کی پیشانی سفید ہو رہی تھی۔ شکست خوردہ اور مجروح سپاہی کی طرح وہ اب زندگی سے بیزار تھا۔ معصوم آنکھوں کے منجمد آنسوؤں کی یاد نے اس کے قلب کا اطمینان اور مسرت اور چین چھین لیا تھا۔ وہ اشکبار آنکھوں سے کملا کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

کملا مجھ جیسی ذلیل۔ گنہگار۔ اور منفعل ہستی اور اس کی ناپاک روح کے لئے زمین و آسمان میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ آہ میں نے اپنی معصیت آلود زندگی میں کوئی بھی اچھا کام نہ کیا۔ ارتکاب عمل کی سزا بھگتنا میرے لئے ناگزیر ہو چکا ہے۔ روحی۔ اب لیلائے زندگی کی ردا چاک ہونے کو ہے۔

پیاری کملا۔ بیشک تیری صادق محبت کے سرور آگیں راگ پر کیف اور نشاط انگیز تھے۔ مگر اب ساز زندگی ہی چور چور ہونے کو ہے۔ معصوم آنسو منجمد پلکوں میں چھپے ہوئے میرے جگر کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرا پُرگناہ ضمیر بزدل بن چکی ہے۔ پیشتر اس کے کہ پابجولاں زنداں کی تنگ کوٹھڑیوں میں مقید ہو کر دار و رسن یا ذلیل موت کا شکار بنوں۔ چاہتا ہوں کہ خود کو سمندر کی بے پایاں لہروں کی وسعت میں گم کر دوں۔ میری وفا شعار محبوبہ رخصت دو۔ اپنے بے لوث محبت کے پجاری کو رخصت دو۔ اپنے پریم کے گنہگار قاتل کو رخصت دیدو۔ انجام خطرناک ہو چکا ہے۔ کوئی دم میں گرفتار ہوا چاہتا ہوں۔

کملا خونبار آنسوؤں سے سکندر کا دامن پکڑ کر بولی۔ میرا سرفروش پرستار۔ جاں نثاری پہ آمادہ ہو کر اسیر الفت کملا کو ماں باپ۔ خویش و اقارب سے جدا کر کے اب اسے یکہ و تنہا مصیبتوں، افسردگیوں اور فراق کی ماتم داریوں کے لئے اکیلا کس کے سہارے پر چھوڑ رہے ہو۔ آہ۔ مجھے تنہائی اور کس مپرسی کی اندوہ افزا آفتوں میں مبتلا چھوڑ کر انجام الفت کی ناکامیوں کے حوالے کر رہے ہو۔ سکندر میں بھی اسی طرح گنہگار ہوں۔ میری مسرت اور میرا چین تمہیں ہو۔ چلو چلو جاں نثار کملا اپنے عشق کو تشنۂ تکمیل رکھنا نہیں چاہتی۔ سکندر چلو۔ جلدی چلو۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہی ہے۔

ہوا تند و تیز تھی۔ خشمناک لہریں ساحل کے متوازی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کے پاش پاش ہو رہی تھیں۔ سفید سفید جھاگ تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ سکندر اور کملا ایک چھوٹی سی بے چپوؤں والی کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی لہروں کے زیر و بم میں لہراتی ہوئی سرعت سے غضبناک اور کف آلود لہروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساحل سے فاصلے پر ہوا کے ایک تند جھونکے نے کشتی کو الٹ دیا۔ سمندر کی غضب آلود لہروں نے اژدہوں کی طرح سکندر اور کملا کو اپنی وسیع آغوش میں لے لیا۔ دوسرے دن کنارے کی لمبی لمبی دوب میں دو ہم آغوش لاشیں ایک خشک جھاڑی میں پھنسی ہوئی تھیں۔

جھوٹا سب سنار!

(از جناب قدسی سرحدی)

تاجور صاحب! آپ جانتے ہیں۔ انشاپردازی یا افسانہ نویسی سے مجھ کو دور کا بھی علاقہ نہیں۔ لیکن یہ محض آپ ہی کی حوصلہ افزائی اور حسن سماعت ہے۔ کہ آپ میری بانکی ہوئی گپیں سنتے رہتے ہیں۔ یہ کہانی وہی ہے جس کا آپ کو پہلے ہی علم ہے۔ کہیئے۔ اچھی رہی؟

(قدسی سرحدی)

موا فتنی۔ دیکھو تو سہی بشتنہ اکتنا سا کٹا الو کا پٹھا ہے۔ گلی گلی بھیک مانگتے۔ ہاتھ پھیلاتے شرم بھی تو نہیں آتی۔ اور یہی نہیں اپنے آپ کو افلاطون کے دادا، اور سقراط کے ماموں بنائے پھرتے ہیں۔ یہ ٹکر گدا۔ کہیں محنت، مزدوری کریں، لہو، پانی ایک ہو۔ پھر دیکھوں ان کی یہ دانشمندیاں اور ناصحانہ ہدایتیں۔ آئے ہیں بڑے حکیم جی۔ دنیا کو سمجھانے۔" سلطانہ نے چلمن سے لگ کر گلی میں جاتے ہوئے "جھگوی الفی والے" بابا کو ایک ہی دم میں کوس ڈالا۔ اگرچہ سلطانہ کی آواز کیا۔ بلکہ آواز کا سایہ تک بھی "بابا" کی سماعت سے محفوظ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ معاً پلٹا۔ اپنی مدبھری شہابی آنکھوں کو "افغان منزل" کی کھڑکی پر روکا۔ اور اپنی سحر آفرین لے میں ایکبار پھر "جھوٹا سب سنار" الاپتا ہوا چلا گیا۔

تم خود جھوٹے ہو۔ فریبی ہو، دھوکہ باز ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ اور سخت نفرت ہے۔ تم مجھے چڑاتے ہو، بناتے ہو۔ سلطانہ کے ریشمی رخسار غصہ اور نفرت سے دمک رہے تھے۔ اس کی پنڈلیاں لرز رہی تھیں۔ اور بنفشئی نیم وا آنکھوں میں موتیوں کا ایک سیلاب امڈ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑائی اور صوفہ پر گر پڑی۔

"میری مملکتِ دل کے تاجدار"

"میری وادیٔ محبت کے حسین شاہسوار"

"تم۔ تم بھی جھوٹے ہو کیا؟"

"یہ فقیر سچ کہہ رہا ہے کیا؟"

"جھوٹا سب سنار"؟

تم نے آم کے پیڑ تلے جب کوئل ملہار الاپ رہی تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ میں حسین ہوں اور میری آنکھیں ہرن کی آنکھوں سے خوبصورت ہیں۔ اور میرے رخسار کسی انار کے پھول سے زیادہ شوخ اور میرے لب گلاب کی پنکھڑیوں سے کہیں زیادہ خوشنما۔ اور میرے بال سنبل سے اچھے اور میرا قد سرو سے ارفع ہے۔ اور میری آواز میں ناہید کے نغمے .... اور ..... اور تم مجھ سے محبت کرتے، پیار کرتے ہو۔ پیار۔ جو صرف انسان ہی کو ودیعت ہے۔

پیار جو فرشتوں کو نصیب نہیں۔ پیار جو خدا اپنے بندوں میں دیکھتا ہے اور ان سے پیار کرتا ہے۔ پیار جو کیا نہیں جاتا۔ پیار جو ہو جاتا ہے۔ پیار جو ہو کر مٹتا نہیں۔ پیار جو تم مجھ سے کرتے ہو۔ پیار جو تم کو مجھ سے ہو گیا ہے۔ پیار جو تم کو مجھ سے ہے۔ پیار جو تم کو مجھ سے رہیگا۔ اور مٹیگا نہیں۔

سلطانہ کی ہچکی بندھ گئی۔ سرخ اور سوجی ہوئی آنکھوں سے جھڑی لگ رہی تھی۔

"اور تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔ سلطان! اچھی سلطان! تم مجھ سے پیار کرسکتی ہو؟ اور میں نے تمہاری خوبصورت لانبی انگلیوں کو بھینچکر بتایا تھا۔ لطیف! اچھے لطیف!! "میں تم سے پیار کرتی ہوں"۔ اس لئے ہاں اسلئے کہ مجھے تم سے پیار ہو گیا تھا۔ پیار جو ہے۔ پیار جو رہیگا۔

سلطانہ نے اپنے انگوری آنچل سے رخسار پونچھے۔

"تو کیا میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا؟"

"تو کیا میرا پیار تم سے جھوٹا ہے؟"

"پھر یہ فقیر کیوں کہتا ہے؟ "جھوٹا سب سنسار"۔

آتشدان کی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر سنہری شعلے پیدا کر رہی تھیں۔ نصف شب کا گجر بج چکا تھا۔ سلطانہ کی آنکھ لگ گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے مت جلاؤ۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا"

میں بے گناہ ہوں۔ میرے ہاتھ اس کے خون سے معرا ہیں"

میں اس آگ میں جلکر مرنا پسند نہیں کرتی۔

"مجھے بچاؤ۔ اللہ کوئی بچاؤ"

سلطانہ اچک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ سامنے والے مکان کی کھڑکیوں سے روشنی آرہی تھی۔

لطیف! پیارے لطیف!! تم اس وقت تک مصروف مطالعہ ہو۔ میں کیونکر تمہیں کہوں۔ اتنی دیر گئی تک نہ پڑھا کرو۔ تمہاری صحت پر برا اثر پڑیگا" سلطانہ کی محبت بھری نگاہیں۔ دیار حبیب کا جائزہ لیتی ہوئیں گلی تک چلی گئیں۔ ایں! اتنی شب ہو چکی۔ یہ موٹر کس کی کھڑی ہے؟

ہاں ہاں وہ جو اتا کہہ رہی تھی کہ آج شب لطیف کی نانی اماں دہلی جائینگی موٹر انہیں کے لئے آئی ہوگی تین بجے کی گاڑی سے جانا ہوگا۔ سلطانہ نے کلائی پر کی طلائی گھڑی کو دیکھا۔

اہا! اڑھائی بج چکے۔ اب وہ جانے ہی والی ہونگی۔

اور میرے لطیف - میرے ۔ اپنے لطیف ضرور ہی ان کو چھوڑنے کے لئے سٹیشن تک جائینگے "۔

اس نے اپنا آنچل سنبھالا - اور میٹھی مدھم سروں میں "پریم ہی سکھ کا راز" گنگناتی ہوئی کمرے سے نکل دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر گئی۔

میں دروازہ تھوڑا سا کھول لیتی ہوں - ابھی میرے لطیف جی باہر نکلیں گے - آخر دن بھر ان کو دیکھ نہ سکی۔ آنکھیں پک گئیں۔ اب تو دیکھ ہی کے رہونگی "۔

"پریم ہی سکھ کا راز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ راز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ راز ۔۔۔۔۔۔۔۔ پریم ہی سکھ کا راز"

سامنے کواڑ کے پٹ آہستہ سے کھلے - اور لطیف جان شب خوابی لباس میں سر سے ننگے باہر نکلے کوچہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر ڈیوڑھی کے اندر چلے گئے۔ سلطانہ کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا - مسرت کی برقی رو اس کے رگ و ریشہ میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

گلی کی لالٹین کی مدھم روشنی میں لطیف پھر باہر نکلے - اور ان کے بازو میں بازو ڈالے - بجائے ان کی نانی اماں کے ایک ساڑھی پوش تھی - سلطانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

پیاری - تم یقین جانو - میں آج ہی نہیں بلکہ دس برس سے تمہارا ملازم ہو چکا ہوں - بھلا یہ کوئی جھوٹ ہے میرا پیار - ہمیشہ تمہارے اور تمہارے ہی لئے ہے - دنیا کی حسین ترین عورت بھی میرے دل سے تمہارا پیار چھین نہیں سکتی "۔

"مگر وہ جو تمہاری منگیتر ہے - سلطانہ؟"

"اوں - ہٹاؤ اس کو - میں تمہیں بتا نہیں چکا ہوں کہ آج سے پورے ایک سال بعد جب تم لیڈی ڈاکٹر شگفتہ اور میں لطیف جان پلیڈر ہونگا - اس وقت تم ہمیشہ اور ہمیشہ کے لئے میری اور میں تمہارا ہی رہونگا "۔

دیکھو لطیف تمہیں سردی نہ لگ جائے کہیں - تم اب رخصت دو مجھے - کل تک جیتی رہی تو پھر۔

"اچھا پیاری خدا حافظ"

"خدا حافظ"

کواڑ کے پٹ بند ہو گئے - موٹر چلی گئی۔

لیکن افغان منزل کا دروازہ کھلا اور سلطانہ نے ایک حسرت بھری نگاہ سے لطیف کے در و دیوار پھر اپنے گھر کو دیکھا۔

"خدا حافظ" اور لڑکھڑاتی ہوئی چل پڑی۔

دور سے "بھگوی النی والے باوا" کی سریلی آواز آئی - "جھوٹے سب سنسار بابا جھوٹا سب سنسار"

فیلالوجی آف پشتو

(از مولانا مفتی عبدالحق صاحب علوی ایم اے پشاور)

ناظرین اس بڑے لفظ (فیلالوجی) کے دیکھنے یا پڑھنے سے جو بہت کم گوش آشنا ہے۔ شاید متعجب ہوں گے اور مضمون نگار کو کوئی بہت بڑا فیلالوجسٹ (Philologist) (ماہر علم اللسان) تصور کرینگے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ کمترین نہ اس علم کا ماہر ہے اور نہ ہی اتنا پشتو دان کہ اس لذیذ زبان پر نکتہ آرائی یا موشگافی کر سکے۔ لیکن تاہم بفحوائے مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ یا (Something is better than nothing) کسی چیز کی ریسرچ (تحقیقات) میں لگے رہنے سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ اسی غرض سے راقم نے چند سال سے دل میں ایک مبسوط سی سکیم اسی ریسرچ کے متعلق بنائی ہوئی تھی۔ جو مکمل صورت میں ایک اچھی خاصی Thesis کا کام دے سکتی ہے ــــ ایم اے کی السنہ کے امتحانات میں اب Thesis لازمی یا اختیاری طور پر داخل کر دی گئی ہے۔ اس میں ہر ایک امیدوار کو کسی خاص ادبی یا تاریخی عنوان پر اپنی ذاتی تحقیقات کے نتائج پیش کرنا پڑتے ہیں۔ راقم نے عنوان مذکورہ اسی غرض سے تیار کیا تھا۔ لیکن خوش قسمتی یہ کہ Thesis اختیاری ہوتے ہوئے تمام امیدواروں میں سے صرف ایک صاحب نے جرأت کی اور باقی یاروں نے Essay (مضمون) پر ہی اکتفا کی۔ چنانچہ یہ قیمتی مواد معلومات دبے کا دبا پڑا رہا۔ کچھ مدت سے کیفی صاحب نے اصرار کیا۔ کہ چند مسلسل مضامین کے سلسلے میں اس مضمون کو شائع کرنا چاہیئے تاکہ ناظرین کی علم اندوزی کا باعث ہو سکے۔ امید ہے۔ کہ بفضلہٖ اگر ان کا اصرار اور میری کوشش متواتر رہی تو چند نمبروں میں مضمون ہو چکے گا۔

Philology (فیلالوجی) انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "علم اللسان" ہیں۔ یہ وہ علم ہے جس میں دنیا کی تمام زبانوں کی بحث ہوتی ہے۔ اور چند موٹے موٹے اصولوں کی مدد سے ہر زبان کے الفاظ کو پرکھا جاتا ہے۔ اس تحقیق کو یہاں تک دخل ہے۔ کہ اس فن کے ماہرین لکھتے ہیں۔ کہ آغاز میں تمام دنیا کے لوگ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ آبحیات مصنفہ آزاد مرحوم اور سخندان فارس ایضاً اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ زبان کے صراف نے کیسے کیسے موتی جڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ اور حقیقت میں مرحوم نے وہ کام کیا جو کسی اور مشرقی مصنف سے آجتک نہ ہوا تھا۔ یورپین لوگوں کی علمی پیدری جستجو اور شغف ادبی مسلم ہے۔ آج سے سالوں پہلے ایشیا کی ہر زبان کی تحقیق یہ لوگ اپنی زبانوں میں کر چکے تھے۔ اور اب بھی کر رہے ہیں (R. A. S.) رائل ایشیاٹک سوسائٹی جس کا دفتر کلکتہ میں ہے۔ کئی سالوں سے اپنا ایک مستقل رسالہ شائع کرتی چلی آ رہی ہے۔ اس میں ہندی سنسکرت۔ اردو۔ چینی۔ جاپانی۔ ترکی اور فارسی۔ عربی وغیرہ ہر زبان کی ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ ایشیائی علماء کے

مضامین بھی زیبِ رسالہ ضرور رہے۔ لیکن اولین قدم اس میدان میں اجنبیوں نے ہی لیا۔ اور ہمارے اپنے محققین السنہ کی فہرست تو نہایت ہی مختصر ہے۔ یعنی شبلی نعمانی۔ آزاد مرحوم۔ سید سلیمان ندوی۔ سید علی بلگرامی وغیرہ۔ البتہ دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے حال ہی میں ادبی ریسرچ کا معتدبہ ذخیرہ بہم پہونچایا ہے۔ جس کا سہرا مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کے سر ہے۔ جو اس شعبہ کے سیکرٹری ہیں۔ یا پنجاب یونیورسٹی کے بعض نوخیز ایم اے اور ڈاکٹرز اب میدان میں نکلے ہیں جو چند [illegible] تحقیقات کر چکے ہیں۔ اور دن بدن اس طرف زیادہ رجوع کرتے جارہے ہیں۔ ممکن ہے کسی روز انہیں میں [illegible] پیدا ہو جائیں۔

[illegible] ہمارے ہاں ان اجنبیوں جیسے محقق ہی نہیں۔ بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ جتنا شغف ریسرچ [illegible] ہے اتنا ہمارے ادیبوں کو نہیں۔ ہمارے تھوڑے بہت لکھے پڑھے اصحاب کو تو خدا رکھے الف لیلہ [illegible] حمزہ۔ ہیر وارث شاہ۔ کافیاں بلھے شاہ وغیرہ سے کہاں فرصت ہونے لگی۔ باقی جو کچھ بالاتر درجے کے اصحاب ہیں ان پر سیر و سیاحت۔ سنیما۔ تھیٹر یا زیادہ سے زیادہ شعر گوئی کا بھوت سوار رہتا ہے۔

رہے علماء۔ سو بقول حالی ؎

وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں — وہ اخبارِ دیں کے مبصر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں مناظر کدھر ہیں — محدث کہاں ہیں مفسر کدھر ہیں
وہ مجلس جو کل سربسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں

کہاں ہیں وہ دینی کتابوں کے واقف — کہاں ہیں وہ علمِ الٰہی کے مظہر
چلی ایسی اس بزم میں بادِ صرصر — بجھیں مشعلیں نورِ حق کی سراسر
نہ کوئی مجلس میں ساماں نہ باقی
[illegible] باقی نہ طنبور مطرب نہ ساقی

بہت لوگ بن کر ہوا خواہِ امت — سفیہوں سے منوا کے اپنی فضیلت
سدا گاؤں در گاؤں نوبت بہ نوبت — پڑے پھرتے ہیں کرتے تحصیلِ دولت
یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارثِ انبیا اب

سدا اہلِ تحقیق سے دل میں بل ہے — حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں پہ بالکل مدارِ عمل ہے — ہر اک رائے قرآں کا نعم البدل ہے

کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

ہنر ہم میں جو ہیں وہ معلوم ہیں سب
علوم اور کمالات معدوم ہیں سب
چلن اور اطوار مذموم ہیں سب!
فراغت سے دولت سے محروم ہیں سب

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر
تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر

خیر! یہ رونا تو قیامت تک ختم نہ ہوگا۔ فقدان علم وادب ظاہر ہے۔ (ہمارے ایسے کم سواد آدمی "ادبی ذوق" کیا سمجھیں) بعض دوست "علم وادب" کو "اخلاق وآداب" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ حال تو ہے ہم مشرقین کا۔ مگر دوسری طرف یورپین اصحاب مغربی ہوتے ہوئے بھی جب مستشرقین (Orientalists) بنتے ہیں تو ہم سے کہیں بڑھ جاتے ہیں۔ یہ مانا کہ اکثر یورپین مصنفین کے تراجم اور حالات میں غلطیاں اور خامیاں بھی ہوتی ہیں لیکن انصاف یہ ہے۔ کہ ان کا غیر ملکی اور ہزاروں میل دور ہونا۔ ان کے تلفظ کا نمایاں فرق و بُعد۔ ماہر اساتذہ کا نہ ملنا۔ اور مصنفات ضخیم۔ ناول اور ڈراما جیسے دلچسپ مضامین کو چھوڑ کر خشک علمی تحقیقات کے درپے رہنا (اور کچھ نہ کچھ لے ہی مرنا) ان کی حمایت میں کافی سے زیادہ حجت ہے۔ غضب ہے کر کیا۔ گلستان بوستان سے لیکر شاہنامۂ فردوسی تک فارسی میں اور عربی میں صرف و نحو کے رسائل سے لے کر بخاری شریف۔ ترمذی غرضیکہ صحاح ستہ تک کے تراجم مختلف یورپین زبانوں میں موجود ہیں۔ اور ایک ایک نہیں بلکہ بیسیوں مصنفین کے خود اسی پشتو کو لے لیجئے۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض پشاور کے باشندوں کو بھی پشتو اچھی طرح نہیں آتی اور سیکھنے سے تو غیر صُوبوں کے باشندوں کو اور یورپین لوگوں کو بھی اچھی خاصی آجاتی ہے یہ سب بات ادبی شغف کی ہے۔ (ضمناً) میں خود غیر صُوبے کا باشندہ ہوں اور عرصہ سات سال سے پشاور میں مقیم ہوں۔ ایک عام ادبی دلچسپی نے میری توجہ اس زبان کی طرف آتے ہی منعطف کر دی تھی۔ اور میں چند دنوں میں ہی ضروری فقرات بولنے اور سمجھنے لگ گیا تھا۔ حالانکہ کئی دوست ایسے بھی موجود ہیں۔ جو بیس بیس سال سے یہاں مقیم ہیں اور انہیں ایک لفظ تک نہیں آتا۔ مگر بخدا جب میں نے یہ دیکھا کہ (سر جارج روس کیپل Sir George Roos-Keppel سابق چیف کمشنر صوبہ ہذا اس زبان کی مبسوط گرامر انگریزی میں لکھ گئے ہیں۔ تو میرا دل خون خون ہوگیا۔ اس لحاظ سے کہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو اتنی دیر تک کیوں جرأت نہ ہوئی۔ اور اس لحاظ سے خوش بھی ہُوا۔ کہ ہمارے جیسے تشنگان ادب کے لئے ایک اور سرچشمہ حیات کھل گیا۔ یہاں قاضی میر احمد شاہ صاحب رضوانی سابق پروفیسر گورنمنٹ ٹریننگ کالج لاہور کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ جنہوں نے کئی سال سے پنجاب یونیورسٹی کے پشتو کے امتحانات کے لئے ایک چھوٹی سی

گرا مر تصنیف کر رکھی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ نہایت مختصر ہے تاہم اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور کسی آئندہ Research یا مصنّف کے لئے اس میدان کو خالی چھوڑ دینا چاہیئے ؛

قرآن شریف کے تراجم کا ذکر تو یک طرف رہا۔ (یہ تو بیسیوں نہیں سینکڑوں ہوں گے) تفسیریں تک مکمل کی مکمل موجود ہیں اور پھر عربی اور فارسی کے اعلےٰ امتحانات میں یہی یورپین نسخے اہلِ اسلام اور مشرقی ادیبوں کے لئے نصاب مقرر کئے جاتے ہیں اور علامہ یا (Ph. D.) ڈاکٹر کی ڈگری کے لئے بھی یورپ کی مستند سند کا ہونا ضروری ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ یہ لوگ ہمارے جواہر ریزوں سے خوشہ چین ہوتے تھے۔ ایک ہم ہیں کہ آج مذہبی زبانوں کے امتحانات کیلئے بھی اُن کے دستنگر ہیں

لئے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے ۔۔۔ کیا کسب اخلاق رُوحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے ۔۔۔ کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے ۔۔۔ یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے
انہیں کے ہیں سب یہ چربے اتارے ۔۔۔ اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے ۔۔۔ ہُوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے
یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم ۔۔۔ کہ ہو جیسے مجرُوح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم ۔۔۔ بجھاتا تھا آگ اُن کی باران نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لدکر
چلے آتے تھے مصر و یونان کے دفتر

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن ۔۔۔ پہ تھا ان کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جنکے اب تک مزین ۔۔۔ کتب خانۂ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

مؤرخ جو ہیں آج تحقیق والے ۔۔۔ تفحص کے ہیں جن کے آئین نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے ۔۔۔ زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے
عرب ہی نے دل اُنکے کر ابھارے

غرضیکہ اس کام کو اگر کچھ ہاتھ میں لیا۔ تو آزاد نے اور اس وقت کے مطابق کافی تحقیقات کر ڈالی۔ تاہم سخندان فارس میں لکھتے ہیں کہ اس مضمون میں ابھی کافی گنجائش ہے۔ اور کسی بعد کے آنے والے کے لئے تحقیق کا وسیع تر موقعہ ہے لیکن آزاد اور یورپین مصنفین کی تحقیق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یوروپین مصنفین ہر ایسی کتاب کے ابتدا میں مفصل مقدمہ اور تبصرہ دیتے ہوئے چند موٹے موٹے اصولی قوانین درج کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایک طول طویل فہرست مختلف اسماء و افعال کی پیش کرتے ہیں۔ ہر کلے کی مختلف زبانوں میں تغیر و تبدل اور تصریف و تحریف کو پرکھتے ہیں۔ اور اپنے مندرجہ قوانین کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ آخر کتاب تک اُن کا یہی طرز جاری رہتا ہے۔ مگر آزاد کا طریق ان سے زیادہ محققانہ اور مدققانہ ہے یہ محض خشک قوانین لکھکر فہرست ہی پیش نہیں کرتا۔ بلکہ ہر زبان کو اس کے بولنے والوں اور اُن کے مختلف ممالک اور محل وقوع کے لحاظ سے لیتا ہے۔ آپس میں موازنہ اور مناظرہ کرتا ہے۔ فطرتی لب و لہجہ۔ آواز اور لحن کو بھی ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آب و ہوا۔ پیداوار۔ حیوانات۔ چرند و پرند۔ تاریخی مقامات۔ آثار قدیمہ۔ تلفظ اور بود و باش کے لحاظ سے ہر ملک اور ہر صوبے کی تحقیق کرتا ہے (صفحات آئندہ میں راقم بھی یہی طریق اختیار کرے گا)

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ زبانیں دو قسم کی ہیں Semetic (سیمیاطیقی) اور Aryan (ایرانی)، پہلی کی تحت میں عربی۔ فرانسیسی۔ عبرانی۔ شامی وغیرہ ہیں۔ اور دوسری میں فارسی۔ جرمنی۔ ہندی۔ اردو۔ پشتو غرضیکہ تمام وسط ایشیا کی السنہ آجاتی ہیں۔ پھر ان سب کی جداگانہ Dialects (شاخیں) ہیں جو ایک ہی ملک کے اندر مختلف انداز اور لب و لہجہ کے باعث کئی قسموں میں بٹ جاتی ہیں۔ مثلاً ملتانی۔ بلوچی۔ سندھی کراچی۔ اور اسی طرح ایرانی بھی۔ بنظر غور دیکھا جائے تو ہر ملک بلکہ ہر صوبے اور ضلعے میں مختلف حدود پر نمایاں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض اوقات صرف تلفظ میں فرق ہوتا ہے۔ مگر اکثر جگہ سرے سے لفظ ہی جدا ہوتا ہے۔ جسے سمجھنے والے اس علاقے میں کم ہی اشخاص ہوتے ہیں۔ اس مثال سے آب و ہوا کا جو اثر آواز اور لب و لہجہ پر پڑتا ہے۔ بخوبی ظاہر ہے۔

مشہور ہے کہ کسی ہندوستانی کو سرحد میں آنے کا اتفاق ہوا۔ مگر پشتو چونکہ اس کے لئے غیر زبان تھی اسلیئے قطعاً نامانوس معلوم ہوئی۔ بلکہ اس کے سخت اور درشت لہجہ کو نہایت مکروہ خیال کیا۔ واپسی پر اس کے ہموطنوں نے سرحد کی زبان کے متعلق جو پوچھا۔ تو آپ کو لفظ تو یاد نہیں رہے تھے۔ کیا کیا کہ ایک ٹین لیکر اس میں چند پتھر ڈال دیئے اور خوب ہی کھڑکھایا اور بولے "بس یہی پشتو ہے"۔ گویا پشتو زبان کی درشتی اور اجنبیت کو پتھروں کی درشت آواز سے مشابہ کیا۔ لیکن

؎ لِکُلِّ قَومٍ لُغَۃٌ تَخُصُّھُم لَا یَعلَمُھَا اِلَّا اللّٰہُ

اسے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ زبان دراصل فارسی کی حقیقی بہن ہے۔ فارسی درہ خیبر کے اس پار رہی اور قندھار سے کر عراق عرب کی حد تک اس کا خاص وطن ٹھہرا۔ لیکن چھوٹی بہن پشتو پہاڑی سرحدی علاقے کے باشندوں کی زبان مقرر ہوئی۔ جو کہ افغانستان میں بھی سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی درشتی کو علاقے کے نشیب و فراز سے

کافی مشابہت اور موافقت ہے۔ لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور کچھ عرصہ رہ کر اس کی ادبیات پر نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوگا۔ کہ اس کی (ذخیرۂ الفاظ) تمام کی تمام فارسی ہے۔ جس طرح آزاد نے ثابت کیا کہ سنسکرت اور قدیم فارسی بہنیں ہیں۔ اسی طرح کچھ شک نہیں۔ کہ ان کی تیسری بہن پشتو ہے۔ بنیاد ایک ہے۔ صرف اختلاف محل و قوع نے یہ کاریگری کی۔ یہاں تک کہ افغانستان کے مغربی علاقے کی بول چال ایران کی سی ہو گئی۔ مگر مشرقی علاقے کی قریباً پشتو ہی رہی (اگرچہ طول و عرض میں فارسی کا رواج مدت سے چلا آتا ہے)

تمام انگریزی تواریخ اکبر بادشاہ کو ان پڑھ تسلیم کرتی ہیں۔ مگر کچھ عرصہ پہلے کسی رسالے میں نظر سے گذرا۔ کہ اکبر ان پڑھ نہیں تھا۔ مذکورہ مضمون میں مضمون نگار نے کافی تاریخی حوالہ جات سے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اکبر جاہل اور بے علم نہیں تھا۔ مگر سبحان اللہ (پڑھا ہوا ہو یا ان پڑھ ہو) اس کی ادب پروری کی مثال اور اس کی فلسفہ دانی کا نمونہ اس تاریخی واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ کہ دربار میں

ایک دفعہ یہ سوال پیش ہوا۔ کہ انسان کی اصلی زبان کیا ہے یعنی مختلف زبانوں کے اثر سے بچے مختلف والدین کی صحبت میں زبان آشنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی کچھ نہ کچھ فطرتی زبان ضرور ہوگی وہ کیا ہے۔ بحث و تمحیص سے جب فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو تجربہ کیا گیا۔ شہر سے دور آبادی سے یکسو ایک خاص محل تعمیر کرایا گیا۔ جس کے ارد گرد کسی آدمی یا جاندار مویشی وغیرہ کو پھرنے چلنے کی اجازت نہ تھی۔ محل میں چند نوزائیدہ بچے گونگی اور بہری اناؤں کے زیر نگرانی رکھے گئے۔ ایک سال (؟) تک بچے ایسے ہی پلتے رہے۔ بعد انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ سب بچے " غوں غاں " کرتے ہیں اور کسی قسم کا لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔ البتہ ایک بچہ ایسی آواز کرتا تھا۔ جیسے گدھے والا گدھے ہانکنے میں منہ سے نکالتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا۔ کہ اتفاقاً کوئی گدھے والا ایک روز لاعلمی میں پاس سے ہو نکلا تھا۔ دیکھ لیجئے۔ وہی آواز بچے نے سن کر یاد کر لی۔ اور اسی کو رٹنا شروع کر دیا۔ باقیوں نے چونکہ نہیں سنی اس لئے ان کے دماغ اور زبان بالکل [redacted] اور بے نقش رہے۔ انصاف سے کہیئے۔ کس قدر فلسفیانہ تجربہ ہے۔ اگر اکبر " ان پڑھ ہوتا " تو ایسی بات اسے کب سوجھتی ؟ (یہ واقعہ ہمیں تمہید کا کام دے گا)

قیاس ہے۔ کہ آدم کے وقت سے دنیا کے لوگ کسی ایک جگہ آباد تھے۔ جو غالباً مغربی ایشیا کا مقام تھا۔ جوں جوں نسل بڑھتی گئی اپنی حوائج دنیوی اور ضروریات زندگی کے مطابق دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہر طرف کو پھیلنے لگے۔ چونکہ زمانہ ابھی اتنا ترقی پذیر نہ ہوا تھا۔ اس لئے ان کی گذران قدرت کی بے قیمت پیداوار پر ہی ہو جایا کرتی تھی۔ بہت پہلے کے زمانے میں لوگ جنگلوں میں ہی رہتے تھے۔ بعد میں جھونپڑیاں بنا لیں اور جھونپڑیوں میں رکھنے کی خاطر کچھ نہ کچھ اشیائے خانگی بھی ضرور ہوں گی۔ ان اشیا کے نام ضرور کچھ نہ کچھ رکھے گئے ہوں گے۔ مگر چونکہ ضروریات میں ایک دوسرے کے بہت کم محتاج ہوتے تھے۔ اس لئے آپس میں بہت نہیں ملتے تھے۔ اسی عرصہ میں ورثۂ آبائی

کے طور پر الفاظ کا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ جو ابھی تک تمام بنی نوع انسان میں ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ جو نسلیں قریب قریب رہیں۔ ان کے لب و لہجہ اور تلفظ میں بہت تھوڑا فرق واقع ہوا۔ لیکن جو لوگ بہت دُور جا بسے ظاہر ہے کہ اُن کے تلفظ اور لب و لہجہ میں نمایاں فرق ہونا چاہیئے تھا۔ سو ہوگیا۔ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ اختلاف آب و ہوا۔ نئی نئی چیزوں کا دیکھنا۔ نئی چیزوں کے نئے نام رکھنا۔ مختلف افراد کے ذاتی خیالات اور رجحان کا اختلاف۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ ایک ہی نسل کے بلکہ ایک ہی باپ کے بیٹے یکساں طبائع نہیں رکھتے۔ سگے بھائیوں میں طبعی اختلاف ہوتا ہے۔ لہٰذا جُدا جُدا ضرورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ اور جُدا جُدا نام تجویز ہوتے رہے :

الفاظ کی جستجو سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صدیوں بعد تک یہ لوگ اپنے آبائی مرکز کی طرف رجوع کرتے رہے۔ اور اپنے بھائیوں سے ملتے جلتے رہے۔ باہمی رشتے ناطے بھی ہوئے۔ اور اسی طرح نسلیں بڑھتی رہیں۔ چند سالوں تک اُنکے الفاظ اکثر وہی رہے۔ لیکن مرورِ زمان نے اپنی پالش سے آہستہ آہستہ ان میں رنگ بدلنا شروع کیا۔ مگر وہ پالش اتنی سخت نہیں۔ کہ اصلی چیز کو چھپا سکے۔ اور حقیقت میں دنیا میں کسی چیز کی اصلیت کبھی چھُپ نہیں سکتی۔ مشہور مثل ہے کُلُّ شَیءٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ "مادر" کا لفظ لے لیجیئے انگریز اسے مَدَرْ (mother) کہیگا۔ پٹھان اُسے مور بناوے گا۔ ہندوستانی "اماں" پنجابی "ماں" یا "ماؤ" ایرانی مادر۔ عرب اُمّ۔ سنسکرت دان اسے "ماتر" لکھیگا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ ان مختلف حالات میں لفظ کی دو صورتیں ہوگئیں۔ ایک وہ صورت جس میں دؔ اور تؔ آپس میں بدل جاتی ہیں، اور دوسری وہ صورت جس میں ا شروع میں آتا ہے۔ مگر آخر میں معمولی تصرف ہے۔

یہی حالت "باپ" کی ہے۔ ہندوستانی "باپ" کہے گا۔ انگریز Papa پٹھان "پچہ"۔ "بابا"۔ ایرانی "باب"۔ عرب "اب یا ابّا"۔ پنجابی پیو وغیرہ۔ فارسی کی مثال "پدر" لے لیجئے۔ انگریزی میں Father سنسکرت میں "پتر" اور پشتو میں پلار ہے۔ گرامر دان اصحاب بخوبی سمجھتے ہیں۔ کہ پؔ اور فؔ قریب المخرج حروف ہیں۔ اس لئے دنیا کی اکثر زبانوں میں یہ دونوں آپس میں بدل جاتے ہیں۔ مگر پشتو کی صورت میں دؔ کو لؔ سے بدلنا پڑا۔ یہ تغیر تمام تمام دوسری زبانوں سے انوکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اہلِ زبان کے جبڑوں۔ زبان اور دیگر اعضاء متعلقہ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ دو قریب المخرج الفاظ کو ایک ساتھ نہیں بول سکتے۔ (اس کی مثالیں انشاء اللہ بعد میں دی جائیں گی) فی الحال صَد اور سل (hundred) کی مثال کافی ہے۔

مُناسب ہے۔ کہ اس مبسوط مضمون کو چھیڑنے سے پہلے ابواب کی ایک فہرست ترتیب معین کر دی جائے۔ جس کے مطابق باب وار مباحث طے ہوتے جائیں۔ تاکہ مضمون حد سے زیادہ غیر دلچسپ اور خوشنما نہ بن جائے :

(ترتیب ابواب)

شکل و شباہت۔ خورد و نوش۔ لباس و پوشاک۔ سیر و سیاحت۔ نام و عرف۔ قومی روایات۔ مذہبی جذبات۔ دنوں اور مہینوں کے نام۔ اختلاف طبائع۔ قومی رجحان۔ مہمان نوازی۔ جذبۂ انتقام۔ جنگ و صلح۔ زبان اور محاورات اور ان کا دوسری زبانوں سے موازنہ وغیرہ وغیرہ۔

باقی آئندہ

اس جگہ یہ ذکر کر دینا شاید بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ صفحات میں صرف تمہید آئی ہے۔ نفس مضمون بفضلہ آئندہ اشاعت سے جاری ہوگا۔ نیز اس حد تک جو مدد میں نے قاضی میر احمد شاہ صاحب رضوانی کی کراماً اور اپنے محترم دوست سید محمد شاہ صاحب آنر زبان پشتو سے لی ہے اور شاید آئندہ بھی لینی پڑے۔ اس کے لئے غائبانہ ہر دو اصحاب کا ممنون ہوں۔ جناب کیفی صاحب کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے بندہ کے ناچیز اور خشک مضمون کو اپنے مجلہ عالیہ میں جگہ دی اور آئندہ بھی دینے کا وعدہ فرمایا۔

غزل

(جناب سراج الدین ظفر بی۔ اے)

نہ کوئی چارہ ساز اپنا نہ کوئی غمگسار اپنا — سناتے ہیں در و دیوار کو ہم حالِ زار اپنا
تمہارا وعدۂ فردا بجا پر اس کو کیا کہئیے — چراغِ صبحگاہی ہیں نہیں ہے اعتبار اپنا
کسی کے سامنے رازِ محبت کا خدا حافظ — ڈھلک آئے نہ پھر آنسو کوئی بے اختیار اپنا
برس کر کہہ رہی ہیں یہ کسی ناشاد کی آنکھیں — بھڑکا نہ آج سے کرتے کہیں ابرِ بہار اپنا
پس چشمِ مروت یہ ستم رانی ارے توبہ — تمہاری نرگسی آنکھوں نے کھویا اعتبار اپنا
سناؤ اے جوانی کی بہاریں لوٹنے والو — کہیں دیکھا نہ ہو کھویا ہوا عہدِ بہار اپنا
کسی کے ہجر میں مرگِ جوانی دور ہی کیا ہے — دھڑک جاتا ہے دل ہر سانس پر بے اختیار اپنا
فنا ہو کر بھی دل میں آرزوئے کوئے جاناں ہے — ابھی تک آندھیوں میں اڑتا پھرتا ہے غبار اپنا

ظفر کوئی تو ہو آخر انیس شامِ تنہائی
کہیں سے ڈھونڈھ کر لا دو دلِ بے اعتبار اپنا

نالۂ حسرت

(افسانہ) از مسٹر جارج ہریش ۔ تارکؔ سرحدی)

رات کے بارہ بج چکے تھے ۔ چاروں طرف سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ میں اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا دنیا کی بے ثباتی اور اس کے باشندوں میں صفاتِ حمیدہ کے کم ہوجانے پر غور کر رہا تھا ۔ میرا خیال تھا۔ کہ اب دُنیا میں وہ پاکیزگی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی ۔ اور نہ ہی وہ اخلاص اور جذبِ دل باقی رہا ہے محبت صرف نام ہی کو باقی رہ گئی ہے ۔ لیکن حقیقت کچھ نہیں ۔ آخر جب ان خیالات نے میرے دماغ میں ایک ہیجان اور تلاطم برپا کردیا ۔ تو میں اٹھا اور اس ندی کی طرف جو ایک گھنے جنگل میں سے گذرتی تھی ۔ چل دیا ۔ رستہ بالکل ویران اور سُنسان تھا ۔ اور منظر نہایت وحشتناک ۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ۔ دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہی تھیں لیکن میں اپنے وفورِ جنون کے باعث آگے ہی بڑھتا گیا ۔

میں ندی کے قریب پہنچا ہی چاہتا تھا ۔ کہ یکلخت ایک نہایت دلکش اور سُریلے نغمے کی مسحور کن لے میرے کانوں تک پہنچی ۔ اس آواز کے سنتے ہی میرے لبوں پر مہرِ خاموشی ثبت ہوگئی ۔ اور مارے خوف کے میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھا کیونکہ میرا خیال تھا ۔ کہ یہ کوئی چھلاوا ہے جو مجھے حیرت و استعجاب میں ڈال کر نقصان پہنچانے کا خواہاں ہے ۔ آخر مجھے یہ بات یاد آئی ۔ کہ اکثر میں اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کیا کرتا ہوں کہ جن اور بھوت کی ہستی کسی اصلیت اور حقیقت پر مبنی نہیں ۔ بلکہ یہ محض انسانی دماغ کے فتور اور نادرست قوتِ متصوّرہ کا نتیجہ ہے ۔ اس خیال سے میری ڈھارس بندھ گئی ۔ اور میں آواز کی طرف آگے بڑھا ۔ چند قدم آگے جانے پر میں نے دیکھا ۔ کہ ایک عمر رسیدہ مغنّی ہاتھ میں ستار لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھا نہایت خوش اسلوبی سے ستار بجا رہا ہے ۔ میں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک دلکش اور پُرسوز ترنم میں اقبالؔ کی غزل

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

کو گانا شروع کیا ۔ جب غزل ختم ہوئی ۔ تو میں اُٹھا اور اس کے پاس گیا ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی حیران ہوگیا ۔ اور میری طرف بنظرِ غائر اور مضطربانہ انداز سے دیکھنے لگا ۔

میں نے اس سے پوچھا۔ کیا میں یہ جان سکتا ہوں۔ کہ آپ کون ہیں۔ اور آدھی رات کے وقت جب کہ تمام دنیا خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی ہے۔ آپ اس ویران جنگل میں کیوں گا رہے ہیں؟

اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ رات شاید بہت گذر گئی ہوگی۔ اب گھر چلنا چاہیئے۔ نوکر کھانے کے لئے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اُف! ہم دنیوی کاروبار میں اس قدر محو رہتے ہیں۔ کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ کہ کب سورج نکلا اور کب غروب ہوا۔

میں نے کہا بے شک آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن آپ مجھے یہ بتائیے۔ کہ آپ ہیں کون؟ اور اس وقت کیوں آئے ہیں۔ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور نہایت مایوس کن لہجے میں اپنی داستان یوں بیان کرنے لگا۔

ابھی میری عمر صرف بیس یا بائیس برس کی ہوگی۔ کہ مجھے کسی ماہ جبین سے محبت ہوگئی۔ ہماری محبت کا راز کسی پر بھی آشکارا نہ ہوا۔ ہمارے خیالات پاکیزہ اور محبت بے لوث تھی۔

انہی ایام میں میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں۔ ہم نے اُن کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن سب بے سود۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ بلکہ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ آخر جب وہ قریب المرگ ہو گئیں۔ تو مجھ سے کہنے لگیں اے میرے فرزند! غالباً یہ امر تمہارے فہم سے بعید نہیں۔ کہ انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ مصیبتوں میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ سایہ کی طرح ڈھل جاتا ہے۔ اور کبھی یکساں نہیں رہتا۔ اس کی زندگی گھاس کی مانند ہے جو بہت جلد سوکھ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اپنی چند روزہ زندگی میں اپنے دل کی کسی مراد کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔ میری خوشی محض اس میں تھی۔ کہ میں تمہارا بسا ہوا گھر دیکھ لیتی۔ اور نہیں تو اپنی بہو کا منہ ہی دیکھ لیتی۔ لیکن نہیں۔ میں یہ حسرت اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ میری روح ہمیشہ اس خوشی کو ترستی رہے گی۔

ان الفاظ نے مجھے گویا دیوانہ سا بنا دیا۔ میں اشک بہاتا ہوا اُٹھا۔ اور دوسرے کمرے میں بیٹھ کر اس مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر سوچنے لگا۔ آخر مجھے خیال آیا۔ کہ میں اپنی محبوبہ کے پاس جاؤں اور اس سے کہوں کہ اے مجسمۂ حیا و ناز اگر تجھ کو مجھ سے حقیقی محبت ہے۔ تو اس کے اظہار کا تمہیں اس سے بہتر تمام عمر میں کوئی موقع نہیں ملے گا۔ میری دلی آرزو یہ ہے۔ کہ تم فقط اپنی صورت میری عزیز ماں کو دکھا دو تاکہ اس کی شامِ غم صبحِ انبساط و مسرت میں تبدیل ہو جائے۔

غرض میں اُٹھا۔ اور اپنی محبوبہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ جب اس کے گھر پہنچا۔ تو پتہ لگا۔ کہ وہ اسی صبح ایک موٹر میں بیٹھ کر اپنی ایک عزیز سہیلی کی شادی میں شمولیت کی غرض سے چلی گئی ہے۔ اور دوسرے دن صبح واپس آئے گی۔ میں نے اس رات وہاں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ رات کو جب تمام دنیا خوابِ راحت کے مزے لے رہی تھی۔ ایک شخص نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا جب گھر کی مالکہ نے دروازہ کھولا۔ تو ایک آدمی کو کھڑے پایا۔ جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اور جس کے چہرے

پر افسردگی اور مایوسی نمایاں تھی۔ اس نے حسرت بھری آہ کھینچی اور کہا کہ آپ کی دختر فرخندہ اختر اپنی سہیلی کے گھر جاتے ہوئے موٹر کے حادثے سے فوت ہوگئی۔ اس خبر کے سنتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ میرے بھی غم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں روتا ہوا اٹھا اور اسی اندھیری رات میں اپنے گھر واپس لوٹا۔

جب صبح گھر پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ آہ و نالہ کی آوازیں بلند ہیں۔ میرے پہنچنے سے چند ہی منٹ پہلے میری والدہ راہی ملکِ عدم ہو چکی تھیں۔ میرے دوستوں نے جو میری والدہ کی وفات کے وقت وہاں موجود تھے۔ مجھے بتایا کہ تمہاری ماں کے آخری الفاظ یہ تھے۔ بیٹا! بیٹا! تم کہاں ہو؟ اور مجھے چھوڑ کر کہاں چل دیئے؟ ....

بے ..... ٹا ....) اور بس ؂

یہ ہے میرا دل سوز افسانہ۔ اب میں پچھتر سال کا ہوگیا ہوں۔ زمانے نے بہت پلٹے کھائے۔ لیکن میرا آہ و فغاں ابھی تک اسی طرح برقرار ہے۔ دنیا مجھے دیوانہ تصور کرتی اور کہتی ہے کہ موسیقی کے جنون نے اسے جہاں کے تمام تعلقات سے بری کر دیا ہے۔ لیکن یہ بھید آج تک کسی پر نہیں کھلا۔ کہ اس ساز کا ہر تار دردِ نہاں کا مظہر ہے۔ اور ہر تا رکی ! ترانۂ حسرت کی ترجمان ہے ؂

رباعیات

(جناب ظفر بی۔اے۔ لاہور)

(۱)
دل ہے نہ کوئی رات سہانی میری
دکھڑا ہے جدائی کا کہانی میری
پوچھے نہ کوئی جذبۂ بیتابیٔ شوق
سایوں سے لپٹتی ہے جوانی میری

(۲)
ایسا نہ ہو زخموں میں فشار آجائے
آنکھوں میں ابل کر دلِ زار آجائے
تم ہاتھ مرے سینے پہ رکھدو آکر
شاید اسی صورت سے قرار آجائے

(۳)
دل چاک ہوا ہے آہ کرتے کرتے
برباد ہوا ہے نباہ کرتے کرتے
اے دردِ فراق اب تو جینے دے مجھے
یہ حال کیا تباہ کرتے کرتے

غزل

(از جناب محمد سعید خان فارغ سرحدی)

ہوا ذوقِ خلش کچھ بھی مجھے حاصل نہ ہوا		وائے قسمت کہ میں سرتا بقدم دل نہ ہوا

آشنا درد سے افسوس وہ قاتل نہ ہوا		وائے تقدیر کہ دل اس کا میرا دل نہ ہوا

فیصلہ گردن و خنجر کا رہا الجھن میں		کیونکہ آمادہ میرے قتل پہ قاتل نہ ہوا

جل بجھا تابشِ رُخ سے وہ نظارۂ حسن		آئینہ خاک ہوا مدِ مقابل نہ ہوا

شبِ وعدہ رہا ارمان یہ میرے دل میں		ہاتھ میرا تیری گردن میں حمائل نہ ہوا

شانہ رہ رہ کے الجھتا ہے تیری زلفوں سے		ہائے کیوں میرا یہ ارمان بھرا دل نہ ہوا

رشکِ لیلےٰ کی محبت نے کیا ایسا نحیف		اثر آہوں کا بھی یہ کشِ محمل نہ ہوا

ایک مدت سے ہوں ادبارِ زمانہ کا شکار		سجدۂ شکر سے لیکن کبھی غافل نہ ہوا

کس طرح اپنے کیئے پر وہ پشیمان ہوتا		خوگرِ ظلم کبھی جرم کا قائل نہ ہوا

شرکتِ غیر سے محفل کو سجایا تو نے		شوئے بخت سے میں اُس کے بھی قابل نہ ہوا

چہچہانے نہ دیا خوفِ خزاں نے اُن کو		روئے گل باعثِ تسکینِ عنادل نہ ہوا

دشمنِ جاں ہی ہی زہرِ ہلاہل لیکن		وہ بھی تلخابۂ فرقت کے مماثل نہ ہوا

رہ گیا گیسوئے جاناں میں الجھکر، فارغ
ہائے افسوس مرے بس میں میرا دل نہ ہوا

نغمۂ مستانہ

(از محترم جناب سید پیر چمن شاہ قلندر سرحدی)

ترے گیسو کو عاشق حلقۂ زنجیر کہتے ہیں　　ترے ابرو و مژگاں کو کمان و تیر کہتے ہیں
ترے رخسار کو سب ماہ کی تنویر کہتے ہیں　　خط و عارض کو تیرے آیۂ تطہیر کہتے ہیں
تیرے چہرے کو ہم قرآں کی تفسیر کہتے ہیں

کمالِ عاشقی ہے اپنی ہستی کو مٹا دینا　　تڑپنا لوٹنا مر مر کے تیری یاد میں رہنا
زمانے سے نرالا ہے وہ تیرا چاہنے والا　　ارے لیلےٰ سمجھتی ہے جسے مجنون دیوانہ
اُسے تو عاشقوں میں صاحب توقیر کہتے ہیں

قیامت ہے قیامت ہے کسی پر مبتلا ہونا　　ستم سہنا مگر لب کا شکایت کو نہ وا ہونا
بقا ہو یا وفا ہو کچھ بھی ہو اُس پر فدا ہونا　　محبت کے یہ معنے ہیں محبت میں فنا ہونا
محبت میں جو مٹ جائے اُسے اکسیر کہتے ہیں

مقام عشق سے بہتر کہاں کوئی مقام ایسا　　کہاں ہے بڑھ کے الفت سے جہاں میں کوئی کام ایسا
کہاں شبیر کی طرح کوئی صابر امام ایسا　　خدا کی راہ میں جاں دے کے پایا جس نے نام ایسا
کہ اب تک آفریں اس کو جوان و پیر کہتے ہیں

قلندر ہوں نہیں مائل جہاں کی عیش و عشرت پر　　مصیبت ہو کہ راحت صابر و شاکر ہوں قسمت پہ
شہنشاہوں سے بڑھ کر شاد ہوں میں اپنی غربت پر　　جو مر جاؤں تو لکھ دینا یہ میری لوحِ تربت پہ
یہ چمن شہ ہے اسے سبطِ شۂ شبیر کہتے ہیں

خانصاحب غلام سرور خاں

خانصاحب غلام سرور خان بی۔اے بی۔ای۔ایس۔ پرسنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب بہادر محکمہ تعلیم صوبہ سرحد۔ کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندے اور قوم گنڈہ پور کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ ٹبہ سنت پور تحصیل میلسی ضلع ملتان میں نومبر ۱۸۸۱ء میں عالم وجود میں آئے۔ خدا کی شان کہ جب پانچ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ قابل والدہ نے بڑی توجہ سے پرورش فرمائی۔ خانصاحب موصوف بچپن ہی سے بڑے زود فہم اور ہونہار تھے۔ لہذا پہلے پہل کلاچی مکتب کی تعلیم پائی۔ پھر پرائمری کا امتحان بتعریف پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۸۹۸ء میں مڈل کا امتحان اسی سکول سے پاس کر کے لیاقتی وظیفہ حاصل کیا۔ اور پھر مشن ہائی سکول ڈیرہ اسمٰعیل خان میں داخل ہوئے۔ مثل مشہور ہے کہ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" لہذا خان موصوف نے یہاں انٹرنس کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اور ۱۹۰۱ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں آپ نے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اور نارمن کرسچن کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ بی۔اے کا امتحان پاس کر کے میونسپل بورڈ سکول ڈیرہ اسمٰعیل خان میں سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ تقریباً ۸ سال تک آپ اپنے بھائیوں اور بچوں کو تعلیم دیتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالجیئیٹ سکول میں اسی عہدہ پر منتقل کئے گئے۔ آپ کے چھ سالہ حسنِ خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ عالیہ نے آپ کو "خانصاحب" کا خطاب دیا۔ اور پشاور کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ دو برس تک مردان کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ اور مئی ۱۹۲۶ء میں آپ کو موجودہ عہدہ پرسنل اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب بہادر محکمہ تعلیم صوبہ سرحد پر مامور کیا گیا۔

خانصاحب موصوف نہایت خلیق اور علم دوست انسان ہیں۔ آپ کو زبان اردو کے ساتھ بے حد دلچسپی ہے۔ خصوصاً

"مجلہ سفیرِ سخن"

کے ساتھ آپ کو جو دلبستگی ہے وہ آپ کی ادب پروری اور علم نوازی کا بیّن ثبوت ہے۔

دعا ہے۔ کہ خداوند ذوالجلال والاکرام ہم اور ادب کے اس سچے بہی خواہ کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ آمین ثم آمین۔

ادارہ



خانصاحب غلام سرور خان پرنسپل اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب بہادر
محکمہ تعلیم شمال مغربی - صوبہ سرحد

جب تم نہ تھے

(جناب سید عنایت علی شاہ صاحب ضیا جعفری سرحدی)

جب تم نہ تھے تو زمزمے سارے خموش تھے — رُوحوں میں انتشار تھا بے ہوش ہوش تھے
جب تم نہ تھے تو موجوں کی بیتابیاں نہ تھیں — خورشید و کہکشاں کی جہاں تابیاں نہ تھیں

بیگانۂ نمود تھی فطرت نگاہ میں
قندیل بے چراغ تھا بزم جلوہ گاہ میں

جب تم نہ تھے تو بادہ میں سرجوشیاں نہ تھیں — محفل میں مستیاں نہ تھیں مدہوشیاں نہ تھیں
بے رنگ وادی شفقستاں تھا شام کو — اور بادۂ نشاط ترستا تھا جام کو

بے کیف ساز تار رباب حیات تھی
خاموشیوں میں محو بسری کائنات تھی

شرم عدم سے غرق بلائے نمود تھا — بیگانۂ حیات تھا ننگ وجود تھا
ذوق الست و جام بلا ناچشیدہ تھا — مانا کہ تھا فسانہ مگر ناشنیدہ تھا
آنسو تھا چشم دل سے ابھی ناچکیدہ تھا — آئینہ تھا پہ جوہر از خود رمیدہ تھا

قطرہ تھا آشنائے تلاطم نہ تھا ہنوز
ساز انا المحیط میں گم نہ تھا ہنوز

غزل

(جناب مفتی راشد صاحب سرحدی)

آئے، بیٹھے، ناز سے اُٹھے وہ مستانہ چلے
کر دیا بیخود مجھے کیا چال جانانہ چلے!

چشمِ ساقی سی ہوئے ہم زلفِ مشکیں کے اسیر
چھوڑ کر میخانے کی رہ سوئے بتخانہ چلے!

شوخی، بیباکی، شرارت، بیرُخی، بیگانگی
چالیں جتنی بھی چلے مجھ سے وہ رندانہ چلے!

قصّہ مجنوں بھی اچھا ہے مگر کیا ہے بُرا
بزم میں تیری اگر میرا بھی افسانہ چلے!

آہی جائیں گے نہ دی گر غیر نے اُن کو زباں
آج تو دیکھے وہ ہم کو قولِ مردانہ چلے!

مست کر دے میکشوں کو چشمِ میگوں سے ذرا
ساقیا! جا مدّتوں تک تیرا میخانہ چلے!

عشق میں لیلیٰ ادا کے آئے کچھ لطفِ رقیب
جب اِدھر سے ہیں اُدھر سے قیس دیوانہ چلے!

للہ اب کچھ تو بتاؤ سہد لو اس کا علاج
بن کے اپنا اور پھر جو چال بیگانہ چلے!

ٹکڑے ہو جائے کلیجہ تھام لیں وہ بھی جگر
بزم میں اُن کی جو راشد میرا افسانہ چلے

ایک سرحدی خاتون کا خط اپنی سہیلی کے نام

(محترمہ بیگم صاحبہ بنت عبدالمجید خان مرحوم سرحدی)

میری پیاری جان سے زیادہ عزیز ثریا! شاد رہو

ثریا! میری پیاری ثریا! اپنی مضطرب و پریشان حال بہن کا دلی پیار و محبت قبول کرو ــــ......

میری عزیز ثریا! تمہارا پیارا خط ملا۔ خط کیا بلکہ مصیبتوں کی داستان۔ ناکامیوں کا دکھڑا ــ!!! آہ! آج سے کچھ عرصہ قبل تمہاری پیاری تحریر میرے سکون قلب کا باعث تھی۔ لیکن آج اس کے برعکس میرے نظام سکون کو برقرار رکھنے کے بجائے اس میں تفرقہ ڈال دیا۔ آہ! مجھے پریشان سے پریشان تر کر دیا۔

تم نے اپنی داستان غم لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ خدارا مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ اور کیونکر اپنی زندگی بسر کروں۔ ثریا! تم میں محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اور حقیقتاً تم محبت پرست بیوی کہلانے کی مستحق ہو۔ لیکن افسوس کہ ریاض اس کا مستحق نہیں۔ وہ خود پرست و خود پسند محبت جیسے پاک جذبے کی قدر و حقیقت کیا جانے۔ پیاری ثریا! عرصہ ہوتا ہے کہ میں نے رسالہ عصمت سے ایک چھوٹا سا مضمون جو کہ محبت پر لکھا گیا تھا۔ اتار کر نوٹ کر لیا۔ کیونکہ اس کے دو تین فقرے مجھے بہت پسند آئے۔ یعنی جو مرد مردانگی کا ثبوت عورت کی دل آزاری سے دے وہ مرد' مرد کہلانے کا مستحق نہیں۔ محبت ایک پاک جذبہ ہے۔ لیکن ہر کس و ناکس اس کو استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ قدرت کا اٹل فن ہے۔ جس کو مل گیا۔ مل گیا۔

پیاری ثریا! ذرا آخری فقرہ کو غور کی نگاہ سے پڑھنا۔ کہ یہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ تم محبت پرست تھیں۔ تو یہ ضروری نہیں تھا کہ ریاض بھی اس کا اہل ہوتا۔ اس نے تمہاری محبت کو بیدردی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اس کا غم ہرگز مت کرو۔ پیاری ثریا! میری جان ثریا! ذرا سوچو اور غور کرو کہ دنیا میں انسان محض مشکلات کے واسطے پیدا ہوا ہے

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ؎ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اگر تم زمانہ بھر میں اس کو تلاش کرو کہ کوئی ایسا انسان ہے جو دنیا میں کامیاب و کامران ہو۔ تو یہ غیر ممکن ہے اور محبت میں تو شاذ ہی کوئی کامیاب ہو سکے۔ ثریا! مشکلات کو مشکلات سمجھ کر اس کا رونا مت رو۔ بلکہ مشکلات پر غالب آجاؤ۔ ہمت و استقلال کے ساتھ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔ چند دن ہوئے کہ میں نے آستانہ کے خاص نمبر میں ایک مضمون بعنوان "خودکشی کے اسباب" پڑھا۔ اس میں قابل مصنف نے بتایا ہے۔ کہ موجودہ زمانہ میں خودکشی کا مرض بہت عام ہو گیا ہے۔ بہت سی مثالیں دی گئی تھیں۔ کہ بعض لوگ مالی مشکلات سے تنگ آکر خودکشی

کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بعض نوجوان لڑکے امتحان میں متعدد بار ناکامیاب رہنے سے خودکشی کر لیتے ہیں بعض محبت میں ناکام رہنے کی وجہ خودکشی کر ڈالتے ہیں۔ آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں عورت زیادہ ثابت قدم ہے۔ قابل مصنف ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ خدا نے عورتوں کو بہ نسبت مردوں کے زیادہ صبر و برداشت کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ مثلاً بچہ کی پیدائش اس استدلال کا بیّن ثبوت ہے۔ اس واسطے وہ جسمانی و ذہنی تکالیف کو موت کے آہنی پنجہ میں گرفتار ہونے کے بغیر نہایت ہمت سے برداشت کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتوں کے مذہبی عقائد مردوں کی نسبت زیادہ پختہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دکھ درد کو روحانی تسکین سے برداشت کر لیتی ہیں۔ سب سے بڑھکر ان کے دل میں مادری محبت خودکشی کی تحریک پر غالب آجاتی ہے۔

پیاری ثریا! تم خوش قسمت ہو۔ کہ ایک بچہ کی ماں ہو۔ ثریا! عورت کی ہستی، عورت کی زندگی عورت کی خوشیوں اور اس کی تمناؤں کا مرکز اس کے بچے ہیں۔ ثریا! تمہاری خالدہ ابھی ایک چھوٹا سا پودا ہے۔ جو سر سبز و شاداب ہونے کیلئے تمہاری سعی و محنت کا محتاج ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرو۔ اس کو بجائے خود ایک نظیر بناؤ۔ کہ وہ اپنی قوم کی اور بچیوں کے لئے نمونہ ثابت ہو۔

پیاری ثریا! میری اور اپنی زندگی پر نظر ڈالو۔ میں پابندیوں کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ اور تم پابندیوں سے آزاد۔ میں علم سے تشنہ لب ہوں۔ اور تم اس سے سیراب ہو۔ میں والدین جیسی نعمت عظمےٰ و اعلیٰ سے محروم اور تم اس سے مالا مال ہو۔ مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہیں اور تم ان سے بری ہو۔ میں مشکلات میں گھری ہوں۔ اور تم آزاد ہو۔ تم نے اپنی زندگی میں اگر کوئی تکلیف دیکھی تو یہی کہ محبت میں ناکام رہیں۔ لیکن ثریا! کیا دنیا میں انسان کا یہی فرض ہے۔ کہ محبت کرے اور محبت چاہے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ دنیا میں انسان پر بہت اہم فرائض عائد کئے گئے ہیں جن کی ادائیگی محبت سے کہیں بڑھکر ہے۔ میری عزیز ثریا! انسان کی زندگی کے آگے یہ حقیر واقعات کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ انسانی زندگی قیمتی چیز ہے۔ ایسی قیمتی چیز کو کسی طریقہ سے برباد کرنا شیوۂ انسانیت سے بعید ہے۔ ثریا! مجھے تم پر افسوس اور بے حد افسوس ہے کہ تم نے دنیا کے لٹریچر سے سیکھا بھی تو کیا صرف محبت کرنا۔ اور اس میں ناکام ہوکر زندگی سے بیزار ہونا۔ ثریا! میری عزیز ترین ثریا! تم میری بچپن کی سہیلی ہو۔ اور نہایت پیاری سہیلی ہو۔ میں تمہارے خیالات، تمہارے جذبات سے کماحقہ طور پر واقف ہوں۔ برعکس اس کے میری طبیعت سے تم کبھی واقف نہ ہو سکیں۔ تم نے ہمیشہ مجھے کہا ہے۔ کہ تم غم کرتی ہو۔ اور سوائے غم کرنے کے کچھ نہیں جانتی ہو۔ لیکن ثریا! اب تم کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ غم کیا چیز ہے۔ ثریا! میں نے تم کو پہلے بھی کہا ہے۔ اور اب بھی کہتی ہوں کہ اگر میں غم کروں تو پانچ دن بھی زندہ نہ رہ سکوں۔ البتہ اگر مجھ میں کچھ کمزوری ہے تو یہی کہ میں متاثر طبیعت کی واقع ہوئی ہوں۔ اور سوچنے کا مادہ مجھ میں بہت زیادہ ہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی اور چاہا کہ نظام فطرت کو بدل ڈالوں۔

لیکن جو مادہ قدرت نے عطا کیا ہے۔ وہ میں کیونکر بدل سکتی ہوں۔ موسم سرما کی وہ طویل راتیں اور گرمی کی وہ لمبی دوپہریں میری سوچنے میں بسر ہو جاتی ہیں۔ تم سوال کرو گی کہ تم نے سوچ سوچ کر اپنی زندگی کے لئے کیا پروگرام بنایا۔ لیکن یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ کس مشکلات، کس وجوہات یا پابندیوں کی وجہ سے میں اب تک اپنے خیالات میں کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یا زندگی کے کسی پروگرام کو عملی صورت میں نہ لا سکی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھو کہ مشکلات سے مغلوب ہو کر میں تنگدل ہو گئی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ پیاری ثریا! جب یہ ہی جدوجہد ہماری زندگی کا ماحول قرار دیا گیا ہے تو تم ہی بتاؤ کہ تنگدلی اور زندگی سے بیزاری کیا معنی رکھتی ہے۔ پیاری ثریا! تم نے ڈاکٹر اقبال کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا کہ ان کی تعلیم کا جو وہ اپنی قوم کو دیتے ہیں کیا مقصد ہے۔ صرف یہی کہ جرأت و استقلال پیدا کرو۔ اور امید قائم رکھو۔ یہ ایک شاعر اور فلسفی کی تعلیم ہے۔ لیکن اگر انسان ذرا سوچے اور اپنی عقل سے کام لے تو آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے کہ یہی پست ہمتی۔ ناامیدی اور تنگ خیالی ہماری زندگی کی کامیابیوں میں سنگ راہ ہیں۔ انسان کو قدرت نے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشا ہے۔ انسان ایک بہترین ہستی کا مالک ہے۔ پھر کیا باعث ہے۔ کہ تم صرف دنیاوی مشکلات سے تنگ آکر اپنی بہترین ہستی کو اس طرح بیدردی کے ساتھ پامال کرنے پر کمر بستہ ہو گئیں۔ پیاری ثریا! دنیا میں بلند خیالی ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو انسان کو بام ترقی پر پہنچا سکتی ہے۔ ورنہ ایک تنگ خیال اور پست ہمت انسان دنیا میں کبھی بھی ترقی نہیں پا سکتا۔ اور نہ ہی وہ انسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

میری عزیزہ ثریا! میرا پہلا مشورہ تمہارے لئے یہی ہے۔ کہ تم اپنے خیالات بدلنے کی کوشش کرو۔ اور ایسی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ جن میں فرض کی حقیقت بتائی گئی ہو۔ اور کچھ عرصہ کے واسطے محبت کو دنیا کے لٹریچر سے علیحدہ تصور کرو۔ میری جان ثریا! محبت و فرض کا مسئلہ بہت نازک ہے۔ جس کے لئے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے۔ میرا خط پہلے بھی بہت لمبا ہو چکا ہے۔ تاہم میری ہمدردانہ رائے تمہارے لئے یہ ہے کہ زمانہ کی بے رحمیوں کو بھول جاؤ۔ اور اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کی تا بمقدور کوشش کرو۔ تمہارے والدین دقیانوسی خیالات کے ہیں وہ تمہارے ایک ادنیٰ اشارہ پر سب کچھ کرنے کو تیار رہیں گے۔ خدا کے فضل سے تم تعلیم یافتہ ہو۔ دسویں تک تم نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اسی خیال کے ماتحت تمہیں یہ مشورہ دیتی ہوں۔ بشرطیکہ تم اسے عملی جامہ پہنا سکو۔ کہ تم اپنی زیر سرپرستی ایک سکول کھولو جس میں اپنی قوم کی نادار اور یتیم بچیوں کو تعلیم دلائی جائے۔ نیز خدا کے فضل و کرم سے تم اس کام کو کرنے کی توفیق رکھتی ہو۔ خدانخواستہ کوئی مالی مشکلات حائل نہیں۔ صرف ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر تم یہ چاہو کہ سکول کے مصارف کیلئے کوئی علیحدہ آمدنی بھی ہو تو اس کے لئے بھی میں تم کو رائے دیتی ہوں۔ کیونکہ سکول ہی کے نام پر ایک زنانہ سٹور

سکھلو جس میں چند اچھی سلائی جاننے والی عورتیں اور چند ایک عمدہ دستکاری جاننے والی لڑکیوں کو ماہوار تنخواہ پر مقرر کیا جائے ۔ اور اس سٹور کی تمام آمدنی سکول کے مصارف کے لئے علیٰحدہ جمع کی جائے ۔ جو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں۔ باقی اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ملک کی اور خواتین کو بھی شریک کرو۔ جو علمی ذوق رکھتی ہوں۔ تمہارا اپنا بھی حلقۂ واقفیت کافی وسیع ہے ۔ مثلاً بہن شکیلہ ۔ مسز جاوید ۔ فرخ سلطانہ ۔ نزہت فاروق صدیقی نکہت ۔ نور ۔ کشور سلطانہ صاحبہ سے بھی مشورہ طلب کر سکتی ہو ۔ بلکہ اس نیک کام میں ان کو بھی شریک ہونے کی دعوت دو۔ میں امید کرتی ہوں کہ وہ ضرور اس نیک کام میں تمہاری مدد کریں گی ۔ بلکہ امید واثق ہے کہ وہ اپنے لمحات فرصت کا کچھ حصہ ضرور اس ملکی و ملی خدمت میں تمہارے ساتھ صرف کریں گی ۔

ثریا! سکولیں تو بہت ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان عام سکولوں میں تعلیم تو دلائی جاتی ہے لیکن تربیت کا خیال نہیں کیا جاتا ۔ جو کہ استانیوں کی ایک اہم ذمہ داری ہے ۔ اس لئے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرو۔ کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی کی جائے ۔ اور مذہبی و معاشرتی تعلیم بھی دی جائے ۔

پیاری ثریا! تم نے کچھ عرصہ ڈاکٹری تعلیم پر بھی صرف کیا تھا۔ اگر اس سلسلہ کو دوبارہ شروع کر دو۔ تو بہت بہتر ہوگا۔ تاکہ لڑکیوں کو حفظان صحت کی تعلیم بھی دی جائے قوم کی معصوم بچیوں کے لئے اشد ضروری و لازمی ہے ۔ تاکہ حفظان صحت کے اصولوں پر کاربند ہو کر وہ اپنی صحت کو بحال رکھنے کی کوشش کریں ۔ کیونکہ ان کی صحتوں پر ہی آئندہ نسلوں کی صحت و طاقت منحصر ہے ۔

میری عزیز ثریا! میں نے تم کو مشورہ تو دیدیا ۔ اور اس کام کو عملی صورت میں لانے کے لئے آخر میں تم سے یہ عذر درخواست بھی کرتی ہوں ۔ لیکن افسوس کہ میں تمہارے ساتھ اس نیک کام میں شریک نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ میں سرحد کی اس تنگ و تاریک سرزمین کی وہ فرد ہوں جس کو ہمارے یہاں کے مایہ ناز حضرات "سیاہ سر" کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں جو حقیقت میں سیاہ بخت و سیاہ روز ہے ۔ اور اس سیاہ بختی و سیاہ روزی کے بانی مبانی بھی مایہ ناز حضرات ہیں ۔ اللہ پاک ان کو نیک توفیق عطا فرما دے ۔ آمین ۔

ریاض کو خط لکھنے کی بابت تم نے دریافت کیا ہے ؟ گو اس نے تم سے غیر شریفانہ برتاؤ کیا ہے ۔ اور تمہاری پاک جذبات محبت کی قدر نہ کرتے ہوئے لندن میں دوسری شادی بھی کر لی ہے ۔ لیکن تمہاری علیٰحدگی اس سے ناممکن ہے۔ تم خط لکھو اور ضرور لکھو ۔ تم اس کی رفیقۂ حیات ہو۔ تمہاری محبت ہرگز رائیگاں نہ ہوگی ۔ اور ضرور وہ کبھی نہ کبھی راہ راست پر آئیگا ۔ باقی تم لندن کی سرزمین کو کیوں کوستی ہو ۔ لندن کسی کو یہ تعلیم نہیں دیتا۔ کہ تم بیویوں یا ماؤں بہنوں سے برا برتاؤ کرو۔ جب کسی کی فطرت ہی خراب ہو تو لندن کا کیا قصور ہے ؟

پیاری ثریا! ابھی تمہارے انصاف کا وقت ہے میری خدا سے دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ اس امتحان میں کامیاب کرے۔ اور تمہیں توفیق دے کہ تم اپنی ذہنی و فطری قابلیت سے ایک نظیر دنیا میں پیش کرو جس سے قوم کی دوسری بہنیں سبق حاصل کر سکیں۔ میری جانب سے پیاری خالہ کو بہت بہت پیار اور اپنے لئے میرا دلی پیار و محبت قبول کرو۔ میری دعاؤں کا لشکر ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔ خدا حافظ و ناصر۔

تم کو دل سے چاہنے والی تمہاری ....

"م" بیگم بنت میاں عبدالمجید مرحوم

جاں نثار امام علیہ السلام

(محترمہ ع۔ ب صاحبہ پنہاں بنت جناب آغا سرفراز حسین خان صاحب قزلباش مرحوم)

میں دریائے فرات جس کی یاد میں تقریباً تیرہ سو برس لیل النہار کی سختیاں چشم پرنم سے دیکھ رہا ہے۔ فرات کی کشتی جس ثانی نوح کی برکت و دعا سے موجودہ زمانہ کے طوفان بلاخیز میں بہ اطمینان تمام جاری و ساری ہے۔ اس کے قتل کا سنگ بنیاد کوفیان پُر دغا نے حضرت مسلم اور ان کے خورد سال اور ماہوش بچوں کے خون سے لقدب کر دیا۔ آہ! ابھی سوائے علم لدنی کے کسی گوشت اور پوست کی زبان سے سبط رسول کو ان قاصد اور گلعزاروں کی خبر شہادت نہیں سنائی۔ وہ خاصۂ باری مدینہ و مکہ چھوڑے۔ خارزاروں بیابانوں اور صحرا کے لق و دق میدانوں میں عشق حقیقی کٹھن اور دشوار گذار راستوں پر معبود حقیقی سے لو لگائے چلا جا رہا ہے۔

بتول صغرا کے ہاتھ سے گوندھے ہوئے گیسوؤں کی مہک نے جنگل میں ایک چمنستان دلفریب کی شان پیدا کر دی ہے۔ نسیم ختن جب ادھر آتی ہے۔ تو ایک تازہ نافہ کی شمیم جاں فزا گیسوؤں پر خوشبوئے نثار ساتھ لاتی ہے۔

فخر داؤد کے باوفا اصحاب جس لحن داؤدی سے قافلہ میں حُدی خوانی کر رہے ہیں۔ اس نے کاروان کے اونٹوں پر وجد کا عالم طاری کر دیا ہے۔ اسپان خوش نژاد بھی اپنی خدمت پر ناز کرتے ہوئے ہوا سے کچھ آگے آگے ہیں۔ یاد خدا کے نعرے ایک ایک جوان قافلہ کی زبان پر ہیں۔ اور تکبیروں کی صدا سے خاموش جنگل کا چپہ چپہ گونج رہا ہے۔ غرض جس دشت میں نازپرور دہ رسولؐ کا گذر ہوتا ہے۔ خار و گل و ریحان پابوسی کی خاطر جنبش ہوا کے سہارے سر اٹھا اٹھا کر آگے بڑھتے ہیں۔ اور زبان حال سے عرض کرتے ہیں احمد مختار کے جائے خانۂ حق کی برکتوں سے نکل کر جب آپ جنگل جنگل پھر رہے ہیں تو ہم اس بے وفا زمانہ کی مخالف ہواؤں سے جل جل کر کیوں نہ سوکھ جائیں۔

مولا آپ ابر کرم بنکر آئے۔ اور ہمیں آپ نے دوبارہ جلا دیا۔ لیکن آپ کی صحرا گردی سے ایک ایک پھول کا دل داغدار اور ایک ایک خار اس غم سے کانٹا ہو گیا ہے۔ بجواب حضرت امام حیال میں اپنے سفر کا راز اس طرح آشکار کر رہے ہیں۔

حرم حضرت معبود میں خون بہنے کے خیال نے مجھے بے آب و نان جنگلوں میں نکال دیا ہے۔ یہ کسے معلوم نہیں کہ وہ خانہ اقدس میرے پدر نامدار کا مولد ہے۔ اور باپ کے مولد سے جو الفت بیٹے کو ہوتی ہے وہ بھی

کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن اس وقت حرمت حرم اس محبت پر بھی سبقت لے گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب بھی قریات میں ہمارے موالی میرے اور میرے اصحاب کے قیام کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ سرسبز زمینیں اور پرآب جھیلیں میرے قیام کے لئے موجود ہیں۔ مگر مجھے تو باغوں سے جنگل اور نہروں اور دریاؤں سے ریگستان پسند ہے۔ کیونکہ خاک مدفن کا ذوق اب قدم قدم پر کشش کر رہا ہے۔ محرم کا مہینہ آرہا ہے۔ اور اسی کی دسویں تاریخ کو کربلا میں اس عبد کا آخری فریضہ پڑھنا ہے۔ جس کے انتظار میں حیات کی ایک ایک گھڑی گن گن کر بسر ہوتی ہے۔

محمدؐ کے چمن کے پھول

آہ! منزل بمنزل سید ابرار اب پھر صحرا و کوہسار کی جانب روانہ ہیں۔ کوسوں نہ کوئی بستی ہے۔ اور نہ درخت کا سایہ۔ گرمی کی شدت اور صحرا کی دھوپ میں چمنستان محمدؐ کے گلہائے رعنا مرجھا رہے ہیں۔ آہ! کہاں عرب کی سخت منزلیں۔ اور تپش مہر نگاہ سوز اور کہاں عالم کی زینت کے وہ چاند سے چہرے جن کی زیارت رحمت حق کی خنکی کا اثر رکھتی تھی۔ آہ! لیل النہار کے تغیر سے جوانان علیؑ شعاع مہر کو ڈھالوں پر روک رہے ہیں۔ نیزہ کی انیاں گرمی کی شدت سے لو دے رہے ہیں۔ آہ دھوپ میں وہ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے زبانیں نکالے ہوئے ہیں۔ جنہیں سیدانیوں نے جانکاہ محنت سے سایہ میں پالا تھا۔ غرض انہیں مصائب میں خدا کا لشکر کوچ کرتا ہوا منازل تیغم و ذات العرق و شعلبیہ طے کر کے چوتھی منزل واکسیہ میں جا پہنچا۔

منزل واکسیہ زہیر ابن قیم

یہ وہی بزرگوار ہیں جنہیں امام علیہ السلام کی اقدس زبان مبارک عاشور کے دن کربلا کے میدان میں نماز ظہر کے وقت نماز گذاروں کے ساتھ محشور ہونے کو دعا دی تھی۔ منزل واکسیہ میں امام مظلوم نے تشریف فرما کر اتنا توقف کیا کہ تو سنے ہوئے جانور اور قریب ہلاکت بچے پانی سے سیر ہولیں اور اس کے ساتھ حضور کی یہ مصلحت بھی شائد شامل ہو کہ اپنے اس بلند پایہ جاں نثار کی آمد کی انتظار بھی کر لیں۔ جس کی روانگی کی خبر علم امامت بہم پہنچا چکا تھا۔

فوج خدا نے لشکر کی زرہ و بکتر اتارے ہوا میں ایک سمت سینہ تانے ٹہل رہے تھے۔ اسد اللہ کے پیارے پسینہ میں تر اور گھوڑوں کے تنگ کھول رہے ہیں۔ کیونکہ یہی تو وہ با خدا سوار تھے جو مرکبوں کی پیاس اور تکلیف کو اپنے اوپر سبقت دیتے تھے۔ ایک طرف کچھ جاں نثار۔ ایک ششماہا آقا زادے اور ایک چار سالہ شہزادی کو دامن قبا سے ہوا اور شعرا بے سے پانی کی چھینٹیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ پیاس کی شدت سے ان کے ہونٹ اُودے اور دھوپ کی تپش سے چہرے سنولا گئے ہیں۔ ایک سمت جرار باوفا

دامن سے عرق جرأت پاک کر رہے ہیں۔ اور ایک جانب ترائی میں بودوباش رکھنے والے شیر رومال بھگو بھگو کر سروں پر رکھ رہے ہیں۔ کہ ایک طرف سے گرد کا دھواں نظر آئی۔ سب کی نگاہیں اس جانب اٹھیں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ چند بہادر بڑھیں اور ہمارے محضر شہادت پر خون سے دستخط کرنے والے زہیر ابن قیم کو ہاتھوں ہاتھ لے آئیں۔ محبت رسول اور آل رسول میں مبتلا بہادروں کے جانبازانہ کارنامے پڑھنے والے ان کا ماجرائے شوق بھی چند سطروں میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ قبیلہ نخلیہ کے رئیس اور کوفہ کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ مکہ سے امام علیہ السلام کے ساتھ ہی روانہ ہو چکے تھے۔ مگر بنی امیہ کے خوف سے حضرت سے دور ہی دور سے منزل کرتے چلے آتے تھے۔ منزل خزیمہ پہنچکر اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ کہ سید الشہداء کا خط طلبی میں موصول ہوا۔ جناب زہیر نے اپنے ہمراہیوں کو پڑھکر سنایا۔ لیکن جان کے خوف سے سب سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ اور ان کی خاموشی نے ظاہرا طور پر جناب زہیر قیم کو کچھ دینے کے لئے [illegible] کت کر دیا۔ لیکن اللہ رے محبت حسینؑ کہاں کہاں کس کس طرح جلوہ ریز تھی۔ جب زہیر قیم کی زوجہ اس خبر سے مطلع ہوئیں تو اس عفت وعصمت کی ملکہ کو ایک جوش محبت آگیا۔ اور جناب زہیر سے کہا کہ آقا اپنے امتحان مولا کے لئے ہم غلاموں کو طلب کریں۔ اور ہم جواب میں سکوت اختیار کریں۔ حیف ہے ان انسانوں پر جو مرد کہلاتے ہیں۔ اور زندگی سی ذلیل شے سید شباب اہل جنۃ پر نثار کرنے سے موت کا خوف انھیں پھیر لیتا ہے۔ کاش ان چوڑیاں پہننے والوں کے ساتھ چھوڑ کر تم اکیلے تلوار باندھکر مولا کی حضوری میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے جا پہنچتے۔ اور ان کی نعلین پا کو آنکھوں سے لگانے کا شرف حاصل کرتے۔ یا کاش امتناع جہاد کا حکم عورتوں پر سے آج ساقط ہو جاتا۔ تو آج میں وہ پہلی عورت ہوتی۔ کہ دم زدن میں میرا سر حضور کے قدموں پر ہوتا۔ یہ سنکر جناب زہیر ابن قیم نے فرمایا کہ میرا سکوت ان بے وفا کوفیوں کی ہمراہی پر تھا۔ جو ایک پیغام معدو پر لبیک کہنے سے بھی چرا رہے ہیں۔ میں تو امام علیہ السلام کے قدموں پر نثار ہونے کے لئے پیدا ہی ہوا ہوں۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ آؤ عصمت مآب نیک بی بی آخری مرتبہ وداع ہونے کے لئے بڑھو۔ زہیر نے تمام حقوق سے آج تمہیں آزاد کر دیا۔ اور تم آئندہ ہر امر میں خود مختار ہو۔ یہ کہکر اس با ایمان حور عصمت کو اپنی بنی اعمام کے سپرد کر دیا۔ اب رخصت کا جگر خراش وقت دل بھر آیا۔ سر کا تاج اتر رہا تھا۔ شوہر دار بی بی اپنے والی کی زندگی میں بے شوہر ہوتی تھی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ہاتھ اتار کر خدا حافظ کہا۔ اور فرمانے لگیں۔ آہ۔ پشت پھیر کر جاتے ہو۔ لیکن روشن چہرہ دیکھنے کی امید نہیں۔ اچھا امام زمانہ کے سپرد کیا۔

جب شہادت کا سرخ جوڑا پہن کر امام حسین کے جد امجد کی خدمت میں سرخرو ہو جاؤ تو اپنی اس

لونڈی کی شفاعت کے لئے سفارش کو بھول نہ جانا۔ جیسے آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے آس کئے جاتے ہو۔
زہیر نے ان کلمات پر اپنے جگر کو شق پاکر کہا۔ اگرچہ تمہاری فرقت مجھ پر بھی شاق ہے مگر مجبور ہوں۔ کہ سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں۔ اس مخدرہ عصمت نے ہاتھ باندھکر عرض کی کہ جب تم فرزند مرتضٰی رکاب میں حاضر ہوکر سعدہ کا فرض ادا کرنا اور تلوار کے جوہر دکھانا چاہتے ہو۔ تو مجھے کیوں فرزند محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حضوری خدمت اور سعادت ابدی سے محروم رکھنا چاہتے ہو۔ کامل الاعتقاد بی بی کی یہ عرض داشت سنکر جناب زہیر ابن قیم نے انھیں بھی اپنے ہمراہ لیا۔ اور اسپ باوفا کی باگ ڈھیلی چھوڑ کر جادہ تسلیم ورضا پر روانہ ہوئے۔ اب جو غم و ریخ سے بند آنکھیں کھولیں۔ تو امام علیہ السلام کے جاں نثاروں کو اپنے استقبال میں آتے دیکھا۔ فوراً لجام فرض چھوڑ کر دوڑے بشیروں کا قیصر۔ باوفاؤں کا باوفا۔ اصحاب امام کے حلقے اور متقین کے جھرمٹ میں رکاب حضرت مظلوم میں جا حاضر ہوا۔ اور اس کی خوش قسمت بی بی کے استقبال کو سیدانیاں در خیمہ تک آئیں۔ ہزار ہزار سلام ہوں ان جاں نثاروں پر۔
وطن کی شریف بی بیو! پیاری بہنو! کربلا کی عورت۔ زہیر پاک کی عورت۔ ایثار کرنے والی عورت سے سبق لو۔ خدا ہم اور تم کو اس شریف بی بی کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

گلہائے عقیدت

بگرامی خدمت محترمہ جناب مس لٹل وڈ صاحبہ انسپکٹریس آف گرلز سکولز شمال مغربی صوبہ سرحد

(از ناچیز طالبات نارمل ہائی سکول پشاور)

یہ نظم ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو محترمہ جناب مس موصوفہ کی خدمت میں زنانہ نارمل ہائی سکول کی لڑکیوں نے پڑھکر سنائی۔ اور ہمیں جناب پرنسپل صاحبہ کی طرف سے بغرض اشاعت موصول ہوئی ہے۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے ریکارڈ رہے۔ (ادارہ)

(۱)

(۱)

مس لٹل وڈ صاحبہ! اے آفتاب علم فن
اس طرح حلقہ میں آتے ہی ہوئی تو ضوفگن
گوشہ گوشہ کونہ کونہ میں تری پہنچی کرن
کردئے ہیں علم سے روشن قلوب مرد و زن
تونے اس صوبہ میں آتے ہی اُجالا کردیا
علم کا ڈنکا بجایا۔ بول بالا کردیا

(۲)

کرکے حاصل علم۔ دل ہیں لڑکیوں کے باغ باغ
ہو رہے ہیں آج گھر گھر علم کے روشن چراغ
پاک ہیں گویا خیال خام سے سب کے دماغ
جاہلیت کا کہیں بھی اب نہیں ملتا سراغ
آج ہر اک علم کی دولت سے مالا مال ہے
یہ تری سب دانش و بینش پہ گویا دال ہے

(۳)

تیری تجویزیں سبھی ہیں نیک خوش آثار ہیں
تیرے پختہ سب ارادے ہیں بلند افکار ہیں
آج سب تیری بدولت عاقل وہشیار ہیں
یہ ہیں تیرے کارنامے یہ ترے شاہکار ہیں

تجھ سے ہی رائج ہوئی تعلیم نسواں اسجگہ!
مشکلیں سب ہوگئی ہیں تجھ سے آساں اسجگہ

(۴)

دل سے اب خوشیاں مناتی جا رہی ہیں لڑکیاں
مسٹریس ہیڈ مسٹریس بھی آج خوش ہیں بیگماں
اور سب مسرور ہیں پیر و جواں خورد و کلاں
یعنی ساری کائنات سکول کی ہے شادماں

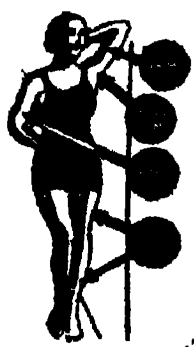
اے خوشا وقتیکہ تو آئی ہے اس سکول میں
جسطرح گل ہو چمن میں اور خوشبو پھول میں

(۵)

تیری آمد سے مسرت چھا گئی ہے چار سو
اس لئے ناچیز ساری طالبات و معلم جو
پیش کرتی ہیں یہ گلہائے عقیدت روبرو
گر قبول افتد زہے عز و شرف اے نیک خو

علم کی دنیا میں تو نے نام ہے پایا ہوا
آج ہے ذرہ کے گھر میں آفتاب آیا ہوا

بال عمر بھر نہ اگیں



گورنمنٹ آف انڈیا کی باضابطہ
رجسٹری شدہ
سوپہو رجسٹرڈ

دنیا بھر میں اپنی قسم کی واحد دوائی ہے۔ جس کے استعمال سے غیر ضروری بال ایک دفعہ دور ہو کر عمر بھر پیدا نہیں ہوتے۔ گذشتہ چار سالوں میں ہزاروں لوگ اس حیرت انگیز ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ آپ کو بھی معلوم نہ رہنا چاہئے۔ قیمت فی شیشی دو روپیہ تین شیشی پانچ روپے محصولڈاک علاوہ۔ ملنے کا پتہ:۔

سوپہو فارمیسی رجسٹرڈ حلقہ ۳۳(A) لاہور

امیروں کا سنگار غریبوں کا روزگار

کشیدہ کی مشین!

کپڑوں پر بیل بوٹے۔ پھول پتے۔ ریشمی اونی دھاگہ سے کرسی کی گدیوں۔ گول گابیوں بچوں کی ٹوپیوں۔ نہایت عمدہ اور خوبصورت بنائے جا سکتے ہیں۔ امیروں کے لئے سنگار کا بہترین ذریعہ ہے۔ چلانے کی ترکیب نہایت آسان ہمراہ مشین ارسال ہوگی۔ قیمت تین روپیہ (للعہ)

پتہ:۔ دہلی واچ کمپنی پوسٹ بکس ۵۵ دہلی



طلب کیجئے مکتبہ جامعہ ملیہ کی جدید فہرست کتب

اگر آپ قلیل سرمایہ سے بیشمار دولت کمانا چاہتے ہیں تو ہماری مشہور و مستند کتب

طبیب مرغی خانہ عہ

تجارتی مرغی خانہ عہ



آج ہی:۔ خرید فرمایئے

(باتصویر)

یہ ہر دو لاثانی کتب ایک مشہور مغربی ماہرین کی تصنیفات و پولٹری ایکسپرٹ کے ۲۰ سالہ تجربات کا نچوڑ ہیں۔ مرغیوں کے رکھ رکھاؤ۔ امراض کم قیمت دیسی مجرب علاج اور پانچ سو روپیہ ماہوار کمانے کی ترکیب کے علاوہ کوئی بات مرغیوں بطخوں کے متعلق باقی نہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے ۔۔۔ ان کی بیحد تعریف ہوا علاوہ شائقین کے گورنمنٹ یو۔پی۔ حیدرآباد دکن و ہندوستان کے دیگر نامور ماہرین نے کی ہے بیشمار دستی تصاویر کے علاوہ ایک درجن رنگین فوٹو۔ ۔۔۔ صفحات سنہری مجلد

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ دار البلاغ ملتانی سٹریٹ لاہور

موجودہ زمانہ میں خوشبودار تیل کا استعمال ضروریات زندگی میں داخل ہوچکا ہے۔ متعدد اقسام کے تیل تیار کئے جاکر متفرق ناموں کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں جنمیں سے بہت کم صحیح معنوں میں کامل خوشبودار تیل کہلائے جانیکے مستحق ہوتے ہیں۔ مقام فخر ہے کہ ہمارے صوبہ کے دار الخلافہ پشاور شہر بازار کلاں میں اپنے صوبہ کی ضروریات کو پورا کرنیکے واسطے ایک کارخانہ موسومہ "جان ہیر آئل فیکٹری" کھولا گیا ہے۔ کارخانہ مذکور نے گذشتہ چند سال کے عرصہ میں متعدد اقسام کے خوشبودار تیل تیار کئے ہیں جنمیں "زلف رسا ہیر آئیل" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس تیل نے اپنے اوصاف کاملہ کی برکت سے جو ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم پروپرائیٹر ایم۔ اے۔ جان اینڈ سنز کی خدمت میں اس شاندار کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ برادران وطن کیلئے تھوڑے داموں میں اعلیٰ خوشبودار تیل حاصل کرکے نام نہاد تیلوں پر زر کثیر خرچ کرنے سے بچنے کا اچھا موقع ہے۔ پبلک کی قدردانی کارخانہ کیلئے باعث حوصلہ افزائی ہوگی۔ اور مالکان کارخانہ اس تیل کو مزید خوبیوں سے آراستہ کرسکینگے۔ یا کوئی اور اعلیٰ قسم کا خوشبودار تیل تھوڑے داموں میں پبلک کو پیش کرسکینگے۔ کارخانہ مذکورہ کا مال صوبہ کے ہر ایک سٹور سے ملسکتا ہے۔

بوٹ

ہمیشہ مینز فٹ ویر کمپنی کے بوٹ استعمال کریں.

جو مضبوطی - خوشنمائی - ملایمی اور پائیداری

میں

اپنی مثال آپ ہیں!

منیجر کمپنی ہٰذا

"دانت"

دانتوں کے گوناگوں امراض نے ہزاروں جانیں تلف کردی ہیں - ناتجربہ کار معالجوں کا مشورہ بجائے فائدہ کے مریض کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے ہمارے صوبہ میں سی۳۰ سالہ تجربہ کار اور سو فیصدی کامیاب معالج دندان جناب

ڈاکٹر ڈی - این کیمفر اپنی کامیابی کی وجہ سے ایک عرفانی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ لہٰذا وقت ضرورت ڈاکٹر موصوف سے مشورہ لینا عین دانشمندی ہے۔ منیجر

صوبہ سرحد کے سب سے بڑے اور مستند اجمل دواخانہ پشاور کی چند

نادر و نایاب ادویات

موسم سرما کا لاجواب تحفہ

ماء اللحم عنبری خاص الخاص

اپنے بے نظیر خواص اور تمام اعضاء رئیسہ کو قوت دینے میں لاجواب تحفہ ہے۔ بدن میں خون صالح اور گوشت پیدا کر کے رنگ بدن کو شنگرف کی طرح بنا دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے حقیقی مسلول انسان کو تندرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ نادر و نایاب اجزاء قیمتی ادویات سینکڑوں پرندوں کے گوشت۔ پھل۔ پھول نیز جواہرات شامل ہو کر یہ بے نظیر دوا تیار ہوتی ہے۔ ایک دفعہ استعمال کر کے قدرت خدا کا تماشہ دیکھئے۔

قیمت فی بوتل عہ علاوہ محصول ڈاک

معجون حیات یاقوتی

غلط ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں قوت باہ میں اس سے بہترین چیز موجود ہے۔ مروارید ناسفتہ۔ عنبر۔ یاقوت۔ مرجان۔ شاک۔ ورق طلاء۔ ورق نقرہ۔ کستوری۔ نیز بیسیوں قیمتی اجزاء سے اس معجون کو تیار کیا گیا ہے۔ قوت مردمی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت وغیرہ امراض اس کے چند روزہ استعمال سے کافور ہو جاتے ہیں۔ خون صالح پیدا کرتی ہے۔ چہرہ کا رنگ نکھارتی ہے۔ جلق۔ کثرت جماع۔ احتلام جیسے امراض میں اس کا استعمال اکسیر ہے۔ جیسے دشمن کے لئے شمشیر تیز۔ قیمت فی ڈبیہ جو دس روز کے لئے کافی ہے (عہ) پانچ روپیہ۔ علاوہ محصول ڈاک۔

منیجر

اجمل دواخانہ جہانگیر پورہ پشاور

صوبہ سرحد کے سب سے بڑے اور مستند اجمل دواخانہ پشاور کی مجرب

نادر و نایاب ادویات

طلاء اجمل

یہ وہ نادر و نایاب طلاء ہے جو نباض الملک حکیم مولوی نور محمد خان صاحب کابلی نے افغانستان کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہے۔ اجمل دواخانہ کی مایہ ناز ادویات میں سے ایک یہ بھی مجرب المجرب دوا ہے جو ملک کے نوجوانوں کیلئے خاص طور سے تیار کیا گیا ہے۔ علتی - اغلام اور کثرت جماع سے جو نقائص عضو تناسل میں پیدا ہوجاتے ہیں صرف ایک ہفتہ کے استعمال سے نامرد کو مرد بنا دیتا ہے۔ کجی - لاغری - سستی دور کرکے اعصاب رگوں اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قیمت فی شیشی جو ایک ہفتہ کیلئے کافی ہے ۲ روپیہ علاوہ محصول ڈاک (نوٹ) اس کے ساتھ اگر کھانے کیلئے معجون حیات یا قوتی استعمال کریں تو سونے پر سہاگہ کا کام دیگا۔

حب اکسیر یا عنبری

زنانہ مردانہ کی بہترین ٹانک ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے والی مثال ہے۔ ایک بار استعمال فرما کر قدرت خدا کا مشاہدہ کیجئے۔ دل - دماغ - جگر - پھیپھڑے - چہرہ کی بے رونقی - عام جسمانی کمزوری غرضیکہ اعضائے رئیسہ کے لئے بہترین مقوی ہے۔ جوان کو پہلوان اور بوڑھے کو نوجوان نامرد کو مرد بنانا اس کا ادنی کرشمہ ہے۔

قیمت فی گولی چار آنہ

قیمت فی شیشی جس میں بیس گولیاں ہیں چار روپیہ علاوہ محصول ڈاک

منجانب

اجمل دواخانہ جہانگیر پورہ پشاور